(شمیم احمد شمیم 1937 - 1980)

(شمیم احمد شمیم 1980 - 1937)

مرتب : قرۃ العین

AAINA NUMA (Shamim Ahmed Shamim1937-1980)	:	Name
Qurrat-ul-Ain	:	Compiled by
Baghaat Barzala,Near Bone and Joint Hospital, Barzala, Srinagar-Kashmir		
June,2000	:	Publication Year
Rs. 150.00 (PB)Rs.200.00 (HB)	:	Price

This book is also available at:
Kashmir Book Shop, Residency Road, Srinagar-Kashmir
Best Sellers, Opp. Bisco School, Lal Chowk, Srinagar-Kashmir
Abdulah News Agency, Amira Kadal, Srinagar-Kashmir

نام کتاب	:	آئینہ نُما (شمیم احمد شمیم1980-1937)
ناشر	:	قرۃ العین
پتہ	:	باغات برزلہ نزد بون اینڈ جوائنٹ ہسپتال، برزلہ۔ سرینگر کشمیر
سرورق	:	مسعود حسین
کتابت	:	واجد علی خاں
سالِ اشاعت	:	جون، ۲۰۰۰ء
قیمت	:	مجلد=/200
		پیپر بیک =/150

یہ کتاب مندرجہ ذیل جگھوں پر دستیاب ہے۔
کشمیر بکشاپ، ریزیڈنسی روڈ سرینگر کشمیر
بیسٹ سیلر: مخالف بسکو سکول۔ لال چوک سرینگر کشمیر
عبداللہ نیوز ایجنسی۔ امیرا کدل سرینگر کشمیر

Printed by Shamim Farooqui(Prop) Printing Service Corporation
D 52. F.F.C. Jhandewalan New Delhi 110055 Phone:3526053 - 7538699

فہرست مضامین

صفحہ نمبر	مضمون	نمبر شمار

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر

اپنی بات

"آئینہ میرے دیرینہ خواب کی تعبیر ہے۔" آئینہ کے پہلے شمارے کا آغاز اسی جملے سے ہوا تھا۔ میں اس جملے میں تھوڑی سی ترمیم کر کے یوں کہوں گی کہ 'آئینہ' کی نادر اور نایاب تحریروں کو از سرِ نو ترتیب دے کر ایک کتابی شکل دینا میرے دیرینہ خواب کی تعبیر ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس خواب کی تعبیر کو ممکن بنانے میں تھوڑی نہیں اچھی خاصی تاخیر ہوئی ہے۔ اس غفلت میں اپنی کوتاہیوں، ذاتی مجبوریوں اور کئی ناگزیر مشکلات کا دخل ہے۔ دراصل ان کی المناک اور بے وقت موت کے حادثے نے زندگی سے اسقدر دل برداشتہ کر دیا کہ دل و دماغ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بہت دیر تک محروم رہے۔ اور میں نے آئینہ میں "زمانہ بڑے شوق سے سُن رہا تھا" کے عنوان کے تحت ان کی تحریروں کی اشاعت پر ہی اکتفا کر لیا تھا۔ لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ احساس گہرا ہوتا گیا کہ آئینہ کی تحریروں کو سمیٹ کر ایک کتابی شکل دے کر ادب، سیاست اور صحافت کے اس انمول خزانے کو محفوظ رکھنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔

'آئینہ' کو کتابی شکل دینے کے فیصلے کے بعد میرے سامنے مشکل ترین مرحلہ تحریروں کے انتخاب کا تھا۔ میرے سامنے آئینہ کی تحریروں کا ایک وسیع و عریض سمندر تھا۔ ہر تحریر چاہے ادب سے وابستہ ہو، سیاست کے متعلق ہو یا صحافت سے تعلق رکھتی ہو اتنی جاندار، دلچسپ، آفاقی اور حالات و واقعات کی مناسبت سے اتنی برمحل اور موزوں ہے کہ میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ پہلے مرحلے میں کن تحریروں کو ترجیح دی جائے۔ اس مشکل پر قابو پانے میں میری مدد محمد شفیع خان (پنجورہ) نے کی جو خود 'آئینہ' کو ایک کتابی

شکل دینے کی خواہش کا اظہار کر چکے تھے۔ اس کتاب کی ترتیب و تشکیل ان کی پُر خلوص کوششوں اور تعاون کے بغیر ممکن نہ تھی۔ اور اس کے لئے میں ان کی مشکور و ممنون ہوں۔

'آئینہ نما' آئینہ کے مشہور و مقبول ترین کالم تیسرا صفحہ (ماسوائے چند مضامین کے) پر مشتمل ہے۔ یوں تو آئینہ کا ہر کالم اپنے منفرد اور مخصوص اسٹائل کی بنا پر اپنی جگہ اہم ہے لیکن تیسرا صفحہ آئینہ کے خالق کی شوخی تحریر، ظرافت، ذہانت، طنز و مزاح کی حس کی بھرپور عکاسی کی بدولت مقبولیت کی بلندیوں کو چھونے لگا تھا اور چراغ بیگ کا نام زبان زدِ خلائق بن گیا تھا۔ یہ صفحہ عوام کے ہر طبقے اور فکر کا ترجمان تھا۔ اس کی بنیادی خصوصیت یہ تھی (اور غالباً مقبولیت کی وجہ بھی) کہ اس میں بین الاقوامی سیاست کے اہم ترین موضوعات سے لیکر میونسپلٹی کی کارکردگی، ٹرانسپورٹ کی عدم دستیابی اور بازار سے ریزگاری کے غائب ہونے تک کی مشکلات کا بڑے دلچسپ انداز میں تبصرہ ہوتا۔ اربابِ اقتدار و اختیار اور عوام الناس دونوں ہی چراغ بیگ کے قلم کی نوک کی زد میں آجاتے۔ عوامی سطح پر کالم کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ مدّاح تو مدّاح ان کے سیاسی و سماجی افکار سے شدید اختلاف رکھنے والے حتّیٰ کہ ان کے بدترین دشمن بھی بڑی بے چینی سے 'آئینہ' کا انتظار کرتے اور اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے کہ دیکھیں آج چراغ بیگ کس کو 'آئینہ' دکھا کر بے نقاب کرتا ہے۔ ہاں البتہ سیاستدان اور حکمران طبقہ چراغ بیگ کی بیباکی، بے خوفی اور نتائج سے قطعی بے پرواہ ہو کر بے رحم تنقید کی روِش سے خائف اور خوفزدہ تھے اور بقول چراغ بیگ "ان کا بس چلتا تو وہ آئینہ کی اشاعت پر پابندی لگا کر ہی دم لیتے۔"

میری رائے میں جس چیز نے ان کی تحریروں کو ایک معنویت، ابدیت اور آفاقیت عطا کی ہے وہ ان کا دانشورانہ اور مفکرانہ طرزِ فکر ہے۔ بات پیشاب کرنے کے طریقے کی ہو یا امتحانوں میں نقل کی وبا کی ہو، زینہ کدل سے امیرا کدل آنے کی ہو یا انتخابات میں دھاندلیوں کا رونا ہو، چاند پر انسان کی پیش قدمی ہو یا 'دی بائبل' کے معترضین کی ذہنی و فکری پسماندگی کا ذکر ہو، ہر تحریر میں ظرافت، شوخی اور طنز و مزاح کے عنصر کے ساتھ ایک درد، تڑپ اور چبھن شامل ہوتی۔ وہ اگر سیاستدانوں کی ریاکاری، خودغرضی اور نااہلی

پرنالاں نظر آتے تو عوام کی بے حسی، بے نیازی، بزدلی اور ہر حال میں صابر و شاکر رہنے کی عادت انہیں برہم کرتی۔ 'مقابلۂ حسن' اور 'دی بائبل' کی نمایش پر اعتراض کرنے والوں کی ذہنی اور فکری پسماندگی پر ان کو تشویش ہے اور اسے وہ مسلمانوں کے لئے ایک نیک فال نہیں سمجھتے۔ چاند پر انسان کی فتح کو وہ ساری دنیا کے لئے ایک نئے خواب، نئے عہد کا پیش خیمہ قرار دیتے ہیں اور فطرت کی تسخیر کی جانب ایک اہم قدم بھی لیکن اس کے ساتھ ہی زمین پر ہو رہی نا انصافیوں، نابرابریوں، غربت و افلاس کے اندھیروں کو بھولتے نہیں اور اس تاریخی کارنامے پر یاد دلاتے ہیں کہ "لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ چاند پر کمندیں ڈالنے سے پہلے اگر وہ اپنی دنیا میں بسنے والے کروڑوں انسانوں کی زندگی سنوارنے کی فکر کرتا جو زمین کے سینے کا ناسور بن کر اس دنیا کو جہنم بنائے ہوئے ہیں تو اس کے نئے سفر میں ایک مقصد، ایک منزل اور ایک افادیت پیدا ہو جاتی۔"

ہر چند کہ بیس سال قبل اور آج کی سیاسی و سماجی فضا میں زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ تحریروں کی تازگی، جاذبیت اور مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ حالات و واقعات کی مناسبت سے ان کی موزونیت اور معقولیت شدّت کے ساتھ اُبھر آئی ہے اور یہی بات ان کی تحریروں کو زندہ جاوید بنانے کا باعث ہے۔

شمیم احمد شمیم ایک بلند پایہ ادیب اور مفکّر تھے۔ بے باک اور نڈر صحافی تھے یا سیاسی بساط کے منجھے ہوئے سیاستداں؟ یہ سوال آج بھی ریاست کے ادبی، صحافتی اور سیاسی ـــــ حلقوں میں ایک سنجیدہ بحث کا موضوع بنا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شمیم بنیادی طور پر ایک ادیب تھے اور اگر وہ ادب کو اپنی جلیل و جمیل ذہنی صلاحیتوں کا ذریعۂ اظہار بنا لیتے تو اردو کو ان میں ایک برٹینڈ رسل مل جاتا۔

اردو کے مشہور و معروف نقاد اور شمیم صاحب کے استاد پروفیسر آلِ احمد سرور انہیں دیوان سنگھ مفتوں کا ہم پلّہ صحافی قرار دیتے ہیں۔ ان کے بعض پرستاروں کی

رائے ہے کہ اگر وہ سیاست میں نہ آتے یا صحافت کا پیشہ اختیار نہ کرتے تو برصغیر کے عظیم ادیب بنتے۔ خود شمیم صاحب کا کہنا ہے "شمیم میں ایک اچھا ادیب بننے کی صلاحیتیں موجود ہیں لیکن ادب چونکہ ریاض اور لگن چاہتا ہے اس لئے اس نے اپنے لئے صحافت کا راستہ اختیار کیا ہے۔" چونکہ ادب اور صحافت کی سرحدیں ملتی ہیں اور ایک اچھا ادیب اچھا صحافی بھی بن سکتا ہے اس لئے اگر کشمیر کی صحافت میں شمیم احمد شمیم کی وفات کے بعد پیدا ہونے والا خلا آج تک کوئی پورا نہیں کر سکا اور بقول سابق وزیر اعلیٰ کشمیر سیّد میر قاسم "کشمیر کی سرزمین آج تک دوسرا شمیم پیدا نہیں کر سکی۔ ادب میں بھی ان کا ایک مخصوص اور اہم مقام ہے۔ جہاں تک ان کے سیاستداں ہونے کا تعلق ہے اس پر مدیر گگن مرحوم شمس کنول کی رائے سے اختلاف کی بہت کم گنجایش ہے۔" شمیم آخری دم تک ملک کی سیاست سے سمجھوتہ نہ کر سکا، سمجھوتہ اس لئے نہیں کر سکا کہ وہ سیاستداں نہیں تھا اور سیاستداں اس لئے نہیں تھا کہ وہ ایک شریف انسان تھا۔"

'آئینہ' کو 'آئینہ نما' بنانے کی پہلی کوشش کہاں تک کامیاب ہے اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑتی ہوں۔ آپ کا تعاون اور خلوص شامل رہا تو انشاء اللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

(قرۃ العین)

آئینہ نُما

میں حتی الامکان آئینہ دیکھنے سے گریز کرتا ہوں۔ لیکن شمیم احمد شمیم نے جو "قدآدم" آئینہ ایجاد کیا ہے، اُسے دیکھنے کی خواہش سے خود کو باز نہ رکھ سکا۔ یوں بھی کبھی کبھی آئینہ دیکھ لینا چاہیئے۔ ایسا کرنے سے اپنے خد و خال کو سنوارنے میں مدد ملتی ہے۔ اہلِ کشمیر کو ہر ہفتے شمیم کے آئینے میں اپنے سیاسی اور فکری خدوخال کو دیکھنے اور پرکھنے کے مواقع ملتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ دوستوں اور دشمنوں دونوں ہی کے لئے سود مند عمل ہے۔ اس لئے کہ آئینے کی ضرورت صرف حسینوں ہی کو نہیں پروانوں کو بھی پیش آتی رہتی ہے۔

شمیم احمد شمیم ایک نوجوان جرنلسٹ ہیں۔ ایک باشعور سیاسی کارکن ہیں۔ ایک کج بحث اور ذہین وکیل ہیں۔ ایک عمدہ ادیب اور ایک بے انتہا طبّاع انسان ہیں۔ اتنی چیزیں ایک جگہ جمع ہو جائیں تو شخصیت کی کیمیا میں ایک آنچ کی کمی بھی نہیں رہ جاتی ہے۔

شمیم کی تحریر دیکھنے سے پہلے میں اُن کی تقریر سُن چکا تھا۔ اور بڑے نازک وقت میں یہ تقریر سُن چکا تھا۔ بمبئی میں اردو کنونشن کے موقعے پر ہوم منسٹر شری چوان کی موجودگی میں جناب شمیم نے جو دھواں دھار تقریر فی البدیہہ فرمائی تھی اور جس صاف گوئی سے اردو کے سلسلے میں ہونے والی سیاسی دھاندلیوں کا پردہ چاک کیا تھا اور جس تقریر کی چنگاریاں صرف حکومتِ ہند ہی پر نہیں مجھ خاکسار

پر بھی بکھر رہی تھیں ۔ یہی وہ شعلہ بیانی تھی یا تقریر کا جادو تھا کہ کوئی گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا ۔

"آئینہ" میں کشمیر کی جن سیاسی شخصیتوں کے بارے میں پڑھتا رہوں، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انہیں بہت قریب سے دیکھ چکا ہوں، حالانکہ بیشتر ایسی ہستیاں ان میں شامل ہیں جن سے ذاتی طور پر واقف نہیں ہوں۔ یہی اس شعلہ صفت انسان کا کارنامہ ہے جسے شمیم احمد شمیم کہا جاتا ہے ۔ نام سُنئے تو لگتا ہے جیسے کوئی نہایت نرم و نازک مہکتا ہوا انسان ہوگا، ملاقات کیجئے تو جیسے دھکتا ہوا شعلہ، مدافعت کے سارے ہتھیاروں سے لیس ہو کے بیٹھئے کون جانے کس وقت گویائی کا کارتوس کس طرف چل جائے ۔ بُری عادت پڑتے دیر نہیں لگتی ۔ مجھے بھی "آئینہ" پڑھنے کی عادت سی ہو گئی ہے ۔ اسی اخبار کے بارے میں شاید کہا گیا ہے "چھٹتا نہیں ہے منہ سے کافر لگا ہوا"۔

چنانچہ اس "کافر" کے لئے ایک اور 'کافر' کی یہی دُعا ہے کہ یہ "آئینہ" کشمیر کے سیاسی، علمی اور ادبی اُفق پر اسی آب و تاب سے چمکتا رہے اور ہر چہرے کے ملمع کو بے نقاب کرتا رہے ۔

مخلص

کرشن چندر

(۱۵ر جولائی ۱۹۷۰ء)

بھائی صاحب

"قدرت کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں میری بہن! اگر میری زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں اور زندگی اور موت کی اس کشمکش میں خدائے برتر نے موت کے حق میں اپنا فیصلہ صادر کیا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کے فیصلے کو بدل نہیں سکتی۔ تمہاری فریاد آہ و فغان، دعاؤں سے قدرت کے فیصلے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں ہو سکتی"۔
بھائی صاحب کے لہجے میں اتنی گھمبیرتا اور پختگی تھی کہ میرا سارا وجود لرز کے رہ گیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ میرے تاثرات کو جان لیتے میں نے خفگی کا اظہار کیا اور بولی"۔ یہ آپ پھر سے بہکی بہکی باتیں کرنے لگے۔ آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں کہ ہم سب لوگوں کی دعائیں رائیگاں جائیں گی؟ مجھے اپنی دعاؤں پر اتنا ہی اعتماد ہے جتنا خدا کی ذات پر۔ یہ اداسی، زندگی سے بیزاری آپ کو قطعی زیب نہیں دیتی۔ ہمیں آپ کی بہادری اور جرأت سے ہی تو حوصلہ ملتا ہے۔ اور خدا کی رحمت سے مایوس ہونا گناہ ہی نہیں کفر ہے"۔
یہ پہلا موقعہ نہیں تھا جب بھائی صاحب کے اور میرے درمیان ایسی گفتگو ہوئی ہو۔ اور میں نے اس فولادی انسان کی ہمت برقرار رکھنے کی ایک ادنی اسی کوشش کی ہو جس نے ساری زندگی بڑی سے بڑی مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا تھا۔ اور اب بستر مرگ پر بھی اپنی زندگی کی لڑائی میں بڑی ہمت، حوصلے اور بہادری کا ثبوت دے رہا تھا۔ بارہا ایسے مواقع آئے۔ جب شدت

درد سے ان کے صبر و ضبط کے بندھ ٹوٹنے لگتے۔ تو وہ اپنے اضطراب اور بے چینی سے اپنی اور ہم سب کی توجہ ہٹانے کی کوشش کرتے۔ ان کی بے چینی اور بیقراری دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگتا اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ دیر کے لیے اپنی توجہ ان سے ہٹا دیتی۔ لیکن پھر ان کی ہمت، حوصلہ اور غیر معمولی قوتِ ضبط دیکھ کر میں اپنی بزدلی پر شرمسار ہو کر ان کی تیمارداری و دلجوئی ؟) میں لگ جاتی۔ ان کا عزم اور بہادری دیکھ کر میری ڈھارس بن جاتی اور میرے اس عقیدہ کو تقویت مل جاتی کہ اتنی جراءت اور مردانہ وار مقابلہ کرنے کی یہ ہمت ضرور رنگ لائے گی۔

میں نے سُن رکھا تھا کہ اس مہلک اور موذی بیماری کا مقابلہ کرنے کے لئے خود اعتمادی (WILL POWER) اور خدائے برتر کے وجود پر یقین کامل بہت ضروری ہے۔ یہ دونوں خوبیاں بھائی صاحب کی شخصیت کی اہم اور بنیادی جز تھیں وہ دانشور، صحافی، مُفکر، ادیب اور سیاستداں ہونے کے ساتھ ساتھ اِسقدر ترقی پسند تھے کہ اکثر لوگوں کو ان پر بے دین اور مذہب سے قطعی بے بہرہ ہونے کا گمان ہوتا تھا اور یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے اپنے ذہن کو فرسودہ قسم کی مذہبی رسوم و قیود کے تابع نہیں بنایا تھا۔ وہ روایتی قسم کے مذہب پرست نہ تھے۔ انہوں نے خدا کی ذات کو اپنی عقل اور تجربے سے پہچان لیا تھا۔ یوں تو وہ نماز روزہ کے پابند نہ تھے لیکن میں نے ان کی ذات میں وہ پوشیدہ صفات پائی تھیں جو مردِ مومن کا ہی خاصہ ہوتی ہیں۔ وہ تنگ نظری، جہالت اور فرقہ پرستی کے خلاف ہمیشہ صف آرا ہوتے اور ان مذہبی ٹھیکیداروں کے خلاف جہاد میں پیش پیش ہوتے جو اپنی تجارت کی خاطر مذہب کے اصولوں کا نیلام کر کے اسلام جیسے وسیع اور ترقی پسند مذہب کی بدنامی کا باعث بنتے۔ جن لوگوں کو انہیں قریب سے جاننے کی سعادت حاصل ہوئی ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ خدائے ذوالجلال کے وجود اور اُس کی برتری کے کتنے قائل تھے۔ اُن کا تو

عقیدہ یہ تھا کہ ہر مشکل سے مشکل مرحلے پر انجام کا فیصلہ خدا پر چھوڑ کر آنکھیں بند کر کے جب بھی وہ میدانِ عمل میں کود پڑے تو یہ اُس کی بے پایاں رحمت ہوتی تھی۔ جو ان کی کامیابی کی ضامن بن جاتی۔ ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:-

"میں خداوند قدوس کی رحمت کا قائل ہی نہیں بلکہ اُس کی قدرت کے لاکھوں مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔"

اپنی بے پناہ خداداد صلاحیتوں کے ساتھ خدا کی ذات پر بھروسے نے مجھے ان کا زیادہ شیدائی بنا دیا تھا۔ وہ بغاوت اور سرکشی کے علاوہ خودداری اور غیرت کے جذبے سے سرشار تھے۔ مصائب اور مشکلات کے پہاڑوں سے ٹکر لینا اُن کی فطرت تھی۔ اور وہ ہم سے بھی ہمیشہ یہ چاہتے تھے کہ ہم کسی بھی حالت میں اپنی خودداری پر حرف نہ آنے دیں۔ بیماری کے ابتدائی ایّام میں انھوں نے میرے نام ایک خط لکھا تھا:

"تم تو دوسروں کے لیے رو رو کر اپنی جان ہلکان کرتے ہو اپنے بھائی کی سلامتی، صحت یابی اور تندرستی کے لیے دُعا کی خاطر تمہیں خُدا کے جس دربار میں بھی جانا پڑے جاؤ۔ لیکن اس بات کا خاص خیال رکھو کہ جہاں بھی جاؤ وقار، متانت اور توازن کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔ دُشمنوں کے سامنے تمھارا سر تو کیا تمہاری نگاہیں نہ جھکنے پائیں۔ بڑی دِل جمعی، یکسوئی اور اطمینان کے ساتھ خدا سے میری زندگی کی دُعا مانگو۔"

خُدا پر اعتماد کے اس عقیدے کو میں نے ان کی زندگی کے آخری لمحے تک تقویت پہنچانے کی بھرپور کوشش کی۔ میں نے انھی کے بھروسے اور ایمان کے جذبے کو اُدھار لے کر ان کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ خدا کی ذات پر ان کا اعتماد اور بھروسہ کتنا صحیح اور ضروری ہے۔ خود میرے دل کی بھی یہی آواز تھی

کہ لاکھوں مدّاحوں اور پرستاروں کی پُرخلوص اور نیک دعاؤں کے طفیل انہیں نئی زندگی مل جائے۔

ان تمام حقائق کے باوجود یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ وہ اس تلخ حقیقت سے فرار کے حق میں نہ تھے وہ ایک لاعلاج اور موذی مرض کے شکار ہیں۔ وہ اکثر باتوں باتوں میں بڑی جواں مردی اور جرارت سے ہمیں یہ بات ذہن نشین کراتے کہ ان کے مرض کی شدّت بڑھ چکی ہے اور اس کا علاج انسانی بس کی بات نہیں ہمیں خاموش پاکر وہ موقع کو غنیمت جان کر دھیمے دھیمے مفکرانہ انداز میں زندگی کے نشیب و فراز سمجھانے لگتے۔ اتفاقاً ایک دن میں تنہا ہی ان کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ تکیے کا سہارا لے کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اپنی گفتگو کا رخ بدل کر کہنے لگے۔ "اگر خدا کو میری صحت یابی منظور نہیں تو تمہیں بڑی جرأت اور حوصلہ مندی سے اس حادثہ کا سامنا کرنا ہے۔ ہمت ہارنا بزدلوں کا شیوہ ہے اور تم جانتی ہو میں نے بُزدلی اور خوف کے خلاف جنگ سے اپنی زندگی کی لڑائیوں کا آغاز کیا ہے۔ میری ساری زندگی ظلم و جبر، ناانصافی اور تشدّد کے خلاف جہاد کی ایک کھلی کتاب ہے۔ میں نے ہر مشکل اور مصیبت میں اپنے اصولوں کو عزیز رکھا اور کسی بھی قیمت پر ان کا سودا نہیں کیا۔ چاہے اصولوں کا سودا کرنے والی شخصیت کتنی ہی با اثر اور طاقتور کیوں نہ ہو"

"میں نے اپنی انا، خودداری اور غیرت کی حفاظت کی خاطر اپنی ساری زندگی کو داؤ پر لگایا۔ اور حق و باطل کی اس جنگ میں تم دیکھتی ہو۔ میں نے سب کچھ کھو دیا لیکن اپنے ذہن اور ضمیر کی آزادی کو زندہ رکھا۔ اور یہی میری زندگی کی پونجی ہے۔ میری زندگی کا کیا بھروسہ۔ آج ہوں کل نہیں۔ لیکن موت تو صرف میرے جسم کی ہوگی۔ میرے اصولوں کی نہیں۔ میری یہ بات یاد رکھنا۔ میری بہن! کہ کبھی کسی بھی حالت میں اپنے ضمیر کے خلاف کوئی سمجھوتہ نہ کرنا چاہیئے۔ چاہے تمہیں اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑے۔ ایسا نہ ہو کہ دنیا یہ کہے۔ بہادر اور خوددار بھائی کی بہن بُزدل ثابت ہوئی۔ اپنی آن بان وقار اور خودداری کو ہر حال میں برقرار

رکھنا۔ میں جانتا ہوں میری ان باتوں سے تم پر کیا گذر رہی ہے۔ لیکن ہمت سے کام لے کر میری یہ بات گرہ میں باندھ لو کہ میری موت پر تمہارا ماتم بھی وقار اور شائستگی کی حدود میں ہوگا۔ ان کی اس مختصر مگر جگر چھلنی کرنے والی "تقریر" کے دوران اُن کے صبر و ضبط اور تسلسل کا عالم دیکھ کر مجھے بیچ میں ٹوکنے کی ہمت نہ ہوئی۔ میرا دِل اس حرکت پہ اداس تو ہو گیا مگر دماغ اس بات پہ عش عش کر اُٹھا کہ یہ آدمی اس جرأت اور اطمینان سے اپنی موت کا ذکر کر رہا ہے جیسے کسی کی سرگذشت سُنا رہا ہے۔ آج سوچتی ہوں تو دنگ رہ جاتی ہوں کہ مجھ میں اتنی ہمت اور صبر کہاں سے آگیا کہ میں چُپ چاپ پتھر کی مورت بنی، اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر یہ سب کچھ سنتی رہی۔

بیماری کے آخری ایّام میں ان کی تکلیف کی شدت بڑھ گئی اور حیرت کی بات یہ ہے کہ تکلیف بڑھ جانے کے ساتھ ہی ان کی قوت برداشت میں بھی غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ جیسے جیسے ان کی حالت بگڑتی گئی۔ ان کا عزم اور حوصلہ جوان ہوتا گیا۔ دراصل وہ ہم سب کو اپنی موت کے لیے بڑی شان اور بہادری سے تیار کرنا چاہتے تھے۔ اور میری ضعیف الاعتقادی اور خوش فہمی کا یہ عالم تھا کہ میں اب بھی اس معجزے کے ظہور کی منتظر تھی جس کی ایک دُنیا کو اُمید تھی۔ شاید انسانی فطرت کا یہی تقاضہ ہو کہ اپنے عزیز کی موت کو ایک انہونی اور ناقابلِ یقین بات سمجھتے ہیں اور بھائی صاحب میرے بھائی ہی نہیں میرے بہترین دوست، میرے غمگسار، ہمراز اور میرے آئیڈیل تھے۔ ان کی موت کا تصوّر بھی میرے لیے ناقابلِ معافی جُرم تھا۔۔۔!

میں نے بارہا انہیں اپنے درد و کرب کو دبانے کی انتہائی کوشش کرتے ہوئے پایا۔ ان کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ ان کی تکلیف۔ ان کا کرب ہم سب کے لیے اذیت ناک اور ناقابلِ برداشت ہے۔ اور اسی احساس کو مدِ نظر رکھ کر درد کو سینے میں دبا کر رہ جاتے اور کروٹ بدل بدل کر درد کو کم

کرنے کی ناکام کوشش کرتے۔

اللہ اللہ! یہ آدمی ہے یا صبر وضبط اور ایثار کا جیتا جاگتا مجسمہ! میں ان کی یہ حالت دیکھ کر ان کی عظمت اور اعلیٰ ظرفی کی قائل ہو جاتی، لیکن ان کی بے قراری اور تڑپ میرے لیے ناقابل برداشت بن جاتی۔

اسی دوران میں نے علوی صاحب (میں نے ڈاکٹر کی حیثیت میں ان کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ وہ ہمارے لیے ڈاکٹر نہیں، بلکہ گھر کے فرد کی حیثیت رکھتے تھے۔) کی موجودگی میں یہ شکایت کی کہ یہ اپنے درد کو اس حد تک دباتے ہیں کہ ان کی تکلیف میں غیر معمولی شدت ہو جاتی ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اپنی ناچیز رائے کا اظہار کیا کہ اپنی تکلیف کا اظہار نفسیاتی طور ان کے حق میں بہتر ہو گا۔ علوی صاحب کی خاموشی کو میری تائید سمجھ کر وہ بولے

ڈاکٹر! اس حقیقت کے باوجود کہ آپ ڈاکٹر ہیں اور میری بیماری کے بارے میں آپ کی معلومات وسیع ہیں۔ مجھے یہ کہنے دیجیے کہ آپ میرے درد و کرب کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ لیکن پھر بھی میں یہی کہوں گا۔ کہ اگر آپ مجھے یہ یقین دلائیں کہ میرے اظہار درد سے میری تکلیف میں صرف پانچ فیصد اضافہ ہو گا تو آپ میرے کراہنے اور فریاد کی آواز گھر کی چار دیواری سے باہر بھی سُن پائیں گے لیکن میں جانتا ہوں کہ میری اس "نازیبا" حرکت سے میرے درد میں کمی کی بجائے میرے تیمار داروں کی تکلیف میں اضافہ ہو گا۔ جو مجھے کبھی منظور نہیں۔"

ہمارے تئیں ان کے یہ جذبات اور احساسات دیکھ کر میں گھٹ کے رہ گئی۔ اور علوی صاحب لاجواب ہو کر رہ گئے۔ یہ اُن کی عالی ظرفی کا ایک اور ثبوت تھا۔ ان کے ایک قریبی دوست نے واقعی سچ کہا تھا "کہ خدا نے ان کا ظرف دیکھ کر ہی ان کو اتنے بڑے امتحان میں ڈالدیا ہے۔"

یوں تو جب سے وہ بیمار پڑے ان کی مزاح کی حس اور ظرافت میں کوئی کمی نہ

آئی تھی۔ لیکن چند ہفتے قبل جب اُنھیں اپنی موت کا یقین ہو چکا تھا۔ اُن کی ظرافت کی رگ کچھ زیادہ ہی پھڑکنے لگی تھی۔ اور جب بھی اُن کی بیقراری اور تڑپ کو تھوڑا قرار آتا تو وہ ہمارے ساتھ دنیا بھر کی باتیں کرتے۔ ان کی بھرپور کوشش یہی ہوتی کہ ان چند ہی لمحوں میں وہ ہمارے ساتھ سارے جہاں کی خوشیاں اور مسرتیں بانٹیں۔ ان کے مذاق، فقرے، طنز و مزاح سے بھرپور حملے اور حاضر جوابی تھوڑی دیر کے لیے ہمیں ایک نئی ہی دنیا میں لے جاتی۔ اس کیفیت کو دیکھ کر کون کمبخت یہ سوچ سکتا کہ میرے بھائی صاحب موت کے بے مروت اور بے رحم فرشتے سے برسرپیکار ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ انہیں اپنی موت کا یقین ہو چکا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ موت کا فرشتہ کسی بھی لمحہ آکر ان کی زندگی کا چراغ گل کر دے گا، وہ بس چند لمحوں کے لیے ہی اپنے سوگوار اور غم زدہ عزیزوں کو غم والم کی منحوس دنیا سے نکال کر ان پر چھوٹی موٹی خوشیوں اور مسرتوں کے پھول نچھاور کرتے۔ اس وقت وہ اپنے مرض کی نوعیت، تکلیف اور بے لبسی کو بظاہر بھول کر ہمیں یہ احساس دلاتے کہ وہ واقعی مذاق کے موڈ میں ہیں اور ہنسی مذاق کی اس محفل میں دل سے حصّہ لے رہے ہیں۔ اور اسی میں ان کی عظمت کا راز پنہا تھا۔!

۳۰ر اپریل کی صبح سے اُن کی حالت بگڑنے لگی۔ جسمانی طور وہ ضعیف و لاغر ہو چکے تھے اور کمزوری اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ وہ بغیر سہارے کے اُٹھ نہیں پاتے تھے۔ درد کی شدّت اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ وہ نڈھال ہو چکے تھے اور اپنی تکلیف کا اُنہیں کوئی احساس نہیں تھا۔ بظاہر جسمانی طور پر وہ نیم مدہوشی کی حالت میں تھے۔ لیکن ان کا ذہن برابر مستعد تھا۔ وہ ہماری آپس کی سرگوشی بھی سن پاتے اور آنکھیں کھول کر ہمیں احساس دلاتے کہ وہ ذہنی طور پر جاگ رہے ہیں۔ اور کبھی کبھی اچانک بغیر کسی سہارے کے بستر سے اُٹھ پاتے۔ موت اور حیات کے درمیان کشمکش کے ان آخری لمحوں میں بھی انہیں کسی کا سہارا گوارا نہ تھا۔ اچانک بستر سے اُٹھ جانے سے اُن کو تکلیف تو ضرور ہوتی۔ لیکن وہ اپنے نڈھال پن کمزوری اور

نیم مدہوشی کی حالت سے بغاوت کر کے خود ہی اُٹھ پاتے اور ضرورت کی کوئی چیز مانگتے، وہ بنیادی طور پر ایک باغی تھے نا۔!

بار بار اُٹھنے اور لیٹنے کی اس کوشش کو دیکھ کر ہم نے فیصلہ کر لیا کہ ان کی بیقراری اور بے چینی کو کم کرنے کے لیے انہیں آرام کا انجکشن دیا جائے۔ ڈاکٹر سے مشورے کے بعد انہیں انجکشن دیا گیا۔ اس کے فوراً بعد انہیں سکون آ گیا۔ اور وہ نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ انہیں پُرسکون اور نیند میں پا کر میں نے بھی اپنے دل کی دھڑکن پر قابو پا کے ان کے قریب جانے کی ہمّت کی۔ میں ان کے نزدیک گئی اور سرہانے بیٹھ کر ان کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیر کر ان کے چہرے کے خدوخال کو غور سے دیکھنے لگی۔ میرے دل کی گہرائیوں نے یہ محسوس کرنا شروع کیا تھا کہ مُعجزے کا ظہور ایک دیوانے کا خواب ہے اور میں دیکھ رہی تھی کہ میرے بھائی صاحب نے ہم کو روتا سسکتا چھوڑ کر سفر آخرت کی تیاری شروع کی ہے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ ایک ہاتھ سینے پہ تھا اور ایک ہاتھ میں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پچھلے کئی روز سے وہ شیو بھی نہیں کر پائے تھے۔ ان کا چہرہ کمزور لیکن فرشتوں کا سا تقدس اور جلال لیے تھا۔ انہیں پُرسکون اور گہری نیند میں پا کر بے اختیار میری آنکھوں سے دو آنسو ٹپکے اور اُن کے ماتھے پر گر گئے۔ میں گھبرا گئی اور اس ڈر سے جلدی سے صاف کر لیے کہ کہیں وہ جاگ نہ جائیں۔ لیکن نہیں۔ آج تو بڑی دیر بعد وہ گہری نیند میں تھے۔ کچھ لوگ ان کے پاؤں کے پاس سر جھکائے بیٹھے تھے اور کچھ ایک کونے میں بیٹھ کر گہری سوچ میں غرق تھے۔ عجیب افسردگی کا ماحول چھایا تھا۔ درودیوار سے یاس ٹپک رہی تھی اور کمرے میں سناٹا چھایا تھا۔ میں بھی سوچ میں غرق نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ مجھے وہ دن یاد آ گیا جب انہیں پہلی بار بخار آیا تھا۔ اور ایک ایک کر کے سارے سال کے واقعات میری نظروں کے سامنے گھوم گئے۔ میرے دل میں درد کی ٹیسیں اُٹھنے لگیں۔ میں نے آہستہ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور آنسو کو پیتی ہوئی کمرے سے باہر آ گئی۔

دن کے چار بجے بھائی صاحب جاگ گئے۔ آرام کی نیند کے چند گھنٹوں نے ان کے ذہن پر اچھا اثر کیا تھا۔ جاگتے ہی انہوں نے وقت پوچھا اور ہاتھ منہ دھویا۔ ہاتھ منہ دھو کر ادھر اُدھر نظر دوڑا کر ایک دم کہنے لگے "میں کچھ دیر کے لیے کمرے میں ٹہلنا چاہتا ہوں۔" اس غیر متوقع خواہش کو سن کر ہم ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ انہوں نے اس بات پر حیران ہوتے دیکھا، تو ہم پر برس پڑے۔

"کیوں میں کوئی لاطینی زبان میں بات کر رہا ہوں، جو آپ کی سمجھ میں نہیں آتی۔ میں لیٹے لیٹے تھک گیا ہوں اور اپنی تھکان دور کرنا چاہتا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم سے کھڑے ہو گئے۔ میں نے اور بھابی نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔ ہم پر برائے نام بوجھ ڈال کر وہ کمرے میں کچھ دیر ٹہلتے رہے اور پھر کھڑکی کے پاس کچھ دیر کھڑے رہ کر باہر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور پھر بستر پر لیٹ گئے۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ ان کی حالت لمحہ بہ لمحہ بگڑتی جا رہی ہے۔ لیکن وہ ایک ناتواں، اپاہج کی موت مرنا نہیں چاہتے تھے۔ بستر پر لیٹ کر انہوں نے کچھ کھانے کی فرمائش کی۔ میں گرم دُودھ لائی۔ دُودھ کا گلاس تھام کر میں اُن کے قریب گئی اور چاہا کہ چمچ سے ان کے حلق میں دُودھ ڈالوں۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتی۔ انہوں نے ہاتھ سے روکا۔ بڑی مشکل سے اُٹھ پائے اور گلاس ہاتھ میں تھام کر خود پینے لگے۔ میں نے دیکھا ان کے ہاتھوں میں کپکپی طاری تھی۔ مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں گلاس گر نہ پائے لیکن تھامنے کی ہمت نہ پڑی۔ نقاہت اور کپکپی کے باوجود انہوں نے آرام سے دودھ پیا اور گلاس میرے ہاتھ میں تھما کر پھر لیٹ گئے۔ میرا ذہن مفلوج ہو رہا تھا۔ کمزوری کی اس انتہا میں خود اُٹھ کر دودھ پینا کمرے میں ٹہلنا۔ یہ سب کم از کم میرے لیے ایک کرشمہ سا تھا۔ یہ انسان کس مٹی سے بنا ہوا ہے۔؟

شام ہوتے ہوتے انجکشن کا اثر ختم ہو چکا تھا اور بھائی صاحب پوری طرح جاگ چکے تھے۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر صاحب بھی آگئے اور دن بھر کی کیفیت پوچھنے لگے۔ بھائی صاحب کے کہنے پر انہوں نے ان کا معائنہ کیا۔ معائنے کے فوراً بعد ان سے کہنے لگے۔

"ڈاکٹر صاحب! دردِ جگر کو رہنے دیجیئے یہ تو بتایئے دلِ ناتواں کا کیا حال ہے؟"

غیر ارادی طور پر ڈاکٹر کی نظریں ہم پر اُٹھیں۔ اور کچھ دیر ٹھہر کر بولے۔ دل۔ دل تو آپ کا بالکل ٹھیک ہے۔ کہوں آپ کیا محسوس کر رہے ہیں؟

"میں تو بس پھر سے سو جانا چاہتا ہوں۔ کہیئے آپ کوئی نصیحت کرنا چاہتے ہیں؟"

ڈاکٹر نے زبردستی اپنے چہرے پر مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "تو آپ کو کون روکتا ہے۔ آرام سے سو جایئے۔ انشاء اللہ میں صبح پھر حاضر ہو جاؤں گا۔ بھائی صاحب نے یہ سُن کر کروٹ بدل لی اور ڈاکٹر آہستہ سے اُٹھ کر چلے گئے۔ کِسے معلوم تھا۔ یہ اُن کی زندگی کی آخری رات ہے۔؟

رات نسبتاً آرام سے گذری۔ صبح چھ بجے جاگ گئے اُٹھ کر بیٹھنے کی خواہش کی۔ اُٹھ کر بیٹھتے ہی کہنے لگے۔

"پانی لاؤ میں ہاتھ منہ دھو کر ناشتہ کروں گا۔"

ہاتھ منہ دھلانے کے بعد دودھ لایا گیا۔ تو خود پینے کی ضد کرنے لگے۔ ان کے ہاتھ میں تھرتھراہٹ اتنی تھی کہ میں نے گلاس اُن کے ہاتھ میں دے کر خود بھی جرأت کر کے گلاس کو تھامے رکھا۔ گلاس سے آہستہ سے نظریں ہٹا کر میری طرف دیکھا اور مجھے لگا کہ انھیں میری اس حرکت پر کوئی اعتراض نہیں۔

دودھ کے چند گھونٹ پی کر انہوں نے گلاس واپس کر کے لیٹنے کی خواہش کی۔

میری چھٹی حس نے نہ جانے کیا گواہی دی کہ میں سر سے پاؤں تک کانپ گئی میں نے گھبرا کر سب کی طرف نظر دوڑائی کہ کہیں میرا چہرہ پڑھ کر یہ لوگ میرے دل کی کیفیت نہ بھانپ لیں۔ سب کے لبوں پر مہر خاموشی تھی۔ لیکن چہروں پر یکساں تاثرات تھے۔

ان کی بیقراری کو بڑھتے دیکھ کر ساڑھے آٹھ بجے ان کو نیند کا انجکشن دے دیا گیا۔ انہیں آرام آ گیا اور میرا دماغ میرے دل کو آنے والی قیامت کے لیے تیار کرنے لگا۔ دل و دماغ میں عجیب کشمکش جاری تھی۔ دل جس بات کو ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ دماغ اسی سانحہ کی گواہی دے رہا تھا۔

دس بج کر ۲۰ منٹ پر علوی صاحب آ گئے۔ ان کے چہرے کی سنجیدگی اور حزن و ملال کو دیکھ کر میرے دماغ کی گواہی کو تقویت ملی، اور میرا دل ڈوبنے لگا۔ علوی صاحب نے بھائی صاحب کا ہاتھ سہلا کر آہستہ سے پوچھا "شمیم صاحب کیا حال ہے؟ آپ مجھے پہچان رہے ہیں نا میں کون ہوں؟" یہ سن کر بھائی صاحب کے ہونٹوں پر دلنواز مسکراہٹ بکھر گئی اور آنکھیں کھول کر علوی صاحب کو دیکھا۔ پھر کمرے کے چاروں طرف نظر دوڑا کر اپنی نگاہیں ہمارے چہروں پر مرکوز کیں اور ہمیں آخری بار صبر و ضبط، غیرت، بہادری اور جرارت کا ابدی پیغام دے کر موت کے فرشتے کو گلے لگا کر اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کر کے اپنے اس قول کو صحیح ثابت کر دیا کہ قدرت کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں اور ان میں ترمیم کی کوئی گنجائش نہیں۔"

سارے چراغ بجھ گئے سب نقش مٹ گئے
پھر بھی سفرِ حیات کا جاری ہے کیا کروں

قرۃ العین
(یکم مئی ۱۹۸۱ء)

شانِ نزول

آئینہ کا اجرا میرے ایک دیرینہ خواب کی تعبیر ہے۔ پچھلے آٹھ برسوں میں میں نے ایک اخبار کے لئے اجازت نامہ حاصل کرنے کے لئے کیا کیا جتن کیے، کتنی منتیں اور خوشامدیں کیں لیکن جن لوگوں نے فکر اور سوچ پر پہرے بٹھا دیئے ہوں انہیں اظہار کی گستاخی کیونکر گوارا ہوسکتی تھی۔ جہاں اخبار کے اجرا کی خواہش کو بناوٹ اور غداری سے تعبیر کیا جاتا ہو۔ وہاں کس کو یہ جرأت ہوسکتی تھی کہ وہ حرفِ مدّعا زبان پر لائے! ــــ میں نے کئی بار اس مجنونانہ خواہش کا دبے زبان میں اظہار کیا۔ اپنی وفاداریوں کا یقین دلانے کے لئے کئی مرتبہ اپنے قلم اور ضمیر کا خون کر دیا۔ ابوجہلوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنی روح کو کئی بار زخمی کر دیا۔ لیکن ان کی عیّار نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ اس خاکستر میں بغاوت کی کچھ چنگاریاں موجود ہیں۔ جو آزادی کی ہوا لگنے سے شعلہ بن سکتی ہیں۔ اس لئے جب بھی حرفِ مدّعا زبان پر آیا میری زنجیریں اور کس دی گئیں۔ مجھے شک و شبہ کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔ مجھ پر الزام عائد کیا گیا کہ میں سوچتا ہوں اور یہ کہ میں بہت بُرے بُرے خواب دیکھتا ہوں۔ سوچنا تو ایک شعوری فعل ہے۔ میں اس پر پابندی عائد کر سکتا تھا لیکن خواب کا تعلق تو لاشعور سے ہے اس لئے یہ میری گرفت سے باہر تھے۔ میں خواب دیکھتا رہا اور پچھلے گیارہ برسوں میں خواب دیکھنا جُرم تھا۔ خوابوں کے کوتوالوں نے خبر دی کہ شہر میں ایک نوجوان غلط قسم کے خواب دیکھ رہا ہے۔ قصرِ شاہی سے فرمان جاری ہوا کہ اسے شہر بدر کر دو۔ اس پر جینا

حرام کردو۔ اس کی آنکھوں سے نیند اُڑادو تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔ دوسروں کو عبرت ہوئی یا نہیں لیکن خود میری آنکھیں ضرور کھُل گئیں۔ خوابیدہ احساس نے کروٹ لی۔ جس شعور کو تھپکیاں دے دے کر سُلا دیا تھا، وہ جاگ اُٹھا، غلامی اور ذلّت کی چھاؤں میں رہ کر میں اپنی زنجیروں سے کچھ مانوس ہو گیا تھا۔ مجھے یہ زنجیریں بھی اپنے وجود کا ایک حصّہ نظر آنے لگی تھیں۔ اب ان زنجیروں کا بوجھ ناقابلِ برداشت معلوم ہونے لگا۔ مجھے اپنے ماضی سے نفرت اپنے حال سے بے اطمینانی اور اپنے مستقبل سے وحشت ہونے لگی۔ اور یہ نفرت، یہ بے اطمینانی اور یہ وحشت آئینہ کے اجرار کی شانِ نزول بھی ہے اور میری آٹھ سالہ کشمکش کا حاصل بھی!

میری حکایت دراصل ایک پورے دور اور ایک پوری نسل کی کہانی ہے۔ یہ دور ۱۹۴۷ء سے شروع ہوتا ہے اور یہ نسل اسی دور میں پروان چڑھی ہے۔ ہماری پیدائش آزادی کے نعروں کی گونج میں ہوئی۔ ہمارا لڑکپن آزادی کی لوریاں سنتے سنتے سو گیا۔ اور جب ہم نے عنفوانِ شباب سے ہو کر شباب کی منزلوں میں قدم رکھا تو ملک آزاد ہو چکا تھا۔ آزادی کے نعرے، گیت اور لوریاں رومان کی بلندیوں سے اُتر کر حقیقتوں سے ہم آغوش ہو گئے تھے۔ آزادی کا سُہانا خواب ایک ڈراؤنی تعبیر بن کر ہمارے سامنے آگیا۔ آزادی کی نیلم پری ایک بھتنی بن کر ہمارے لئے وحشت اور سراسیمگی کا سامان بن گئی۔ جس جنّت کا تصوّر ہم نے اپنا خون دے کر سنوارا تھا وہ دوزخ سے بھی بدتر نکلا۔ ہمیں یوں محسوس ہونے لگا کہ ہم سے دھوکہ ہوا ہے۔ لیکن تاریخ کا کارواں بہت آگے بڑھ چکا تھا۔ اس خیال سے کہ شاید منزل پر پہونچ کر اپنے خیالوں کی جنّت نظر آئے۔ ہم پھر کچھ دور تک گئے۔ لیکن جوں جوں ہم آگے بڑھتے جا رہے تھے منزل ہم سے دور ہوتی گئی۔ رات کی سیاہی بڑھتی گئی اور پچھلے گیارہ برس میں ہم نے ایک بار بھی روشنی کی کرن نہیں دیکھی ہے۔ مایوسی ہمارا مقدر بن گئی، اور چاپلوسی ہمارا شعور۔ ہمارے کردار اتنے مسخ ہو گئے کہ ہم میں باعزّت قوموں کی کوئی خصوصیت باقی ہی نہیں رہی۔ خوف، ڈر، وحشت اور سراسیمگی ہمارے خون میں سرایت کر گئی۔ شرافت، انسانیت، تہذیب کی کچھ نئی قدریں وجود میں آگئیں۔ سماج کا انتہائی ذلیل اور غیر صحت مند عنصر ان نئی قدروں کی

علامت بن گیا۔ نئی نسل کے غرور، خودداری اور ذوقِ یقین کو پامال کرنے کے لئے وہ حربے استعمال کئے گئے کہ نازیوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

بہرکیف یہ ایک طویل اور روح فرسا داستان ہے۔ اور میرا ارادہ ہے کہ میں اس حکایتِ خونچکاں کو مکمل طور پر قلم بند کر کے آئندہ ناظرینِ "آئینہ" کی خدمت میں پیش کروں گا۔ اس وقت مقصود صرف یہ ہے کہ اس پسِ منظر کی طرف اشارہ کیا جائے۔ جس میں ہمارے ذہن اور شعور نے پرورش پائی ہے۔ اب جبکہ رات کی سیاہی مٹ چکی ہے اور ایک خوش آئند صبح کا تصوّر پھر ہمارے ذہنوں میں کروٹیں لینے لگا ہے۔ ہمیں اپنے اعمال کا جائزہ لیکر اپنے کردار کا محاسبہ کرنا ہوگا۔ بعض ذہین اور طباع لوگ اپنے کردار کی تاویلیں، اور توجیہیں کریں گے، کچھ عیّار طبع عوام کے کمزور حافظے پر اعتماد کر کے انہیں یہ باور دلانے کی کوشش کریں گے کہ وہ انتہائی سادہ و معصوم ہیں، کچھ لوگ اپنے کارناموں پر پردہ ڈالنے کے لئے نئے مجاہدوں کی صف میں شریک ہوں گے۔ کچھ تجزیاتی قسم کے لوگ تاریخی اسباب کی تلاش میں آوارہ پھر کر یہ فیصلہ دیں گے کہ ماضی میں جو کچھ ہوا ہے اس کی ذمہ داری صرف ایک فرد یا چند افراد پر ہے اور بس! ——— میں اس قسم کی تاویلوں اور توجیہوں میں پناہ نہیں لینا چاہتا۔ میرا ایمان ہے کہ پچھلے گیارہ برسوں میں یہاں جو کچھ ہوا ہے ہم سب پر اسکی برابر ذمّہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہم سب نے ملکر اس طاغوتی نظام کو برقرار رکھا تھا۔ ہم سب نے اپنے ضمیر اور شعور کا خون دے کر یہاں ابوجہلوں کو زندہ رکھا تھا۔ اس جرم میں وہ لوگ بھی شریک ہیں جنہوں نے اپنی چھوٹی سی دنیا آباد رکھنے کے لئے زندہ باد کے نعرے لگائے اور وہ بھی جو خاموشی سے یہ خونیں ڈرامہ دیکھتے رہے۔ وہ لوگ بھی مجرم ہیں جو نمرود کی خدائی پر ایمان لائے۔ اور وہ بھی جو اس خدائی کا تماشا دیکھتے رہے۔ عذر لنگ تراشنے سے بہتر یہ ہے کہ ہم اپنے جرائم کا اعتراف کریں اور یہ عہد کریں کہ ہم اپنے گناہوں کا کفّارہ ادا کریں گے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ ہم ایک بہتر سماج قائم کرنے کے لئے اپنا تن، من، دھن سب کچھ داؤ پر لگا دیں۔ یہ عہد کرلیں کہ ہم آئندہ اپنے چھوٹے چھوٹے مفادات کے لئے ملک و قوم کے مفادات کو کسی قیمت پر قربان نہیں کریں گے۔ کسی ظالم، جابر،

بد دیانت اور جاہل حکمراں کو برداشت نہیں کریں گے۔ ہم اپنے ضمیر کی آواز کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ اور ہر ظلم اور زیادتی کے خلاف آواز بلند کریں گے۔ میرا یہ عہد آئینہ کے اجراء کا محرک ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ میں ہر قیمت پر اپنے اس مقدس عہد کی آبرو رکھوں گا۔ یہ دنیا کو مطمئن کرنے کا سوال نہیں اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کا سوال ہے۔

(یکم جولائی ۱۹۶۸ء)

یہ اخبار کس کا ہے ؟

آجکل اخبارات کی برسات ہوئی جا رہی ہے۔ اور صحافتی دنیا میں ایک عجیب قسم کی ہلچل ہے۔ دھڑا دھڑ نئے اخبارات جاری ہو رہے ہیں۔ اور ایک اطلاع کے مطابق سری نگر سے کئی روزنامے اور ہفتہ وار اخبار شائع کرنے کے لئے درجنوں درخواستیں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے دفتر کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پچھلے سترہ برسوں میں جس سیلاب کو روکنے کے لئے زبردست باندھ تعمیر کئے گئے تھے وہ اپنی پوری شدّت کے ساتھ اب ساری ریاست کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔ یہ سیلاب ریاست کی سیاسی، علمی، ادبی اور صحافتی زندگی کے لئے ایک نیک شگون ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ نئے نئے چراغوں کے روشن ہونے سے سترہ سال کا گھٹا ٹوپ اندھیرا دور ہوگا۔ ہم اندھیرے میں رہنے والوں کی آنکھیں شاید روشنی کی نئی نئی کرنیں دیکھ کر چندھیا جائیں۔ لیکن رفتہ رفتہ دیدۂ حیراں روشنی سے مانوس ہوتی جائیں گی۔

"آئینہ" کو دیکھ کر لمحہ بھر کے لئے آپ کو اپنی صورت نظر آئے گی۔ اور کچھ دیر بعد آپ کو اس میں اور بھی صورتیں نظر آئیں گی۔ یہ صورتیں آپ کے اردگرد کے دنیا کی، آپ کے ماحول کی، آپ کے ماضی و حال اور مستقبل کی صورتیں ہوں گی۔ اور پھر آپ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ یہ کس کا آئینہ ہے ؟ یہ کسی سیاسی لیڈر کی جائداد ہے ؟ یہ کس سیاسی جماعت کا نمائندہ یا نوکر ہے ؟ یہ کس رئیس کی کرامت ہے ؟ یہ کس سیاسی نظریئے یا مذہبی فرقے کی ترجمانی کرے گا ؟ یہ اور بہت سے سوالات ذہن میں اُبھریں گے۔ ان تمام سوالات کا جواب یہ بھی دیا جاسکتا تھا کہ "آئینہ" کا کسی جماعت یا لیڈر سے تعلّق نہیں۔ یہ عوام کا اخبار ہے۔ لیکن میں دو وجوہ کی بنا پر خود اس جواب سے مطمئن نہیں ہوں۔ اوّلاً یہ کہ یہ بڑا روایتی

جواب ہے ۔ اور ثانیاً یہ پوری حقیقت بھی نہیں ۔ یہ صحیح ہے کہ "آئینہ" عوام کے ہر جائز ، صالح اور معقول مطالبے کی حمایت کرے گا ۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ سستی مقبولیت حاصل کرنے کے لئے " آئینہ " اعتدال، توازن اور صحت مند تنقید کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دے ۔ اپنے یہاں صحافتی تنقید کے معنی صرف حکومت کی نکتہ چینی سمجھا گیا ہے ۔ لیکن جمہوری نظام کی بقا کے لئے صرف حکومت پر ہی نکتہ چینی کرنا کافی نہیں، عوام کو بھی تنقید اور ہدف کا موضوع بننا چاہیئے ۔ "آئینہ" جہاں حکومت کی فروگزاشتوں کو بے نقاب کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرے گا وہاں وہ بڑی بے باکی کے ساتھ تعصّب ، تنگ نظری ، فرقہ پرستی ، جہالت اور توہم پرستی کے خلاف بھی جہاد کرے گا ۔ " آئینہ " کا کام صرف تصویریں دکھانا ہی نہیں بلکہ نئی تصویروں کے خاکے تیار کرنا بھی ہے ۔ یہ اخبار اس نئی نسل کی نمایندگی کرتا ہے جو آزادی کے بعد اس ملک میں پروان چڑھی ہے ۔ یہ نئی نسل کسی ایک لیڈر یا سیاسی جماعت کی قیادت قبول نہیں کرتی ۔ یہ کسی بندھے ٹکے نظریے کی غلام نہیں بلکہ نئے نظریات کو جنم دیتی ہے ۔ سیاست ، زندگی ، مذہب اور اقتصادیات کے متعلق اس کے کچھ مخصوص نظریات ہیں ۔ ہم " آئینہ " کے ذریعے نظریات کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں ۔ اس لیے یہ ہر اس نوجوان کا اخبار ہے جو اس نئی نسل سے تعلق رکھتا ہے ۔ " آئینہ " کے صفحات ، روشن خیال ترقی پسند اور صالح مباحث کے لئے وقف ہیں ۔ موجودہ دور میں جب ہر اخبار ایک مخصوص سیاسی جماعت سے متعلق ہو کر رہ گیا ہے ۔ ایک ایسے اخبار کی ضرورت شدّت کے ساتھ محسوس کی جا رہی تھی جو سیاسی وابستگیوں سے آزاد ہو کر سیاسی ، سماجی اور معاشی مسائل پر بحث کر سکے ۔ مجھے یقین ہے کہ " آئینہ " اس ضرورت کو پورا کریگا ۔

(یکم جولائی ۱۹۶۸ء)

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

اگر آج میرا قلم بھی میرے جذبات کا ساتھ دے سکتا، تو میں اپنی نمناک آنکھوں سے چند آنسو مستعار لے کر وہ حشر برپا کرتا کہ آسمان بھی خون کے آنسو روتا۔ لیکن انسانی جذبات کی لطیف ترین کیفیت کو الفاظ کی گرفت میں لانا اتنا ہی مشکل ہے، جتنا ڈوبتے سایوں کو زنجیروں میں بند کرنا! اور اسی لئے اس تذکرے میں غم و اندوہ کے اُس سیلِ بے پناہ کو سمیٹنا ممکن نہیں، جو صرف ۲۷ افراد سے سے وابستہ ہونے کے باوجود ۳۷ لاکھ لوگوں کا غم بن کر رہ گیا ہے۔

۷ فروری کو سرینگر سے جموں جاتے ہوئے انڈین ایرلائینز کا جو فوکر فرنڈشپ ہوائی جہاز گر کر تباہ ہو گیا۔ اس میں میرا کوئی عزیز نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود اس حادثے سے مجھے جو شدید دُکھ ہوا ہے۔ اور جسکی شدّت روز بروز کم ہونے کے بجائے بڑھتی جا رہی ہے۔ مجھے کبھی نہیں ہوا ہے۔ ہوائی جہاز کے حادثوں کی خبریں آئے دن ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے سننے میں آتی ہیں۔ ان حادثوں کے متعلق اکثر ہماری دلچسپی خبر کی حدود سے آگے نہیں بڑھتی۔ اور اگر حادثہ بہت ہی المناک ہو تو لمحہ بھر کیلئے ہم اس پر افسوس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ لیکن ۷ فروری کے حادثے نے ہم سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ مجھے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ جب کہیں کسی ملک میں کوئی ہوائی حادثہ ہوتا ہوگا تو حادثے میں ہلاک ہونے والوں کے لواحقین پر کیا گذرتی ہوگی۔ اسمیں سبھی ہمارے جانے پہچانے لوگ تھے۔ وہ جن سے ہم صرف چند دن پہلے ملے تھے۔ وہ جن کی موت کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا، وہ جنہیں ابھی نہیں مرنا چاہیئے تھا، وہ جنکی موت

سے سارے شہر کی زندگی میں ایک خلا پیدا ہوگیا ہے۔ ہم ان سبھی کو جانتے ہیں، پھر یہ مر کیوں گئے۔ ڈاکٹر حفیظ اللہ مختار صاحب، عبدالسلام فاضلی، محمد مقبول ان سب کو تو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ سبھی میرے بہترین دوست تھے، لیکن جن کو میں نہیں جانتا، وہ بھی بہت سوں کے دوست تھے۔ پھر جو کچھ مجھ پر گذری ہے، وہ اور بھی کتنے لوگوں پر گذری ہوگی۔ اور ان لوگوں پر کیا گذری ہوگی جن کے وہ لختِ جگر، سرتاج، بھائی بند اور عزیز و اقربا تھے۔ کتنی شمعیں بیک وقت گُل ہوگئیں۔ کتنے چراغ ہوا کے ایک ہی جھونکے سے بجھ گئے۔ کتنی قیمتی جانیں آن واحد میں پیوندِ خاک ہوگئیں۔ کتنے دلوں کی دھڑکنیں ایک ہی لمحے میں خاموش ہوگئیں۔ زندگی کا آبگینہ کتنا نازک، کتنا ناپائدار اور ناقابلِ اعتبار ہوتا ہے۔ یہ سب لوگ اپنے گھروں سے یہی کہہ کر نکلے تھے کہ ابھی آدھے گھنٹے میں جموں پہنچ جائیں گے، کسی نے اپنے بچوں سے یہ وعدہ کیا تھا کہ کل واپس آؤں گا، کسی نے اپنے دوست کو یہ یقین دلایا تھا کہ جموں پہنچتے ہی تمہارا کام کرالوں گا۔ کسی بیٹی نے اپنی ماں کو یہ تسلّی دی تھی کہ تم بے فکر رہنا، میں جمّوں پہنچتے ہی ٹیلیفون کرلوں گی۔ لیکن یہ کیا ہوگیا؟ کل آنے کا وعدہ کرنے والا اب کبھی نہیں آئے گا۔ آدھے گھنٹے میں جمّوں پہنچنے کا دعویٰ کرنے والے آج ایک ماہ بعد بھی جموں نہیں پہنچے ہیں۔ جمّوں پہنچتے ہی اپنے دوست کا کام کرانے والا اپنے دوست کو بالکل ہی بھول گیا۔ بیٹی کے ٹیلیفون کا انتظار کرنے والی ماں ابھی تک ٹیلی فون کے انتظار میں بیٹھی ہے۔

وقت ہر زخم کا مرہم ہے۔ اس حادثے کے زخم بھی بھر جائیں گے لیکن اتنے اچھے لوگ پیدا ہونے میں بڑا وقت لگتا ہے۔ بُرائیاں کس میں نہیں ہوتیں، مرنے والوں میں بھی بہت سی بُرائیاں ہونگی لیکن ان کی المناک موت نے ان کی ساری بُرائیاں دھو ڈالی ہیں۔ اب ان کی شخصیت کے وہی پہلو نظر میں ہیں جو ان کی موت کو ناقابلِ برداشت حد تک المناک بنا دیتے ہیں۔ ہزاروں لوگوں کو نئی زندگی عطا کرنے والا حفیظ اللہ یوں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ سیماب کی طرح بے قرار اور متحرک مختار یوں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائے گا، اس کا تصور بھی روح فرسا ہے۔ بخشی منوہر لال کا مسکراتا

ہوا باوقار چہرہ اتنی مدّت کے لئے برف کے نیچے دبا رہے گا یہ کس نے سوچا تھا۔ زمین کی پستیوں سے اُبھر کر آسمان کی بلندیوں کو چھونے والا مقبول پھر زمین ہی کو اپنا مسکن بنائے گا۔ یہ ناقابلِ یقین بات تھی۔ شرافت، نرمی اور انکسار کا مجسمہ فاضلی اپنی بہت سی ذمہ داریوں سے یوں دامن بچائے گا، اس کی کسی کو توقع نہیں تھی۔ وزیر محمد خاں جس نے اپنے لئے قبر بھی تعمیر کر رکھی تھی بغیر کسی تجہیز و تکفین کے ایک ماہ تک برف کے نیچے دبا رہے گا۔ یہ سوچتے ہوئے بھی کتنی روحانی اذیت ہوتی ہے۔ اور پھر وہ بہت سے لوگ جنہیں میں نہیں جانتا، لیکن جو اپنے گھروں کے چراغ تھے، جو کسی بہن کے بھائی، کسی باحیا بیوی کے شوہر، کسی بوڑھے باپ کی آنکھوں کا نور اور کسی بیوہ ماں کے سہارے تھے۔ یہ سب لوگ یوں مر گئے، کہ ان کی موت کا یقین کرنا مشکل ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے وہ سب لوگ زندہ ہوں، اور صرف ہماری محبّت کا امتحان لینے کے لئے چھپ گئے ہیں۔ لیکن یہ صرف طفل تسلیاں ہیں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم سے جُدا ہو گئے اور یہ حادثہ اتنا المناک ہے کہ اس پر جتنے آنسو بہائے جائیں کم ہیں!

(۸ مارچ ۱۹۶۶ء)

ناک کا سوال!

پچھلے ہفتے چراغ بیگ کی دو بار عزت افزائی ہوئی۔ یعنی اُسے ایک چھوڑ دو شادیوں میں بحیثیت براتی کے مدعو کیا گیا۔ قطع نظر اس کے کہ رات کے گیارہ اور بارہ بجے تک کھانے کے انتظار میں اس خاکسار ہیچمندان کو بڑی ہی اذیت اُٹھانی پڑی ہیں اس بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ شادی خانہ آبادی کی ان تقریبات میں شمولیت کی وجہ سے میرے تجربات کی محدود سی دنیا لامحدود ہوگئی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے مفت کی دولت لٹتی دیکھی۔ غریب کی عزت مٹتی دیکھی۔ اور عقل بیچاری پٹتی دیکھی۔ قصّہ پہلی دعوت کا یوں ہے کہ ایک امیر شہزادے کی شادی ایک رئیس گھرانے میں ہوگئی۔ یہاں تک تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ برات میں بہت سے بڑے بڑے آدمیوں کے علاوہ مجھ ناچیز کو بھی شامل کیا گیا۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا بڑے دنوں کے بعد اچھا کھانا ملے گا۔ برات ٹھیک ساڑھے نو بجے لڑکی والوں کے ہاں وارد ہوئی۔ دس بجے دسترخوان بچھا اور پھر قیامت نازل ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ لڑکی والے رئیس تو ہیں ہی، اپنی رئیسی کا مظاہرہ کرنے پر بھی تُلے ہوئے ہیں اور انہیں کسی قانونی مشیر نے یہ مشورہ دیا ہے کہ اپنی دولت کا اشتہار دینے کے لئے اس سے بہتر موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا۔ بس پھر کیا تھا۔ دسترخوان پر بارش شروع ہوگئی۔ ہر آدھے منٹ کے بعد وازہ (پیشہ ور باورچی) پلیٹوں پر یلغار کر کے صاحب خانہ کی دولت اور جہالت کی یاد تازہ کرتا، اسکی کسی کو فکر نہ تھی کہ کھانے والے یہ سب کچھ کھا سکیں گے یا نہیں، اگر فکر تھی تو یہ کہ وہ اس مظاہرے سے مرعوب ہوتے ہیں یا نہیں۔ ہر پلیٹ کے گرد چھوٹی چھوٹی پلیٹوں کی ایک نئی دنیا آباد ہوگئی جو لحظہ بہ لحظہ وسیع تر ہوتی جارہی تھی۔ ہم لاکھ چلاتے رہے کہ صاحب بس،

اب ہم سے کھایا نہ جائے گا۔ لیکن بے سود، اسرائیلی فوجوں کی طرح وازہ ہمارے اعتراض کے باوجود پیش قدمی کرتا رہا۔ اور جب میں نے اپنے گردوپیش نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ میں چاروں طرف چھوٹی چھوٹی پلیٹوں سے گھرا ہوا ہوں۔ میں مشکل سے چار، پانچ پلیٹوں سے انصاف کر پایا اور باقی سب کی سب ضیافتیں میرے خیال میں ضائع ہوگئیں۔ لیکن میزبانوں کو یقیناً مجھ سے اختلاف تھا۔ ان کے خیال میں ہر پلیٹ ان کی دولت، عظمت اور خاندانی وقار کی علامت تھی، اور اسی لئے وہ میرے احتجاج کے باوجود ان علامتوں میں اضافہ کرتے جارہے تھے۔ میری ہر صدائے احتجاج کو وہ اپنی فتح مندی اور ظفریابی کا اعتراف سمجھ کر مسکراتے رہے۔ گشتابے کی آمد تک ۴۸ سے زائد اقسام کے کھانے دسترخوان کی زینت بن چکے تھے اور یقین کیجئے کہ دسترخوان پر بکھرے ہوئے ان کھانوں میں سے 15% کھانا بالکل ضائع ہوگیا۔ میں سوچنے لگا کہ ہماری زندگی میں کتنا بڑا تضاد ہے اور ہم کتنے بڑے اخلاقی مجرم ہیں۔ اسی پڑوس میں جہاں میرے سامنے انواع واقسام کے کھانے بکھرے پڑے تھے کتنے ہی غریب دو وقت کے کھانے کے لئے ترس رہے ہوں گے۔ اسی کشمیر میں جہاں ایک خاندانی رئیس اپنے خاندانی وقار کے تحفّظ کے لئے اپنی دولت کو یوں بے دردی سے لُٹا رہا تھا۔ بہت سے لوگ اپنے پیٹ کا جہنم پالنے کے لئے چوری کرنے پر مجبور ہیں۔ میں لمحہ بھر کے لئے کمیونسٹ بن گیا اور میرے جی میں آیا کہ اس نامعقول میزبان کی ساری دولت چھین کر اسکے غریب پڑوسیوں میں بانٹ دوں۔ لیکن پاسبانِ عقل نے فوراً ہی رہنمائی کی کہ امیر کی دولت چھیننے سے غریبوں کی غربت ختم نہیں ہوگی۔ بہت سے غریبوں کو اس نظام کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنا ہوگا۔ جو ایسے امیروں کو جنم دیتا ہے اور کچھ ہی دن بعد ایک غریب نے اپنی عزّت اور وقار کی خاطر دو ہزار روپے کا قرضہ اُٹھایا تھا اور مجھے یقین ہے کہ وہ دو ہزار سال تک یہ قرضہ ادا نہ کر سکے گا۔ اسکی ساری عزّت اور خاندانی وقار ان دو ہزار روپے کے عوض بک گیا۔ جو اس نے ان کا تحفّظ کرنے کیلئے قرض لئے تھے۔ اس مسئلے کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ امیر لوگ روایات قائم کرتے ہیں اور غریبوں کے لئے ان کا نبھانا ان کی توقیر کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ لعنت ہے ایسی دنیا پر، اس معاشرے پر اور اس زندگی پر، جہاں غریبوں کو زندہ رہنے کے لئے امیروں کے بنائے ہوئے قوانین کا احترام کرنا پڑے اور ان ہی قوانین کو زندگی سمجھ کر زندہ رہنا پڑے۔

(۲۶ رجون ۱۹۶۷ء)

ہے جُرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

اسرائیل کے ہاتھوں عربوں کی شکستِ فاش سے اور کچھ ثابت ہوا ہو یا نہیں، چراغ بیگ کی 'تھیوری' بالکل صحیح ثابت ہو گئی ہے۔ اس تھیوری کے مطابق خداوند تعالیٰ رحیم و رحمٰن ہے، کریم و غفّار ہے۔ اور سب کا پروردگار ہے۔ اس کی قوت لامحدود اور اس کی رحمت بیکراں ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہلتا۔ اور اسی لئے عربوں کی شکست میں بھی خدا کی مرضی کا ہی عمل دخل ہے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ جس طرح صنعتی قرضوں کی تقسیم کے لئے محکمۂ صنعت نے کچھ قوانین اور ضابطے مرتب کئے ہیں۔ رب العالمین نے بھی اپنی امداد کے لئے کچھ قوانین اور ضابطے ضرور مقرر کئے ہوں گے۔ دنیا کی تاریخ کا مطالعہ کرنے اور عربوں کی شکست پر غور و فکر کرنے کے بعد یہ بات طے ہے کہ اللہ میاں کی امداد و اعانت کے جملہ حقوق بحقِ مسلمانانِ عالم محفوظ نہیں ہیں بلکہ وہ ان لوگوں کی امداد کرتا ہے جو اپنے آپ کو اس کے اہل ثابت کر سکیں یعنی جن میں قوتِ عمل ہو، ضبط و نظم ہو، حوصلہ ہو اور جو عاقبت اندیش ہوں۔ یہ صلاحیتیں اگر یہودیوں میں بھی ہوں، تو اللہ تعالیٰ ان کی امداد کرنے میں بخل سے کام نہ لے گا۔ کیونکہ وہ ربّ العالمین ہے۔ ربّ المسلمین نہیں۔ مسلمان اگر پانچ وقت نماز بھی ادا کریں، تیس روزے بھی رکھیں، فریضۂ حج بھی ادا کریں اور اس کے باوجود ان میں قوتِ عمل، ضبط و نظم اور عاقبت اندیشی کا فقدان ہو تو وہ یقیناً خدا کی امداد کے مستحق قرار نہیں کر پائیں گے۔ میں نہیں جانتا کہ عربوں میں کونسی ایسی کمزوریاں ہیں جن کی وجہ سے انہیں ایک حقیر سے ملک نے چار یوم کے اندر اندر حقیر بنا دیا۔ لیکن برادرانِ وطن کی توجہ اس امر کی طرف دلانا چاہتا ہوں کہ جب "غازہ" اور "صحرائے سینائی" میں عربی اور یہودی فوجیں ایک دوسرے سے

برسرپیکار تھیں۔ تو سری نگر کی شاہراہوں پر بے گناہوں اور معصوموں کا قافیہ تنگ کرنے سے بھی عربی افواج کی حوصلہ افزائی ممکن نہ ہوسکی۔ غصّے اور برہمی کے عالم میں گرجا گھروں میں آگ لگاکر "بہادری" کے مظاہروں سے بھی عرب فوجوں کو کوئی تقویت نہیں مل سکی۔ اور وہ اس کے باوجود ہار گئیں۔ اس لئے غور کرنے کا مقام ہے کہ میدانِ جنگ میں شاید خدا کی مہربانی مسلمانوں کی بجائے ان یہودیوں کو حاصل تھی جنہیں ہم راندۂ درگاہ سمجھتے آئے ہیں۔ اسی کو کہتے ہیں خدا کی خدائی۔

عربوں کی شکست کے اسباب کا مطالعہ تو خیر فائدہ مند ہوگا ہی، اسرائیل کی فتح کے اسباب جاننا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اقبال کا ایک مشہور شعر ہے ؎

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر گھڑی اپنے عمل کا حساب

مسلمان ہر گھڑی تو کیا ہر صدی بھی اپنے عمل کا حساب نہیں کرتا، اور نتیجہ یہ کہ خدائے قدوس کی مہربانیوں اور رحمتوں کے وہ لوگ سزاوار ہو رہے ہیں۔ جن کے متعلق عام عقیدہ یہ ہے کہ وہ اسکی رحمت کے حقدار کبھی ہو ہی نہیں سکتے۔ چراغ بیگ، کا خدا کتنا عظیم اور کتنا NON-ALIGNED ہے!

(۲۶، جون ۱۹۶۷ء)

قیس تصویر کے پردے میں بھی عُریاں نکلا

مجھے پروین کماری نام کی لڑکی سے بہت سی شکایات ہیں (جب تک عدالت یہ فیصلہ نہ دے کہ پروین بالغ ہے یا نابالغ، میں اسے پروین کماری ہی کہوں گا، چاہے مجھے جنگلی کہو) مثلاً یہ کہ اُسے اپنی بیوہ ماں کو تنہا چھوڑ کر غلام رسول کنٹھ کے ساتھ نہیں جانا چاہیئے تھا۔ یا یہ کہ اسلام قبول کرنے سے پہلے اُسے اسلام کا اچھی طرح مطالعہ کرنا چاہیئے تھا، جو اس نے نہیں کیا ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو میں اس لڑکی کا بے حد شکر گذار اور احسان مند بھی ہوں، کہ غیر شعوری طور پر اس نے بہت سے "ترقی پسندوں" "زاہدوں" اور "کافروں" کے چہرے سے نقاب اُلٹ دی ہے۔ دوسرے الفاظ میں پروین نے اپنے چہرے پر نقاب اوڑھ کر بہت سے گھناؤنے چہروں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ میرے حلقۂ احباب میں بہت سے ایسے ترقی پسند پنڈت دوست ہیں۔ جن کی "ترقی پسندی" کے سامنے برٹینڈرسل اور ایم۔ این۔ رائے کی روشن دماغی بھی 'رجعت پسندی' دکھائی دیتی تھی۔ ان میں سے بعض "جدلیاتی مادیت" کے اتنے بڑے مبلغ ہیں کہ ماؤزے تنگ اور کوسی جن بھی ان کے سامنے امریکی ایجنٹ معلوم ہوتے ہیں۔ حریت فکری کے عالم میں یہ لوگ کبھی کبھی اتنی بلندیوں پر پرواز کرنے لگتے کہ مجھے اپنا وجود ایک حقیر سی چیونٹی دکھائی دیتا۔ ان میں سے اکثر نے تاریخ، فلسفے، ادب اور سائنس کی اتنی کتابیں پڑھی ہیں، کہ ان سب کو جمع کر دیا جائے تو ایک مفید عام لائبریری ترتیب دی جاسکتی ہے۔ لیکن جب پرمیشوری ہندو نے نقاب پہن کر اپنے پروین اختر ہونے کا اعلان کر دیا تو میرے ترقی پسند دوستوں کی "ترقی پسندی" اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہو گئی۔ ہیگل، کانٹ، مارکس، رسل اور کرشنا مورتی کا فلسفہ شری پریم ناتھ گھاسی کی تقریروں کے مقابلے میں بالکل پھیکا اور بے جان معلوم ہونے لگا۔ سیکولرازم کا آدرش

ایک کھوکھلا تصوّر اور بھائی چارے کا تصوّر محض ایک فریب دکھائی دیا۔ ڈرائنگ روم اور کافی ہاؤس میں بیٹھ کر پرولتاری انقلاب کی باتیں کرنے والے دانشور اس طوفان میں اسطرح بہہ گئے کہ ابھی تک مجھے ان کی لاشیں بھی نہیں ملی ہیں۔ مذہب اور مذہبی اداروں کو گمراہی اور قدامت کی علامتیں قرار دینے والے یہ 'کافر' اس دوران اس حد تک مسلمان ہو گئے کہ انہیں پہچاننا مشکل ہو گیا۔ پرمیشوری نے ان کے چہروں سے ترقی پسندی اور انسان دوستی کا غازہ اُتار کر انہیں عریاں کر دیا۔ اور ہم سب کو معلوم ہو گیا کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ اور یہ بات صرف ہندو ترقی پسندوں پر ہی صادق نہیں آتی۔ اپنے مسلم ترقی پسندوں کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ اگرچہ مسلم عوام نے بالعموم اور بحیثیت مجموعی سیکولر روایات کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ لیکن مسلم دانشوروں نے اپنی مقدور کے مطابق اپنی " ترقی پسندی" کی قبا تار تار کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ میرے بعض "روشن دماغ" مسلم دوستوں کے خیال میں پروین اختر اسلام کے زندہ جاوید مذہب ہونے کی آخری مثال ہے۔ ان کے نزدیک پروین اختر پرمیشوری کا اسلامی روپ ہی نہیں، بلکہ ہندو دھرم پر اسلام کے اعلیٰ اور ارفع اصولوں کی شاندار فتح بھی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر عدالت نے پروین اختر کو نابالغ قرار دیکر اپنی ماں کے سپرد کر دیا تو مسلمانوں کا وقار اور ان کی عظمت ختم ہو جائے گی۔ انہیں حکومت سے یہ شکوہ ہے کہ اس نے ایجی ٹیشن کے دوران کشمیری پنڈتوں کی خاطر خواہ پٹائی کیوں نہیں کی۔ انہیں اس بات کی شکایت ہے کہ حکومت نے کشمیری پنڈت ایجی ٹیشن میں حصّہ لینے والے افراد کے لئے عام معافی کا اعلان کیوں کیا۔ یہ سب کچھ کہنے کے بعد وہ اس بات پر بھی بضد ہیں کہ انہیں فرقہ پرست نہ کہا جائے۔ اور ان کے سیکولر کردار پر کسی قسم کا شک نہ کیا جائے۔

(۷ر جنوری ۱۹۶۸ء)

حجِ بیت اللہ ـــــ فرض یا رسم

پچھلے سال چراغ بیگ نے اس صفحے کی معرفت علمائے دین سے حاجیانِ کرام کے متعلق ایک سوال پوچھا تھا جو ابھی تک شرمندۂ جواب نہیں ہوا ہے۔ چراغ بیگ نے یہ دریافت کیا تھا کہ یہ جو حاجی صاحبان زیارتِ بیت اللہ سے لوٹتے ہوئے ٹرانسسٹر، گھڑیاں، ٹیپ ریکارڈر، اور بعض اوقات "سونا سمگل" کرتے ہیں اور کسٹم کی ادائیگی سے بچنے کے لئے معصوم جھوٹ بولتے ہیں۔ ان کے بارے میں قرآن اور حدیث کا کیا فتویٰ ہے؟ آج چراغ بیگ علمائے دین سے نہیں (انہیں جواب دینے کی فرصت نہیں یا وہ مصلحتاً خاموش رہنا پسند کرتے ہیں) بلکہ خود عازمینِ حج سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہے۔ اور وہ اس انتظار میں رہے گا کہ دیارِ حبیب کا کوئی صاحبِ نظر پروانہ اس سوال کا جواب دیکر اُسے شکر گذار ہونے کا موقع بخشے گا۔

حج اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے آخری رُکن ہے اور جہاں تک میری محدود مذہبی معلومات کا تعلق ہے، فریضۂ حج اُس انسان پر عائد ہوتا ہے جو اس سے قبل کے چار ارکان، کلمہ، نماز، روزہ، زکوٰۃ پورا کرے۔ بالفاظِ دیگر کوئی آدمی کلمہ اور نماز پڑھے بغیر یا بغیر زکوٰۃ دئے عازمِ حج نہیں ہوسکتا، اس طرح احادیث کی روشنی میں یہ بات طے پائی ہے کہ فریضۂ حج کے لئے اس حد تک صاحبِ ثروت ہونا ضروری ہے کہ عازمِ حج پر کوئی قرضہ باقی نہ ہو، وہ اپنے اہل وعیال کی کفالت کرسکتا ہو۔ اور اپنی جائز آمدنی میں سے اخراجاتِ حج برداشت کرنے کے اہل ہو۔ آیئے اب ان مبادیات کی روشنی میں چند تنقیحات قائم کریں۔

حج کا مقصد میرے نزدیک دنیا بھر کے مسلمانوں کی ایک ایسی سالانہ کانفرنس ہے۔ جس میں دنیا بھر کے آسودہ حال اور باشعور مسلمان دیارِ حبیب میں جمع ہوکر زیارتِ بیت اللہ سے

فیضیاب ہوں اور مسلمانوں کی ترقی، اسلام کی ترویج و اشاعت، دنیائے اسلام کو درپیش مسائل کے متعلق غور و فکر کریں۔

چراغ بیگ کو ابھی تک زیارتِ بیت اللہ کی سعادت نصیب نہیں ہوئی ہے اور محدود مالی وسائل کے پیشِ نظر ابھی تک اس کی حسرت نے تمنّا کی صورت بھی اختیار نہیں کی ہے۔ اس لئے وہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ طواف کعبہ کے بعد اس قسم کی کوئی کانفرنس منعقد ہوتی ہے یا نہیں۔ قیاس غالب ہے کہ نہیں ہوتی ہے۔ میرے نزدیک اس وقت اس مسئلے کا دوسرا پہلو ہے اور وہ یہ کہ کیا زیارت بیت اللہ کو جانے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد ان لوازمات کو پورا کرتی ہے جو فریضۂ حج کے لئے بنیادی درجہ رکھتے ہیں؟ پچھلے چند سالوں سے عازمینِ حج کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور اگر ان تمام لوگوں کو جانے کی اجازت مل جائے جو فریضۂ حج کی ادائیگی کے لئے جانا چاہتے ہیں تو اس تعداد میں کئی گنا اضافہ ہو سکتا ہے۔ آپ لوگ مجھے معاف کریں گے کہ عازمینِ حج کی اس بھاری تعداد میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جنہیں حج کی اہمیت اس کے تقدس اور اس کی معنویت کا نہ کوئی علم ہے نہ اندازہ، وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ جب تین چار ہزار روپے کی رقم جمع ہو جائے رچا ہے وہ دودھ میں پانی ملا کر جمع ہوئی ہو، یا گوشت کی بلیک مارکیٹنگ سے) تو حج کی نیت باندھنا چاہیئے۔ رفتہ رفتہ حج ایک فریضے کی بجائے ایک رسم بن کر رہ گیا ہے۔ اور اسی لئے حاجیوں کی بہت بڑی تعداد نماز، روزہ اور زکوٰۃ پورا کئے بغیر حج کے لئے روانہ ہوتی ہے۔ میں بہت سے ایسے حاجی صاحبان کو جانتا ہوں جو عازم حج ہونے سے پہلے تو کیا بعد بھی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے اور پھر ان حاجیوں کے بارے میں آپ کیا کہیں گے جو مقروض ہونے کے باوجود حج بیت اللہ کے لئے جاتے ہیں۔ ایک ایسے حاجی صاحب کو بھی جانتا ہوں جنہوں نے صرف حج پر جانے کے لئے قرضہ اُٹھایا۔ پچھلے سال ایک ایسی خاتون بھی زیارتِ بیت اللہ کو تشریف لے گئیں جن کے گھر میں دو جوان بیٹیاں تقریباً تین مہینے کے لئے اکیلی رہیں۔ میں نے عازمینِ حج کے بڑے بڑے قافلوں میں اکثر عازمین کو میلے کچیلے کپڑے پہنے، روٹی کے ٹکڑوں کے لئے لڑتے جھگڑتے دیکھا ہے۔ اور میرے بعض دوستوں

نے مجھے ایسی ایسی حکایات سنائی ہیں کہ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اس مقدّس سفر اور مقصد
کو کس طرح ایک بے معنی رسم بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اور ہمارے علمار کس بے نیازی سے
اسلام کی تذلیل کا یہ عمل اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں؟ مسئلے کا ایک اور پہلو بھی
ہے اور وہ یہ کہ عازمینِ حج کی ایک خاصی تعداد ان شیر فروشوں، سبزی فروشوں، قصائیوں
اور چور بازاریوں پر مشتمل ہوتی ہے جن کی ساری زندگی بے ایمانی، استحصال، مکر وفریب کا
کھلا اشتہار ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ناجائز طریقوں اور بے ایمانی سے جمع شدہ رقم
کو حج کے مقدّس فریضے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اگر اس کا جواب نفی میں
ہے تو عازمینِ حج کو حج کی نیت کرنے سے پہلے اس بات کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ ان کا وہ
اثاثہ جس کی بنیاد پر وہ حج بیت اللہ کا ارادہ کر رہے ہیں، مسلمان ہے یا نہیں؟

(۷ر جنوری ۱۹۶۸ء)

آنا زینہ کدل سے ٹانگے پر

ایڈیٹر کی ڈائری

یہ پچھلی جمعرات کا واقعہ ہے کہ میں زینہ کدل سے ایک ٹانگے پر سوار امیرا کدل کی طرف آرہا تھا۔ تانگہ پر میرے علاوہ دو نوجوان اور ایک خاتون سوار تھی۔ فتحکدل کے قریب ٹانگے والے نے ایک اور سواری بٹھانے کیلئے تانگہ روکا، تو میں نے اعتراض کیا، ٹانگے والے نے میرے اعتراض کی پرواہ نہ کرتے ہوئے سواری کو پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ اس پر میں نے اعتراض کیا کہ پانچویں سواری کم از کم پچھلی سیٹ پر نہیں بیٹھ سکتی کیونکہ اس پر مشکل سے دو سواریوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی اور تیسری سواری کے بیٹھ جانے سے خاتون کو بڑی زحمت ہوتی۔ ٹانگہ والے نے چلاّنا شروع کر دیا کہ آپ کون ہوتے ہیں، تانگہ میرا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ ٹانگہ آپ کا ہے لیکن یہ ملک میرا ہے اور اس کا فیصلہ میں خود کروں گا۔ اس نے چلاّنا شروع کر دیا۔ تو جوابی حملے کے طور پر میں نے بھی چیخنا شروع کر دیا۔ پانچویں سواری پائدان پر سوار ہوئی۔ اور تانگہ چلنا شروع ہو گیا۔ میں نے ٹانگے والے اور سواری دونوں پر واضح کر دیا کہ میں پانچویں سواری کو پچھلی سیٹ پر نہیں بیٹھنے دوں گا۔ اس لئے سواری پائدان پر سوار جب کدل پہنچ گئی۔ جب کدل پہنچ کر میں نے چوک پر متعین سپاہی کو بلا کر اُسے سارا واقعہ سُنایا اور اُسے ہدایت کی کہ وہ ٹانگے والے کا چالان کر دے اور خود ایک دوسرے ٹانگے پر سوار گھر پہنچا۔ آپ کہیں گے کہ یہ تو بڑی معمولی سی بات ہے۔ ایسی باتیں شہر میں ایک نہیں، دس نہیں بلکہ سینکڑوں بار ہوتی رہتی ہیں۔ ایسی معمولی بات کو ایک غیر معمولی ڈائری میں جگہ دینے میں کیا تُک ہے؟ آپ کا اعتراض صحیح ہے، لیکن واقعہ بیان کرتے ہوئے

میں نے اس معمولی سی بات کا انتہائی غیر معمولی پہلو بیان نہیں کیا ہے۔ میں جس وقت ٹانگے والے سے جھگڑ رہا تھا، یا یوں کہیئے اس کی خباثت کے خلاف احتجاج کر رہا تھا تو بجائے اس کے کہ ٹانگے پر بیٹھے ہوئے دو نوجوان میری حمایت کرتے یا نہ کر سکتے، تو خاموش رہتے۔ میرے خلاف تانگے والے کا ساتھ دے رہے تھے۔ ان کے خیال میں، میں کوئی نازیبا اور نامناسب حرکت کر رہا تھا۔ اور ٹانگہ والا کوئی اہم "مذہبی رسم" ادا کر رہا تھا۔ اس لئے فتح کدل سے حبہ کدل تک مجھے نہ صرف ٹانگے والے سے لڑنا پڑا بلکہ ٹانگے میں بیٹھے ہوئے ان دو نوجوانوں سے بھی جنہیں میری ہی طرح ٹانگے والے کی من مانی اور بے ضابطگی کے خلاف احتجاج کرنا چاہیئے تھا، یہی نہیں ٹانگے والے کو قانون کی زد سے بچانے کے لئے ایک نوجوان چوک میں پہنچنے سے پہلے ہی ٹانگے پر سے اُتر گیا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ جس ملک کے نوجوانوں کا یہ کردار ہو وہ اس ملک کے مستقبل کے لئے کتنا عظیم خطرہ ہو سکتے ہیں؟ اور فتح کدل سے حبہ کدل تک جو کچھ ہوا ہے، وہ ہر روز اور ہر جگہ دُہرایا جاتا ہے۔ ہر آدمی شہر کے مجرموں کو قانون کے پنجے سے بچانے کیلئے جھوٹ بولتا ہے، دھوکہ کرتا ہے، اور فریب دیتا ہے ؏

نثار میں تیری گلیوں کے اے وطن ....

(۷ر جنوری ۱۹۶۸ء)

رن کچھ کا فیصلہ!

پہلے لوگ حکومتوں سے ڈرتے تھے اب حکومتیں لوگوں سے ڈرتی ہیں۔ اسکی تازہ مثال رن کچھ کا فیصلہ ہے۔ جو بین الاقوامی ٹریبونل نے ہند و پاک کے عوام کو سُنایا ہے۔ ہندوستان کے کہنے کے مطابق رن کچھ کا نوے فیصدی علاقہ ان کے حصّے میں آیا ہے اور اس طرح پاکستان کا یہ دعویٰ غلط ثابت ہوا ہے کہ رن کچھ ان کا ہے۔ ادھر سے پاکستانی حکّام نے دعویٰ کیا ہے کہ رن کچھ کے معاملے میں ہندوستان کی شکست ہوئی ہے اور پاکستان کی جیت۔ ان دعوؤں اور جوابی دعوؤں کی گونج میں اصلی معاملہ ٹیڑھی کھیر ہوا جاتا ہے۔ ان دونوں میں کوئی سچ کہتا ہوگا یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں جھوٹ کہہ رہے ہوں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دونوں نے متنازعہ علاقے پر دعوؤں کے مطابق یہ بازی ہاری ہو۔ بہر کیف! سچ اور جھوٹ کی تہ میں عوامی غیض و غضب کارفرما ہے۔ اور دونوں حکومتیں سچ کہتے سے ڈرتی ہیں کیونکہ ایک میں سچ کہنے کی طاقت نہیں اور دوسری اسے سہہ نہیں سکتی۔ دوسری بات جو اس فیصلے سے اخذ کی جاسکتی ہے یہ ہے کہ ہند و پاک کے مابین جتنے بھی مسائل موجود ہیں اُن کا فیصلہ اگر کسی ایک کے حق میں ہو جائے تو دوسرے ملک میں اس کا شدید ردعمل ہوسکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ابھی ہند و پاک کے لوگوں میں وہ اعتماد بحال نہیں ہوا ہے جو تقسیم سے پہلے کبھی موجود تھا۔؟

(۲۷ر فروری ۱۹۶۸ء)

کھلی چٹھی

مولانا ابوالکلام آزاد کی روح کے نام!

مولانائے محترم ! تسلیم و نیاز

اسی ہفتے یعنی ۲۲ فروری کو آپ کے انتقال پر دس سال بیت جائیں گے۔ اس ملک میں آپ ایک گم گشتہ صدا بن کر رہ گئے ہیں۔ صرف دس سال کے قلیل عرصے میں ..... لیکن میرے دل میں آپ کی یاد آئی ہے اور فیضؔ کے الفاظ میں یہ سماں ساتھ لے کے آئی ہے۔ جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے

پہلے ایک حرفِ معذرت ..... کہیں یہ آپ کی چائے نوشی کا وقت تو نہیں ... سُنا ہے کہ عالم برزخ میں اپنا ایک معیاری وقت رائج ہے .... اور چائے نوشی کے وقت تو آپ اپنی خلوت میں کسی مداخلت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مجھے اس وقت آپ کی یہ تحریر یاد آرہی ہے۔

"میں ہمیشہ صبح تین سے چار بجے کے اندر اٹھتا ہوں اور چائے کے پیہم فنجان نوسے جام صبوحی کا کام لیا کرتا ہوں۔ خواجہ شیراز کی طرح میری صدا صدائے حال بھی ہوتی ہے کہ

گر برگِ عیشِ مے طلبی ترکِ خواب کن
خورشید سے زمشرقِ ساغر طلوع کرد

یہ وقت ہمیشہ میرے اوقاتِ زندگی کا سب سے بڑا پُر کیف وقت ہوتا ہے ... یہاں کوئی آدمی نہیں ہوتا .... کسی بادہ گر نے شامپین کے صد سالہ عرقِ کہن میں بھی وہ کیف و سرور کہاں پایا ہوگا جو چائے کے اس دور میں صبحگاہی کا ایک گھونٹ میرے لئے مہیا

کرتا ہے۔"

مولانا! اس عالمِ کیف میں آپ کے درِ دولت پر دستک دینا بدتمیزی سہی، لیکن "اور بھی غم ہیں زمانے میں محبّت کے سوا"۔ اپنا روسی فنجان چندمنٹ کے لئے نیچے رکھ دیجئے۔ اور چند باتیں سُنیئے۔" ہوا یہ کہ جب آپ انتقال فرما گئے تو جواہرلال نہرو نے آپ کو ایک نورانی شمع سے تشبیہ دی اور مسٹر ڈلنگے نے کہا کہ اس دور کا عمرخیّام فوت ہوگیا ہے۔ پھر آپ کی کتاب "انڈیا ونس فریڈم" شائع ہوئی ہے۔ اور راتوں رات آپ کی پچاس سالہ زندگی اور قومی خدمات کو نگاہوں سے اوجھل کر دینے کی ایک خاموش مہم کا آغاز ہوگیا۔ ... آپ عمر بھر بیگانوں کے طعنے اور فقرے سُنتے رہے، لیکن آپ نے کبھی آہ تک نہیں کی ... مگر یہ کتاب پڑھ کر پہلی مرتبہ اندازہ ہوگیا کہ "اپنوں" کے تیر کھا کھا کر آپ کا کشادہ سینہ کس طرح داغ داغ بن چکا تھا۔ ایک طرف سے محمد علی جناح آپ کو کانگریس کا "شو بوائے" کہکر پکارتے تھے۔ لیکن آپ کی کوہ وقار شخصیت ان طعنوں سے دل برداشتہ نہ ہوتی تھی۔ دوسری طرف خود آپ کے کانگریسی رفیق آپ کو ورکنگ کمیٹی کے اندر بیٹھ کر "مسلم فرقہ پرست" کہتے تھے۔ میں نے پچھلے دنوں آپ کی لحد پر سُرخ گُلاب کا ایک پھول دیکھا تھا۔ شاید یہ گلاب اسی طعنے سے پیدا شدہ زخم کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ خیر۔ دن گذرتے گئے۔ آپ کو اس ملک کے بڑے بڑوں، اُس ملک کے نشر و اشاعت کے اداروں اور دوسرے اکابرین نے فراموش کر دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اب آپ کا مصرف کیا رہ گیا ہے؟ آپ کی برسی پر ریڈیو کشمیر کے سرینگر سٹیشن سے کشمیری میں ایک پروگرام نشر کیا جاتا ہے تاکہ کشمیری مسلمانوں کو بتایا جائے کہ ملک میں سیکولرازم کا پرچم بلند ہے — آل انڈیا ریڈیو سے آپ کا نام تک نشر نہیں ہوتا ... مجھے معلوم ہے کہ آپ زندگی میں بھی شہرت سے بے نیاز تھے۔ اب باتوں کے کیا رسیا ہوں گے ... لیکن آپ کا نام تو گاندھی اور نہرو کے ساتھ اُصولوں اور عقائد کی ایک ایسی تثلیث کا حصّہ تھا۔ جس نے برصغیر میں علیحدگی پسندی اور تنگ نظری کے خلاف ایک مضبوط قلعے کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ لیکن ٹھہریئے مولانا! یہ زیادتی صرف آپ ہی کے ساتھ نہیں ہوئی ہے۔ گاندھی اور نہرو کا بھی وہ حال ہے کہ "وہ ہم سے بھی

زیادہ خستہ، تیغِ ستم نکلے۔" گاندھی جی کی اُصول پسندی اب چوان جی مہاراج کی مصلحتوں کے سامنے کسی ایسی دوشیزہ کی طرح ہانپتی ہوئی نظر آتی ہے جس کی عصمت لوٹنے کیلئے ایک بے ہنگام سر پھرا دست دراز یاں کر رہا ہو ۔۔۔ نہرو کی بیٹی ۔۔۔ جی ہاں مولانا .... وہی اندرا جی .... ہم نصیب کے ماروں کی وزیر اعظم ہیں .... لیکن بلراج مدھوک، اٹل بہاری باجپائی، راج نرائن، گورو گولوالکر اور رہنو متھیا سے اُسی طرح ڈرتی اور کانپتی ہیں، جیسے کوئی چوہیا کسی بلّی سے خوف کھاتی ہے .... اور ہاں مولانا! پارلیمنٹ ہاؤس نا .... وہی ہماری جمہوریت کا معبد اعظم، جہاں کبھی جواہرلال چانکیہ کے اقوال اور اشوک کے اُصول دُہراتے تھے۔ اور جہاں آپ لطیف شاعری کے موتی بکھیرا کرتے تھے۔ اب ایک گالی خانہ بن کر رہ گیا ہے۔ جہاں وہی فقرے دہرائے جاتے ہیں جنہیں سُنکر بر سرِ عام کسی شریف آدمی کی نگاہیں نیچی ہو جاتی ہیں۔ ہماری حکومت اب اندرا جی کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اُن لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو بڑی سے بڑی گالی دیکر انہیں سہما دیتے ہیں۔

لیکن مولانا! ایک بات ہے جس سے آپ کی طبیعت شگفتہ ہو جائے گی۔ یعنی اُس مردِ شریف و نفیس کو جس کا نام ڈاکٹر ذاکر حسین ہے صدر جمہوریہ کے منصب پر فائز کر دیا گیا ہے۔ آپ کو جب نہرو جی نے یہ پیش کش کی تھی تو آپ نے فرمایا تھا " وہاں رکھا ہی کیا ہے" .... ایک خوبصورت مکان اور چند باغ "۔ لیکن ہمارے یہاں اب سیکولرازم زندگی کے معرکے سے لہولہان ہو کر اسی جگہ پناہ گزیں ہونے پر مجبور ہو گیا ہے اور نہ معلوم کب تک انہی سبزہ زاروں میں محبوس رہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم وہیں اسے شوکیس میں سجا کر باہر سے آنے والے اکابرین کے انتظام کے لئے مستقل طور پر رکھ دیں۔

اچھا۔ اب آپ کی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہوگی۔ خدا حافظ

(۲۷ فروری ۱۹۶۸ء)

موئے مقدّس

آج سے چار سال قبل سری نگر کے مقام پر ایک سنسنی خیز چوری ہوئی۔ موئے مقدس کو حضرت بل میں اپنی جائے پاک سے ہٹایا گیا۔ اور اس کے بعد نتیجے میں ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس طوفان کی رو میں ایک حکومت، ایک نظام اور ایک دور بہہ گئے۔ کچھ دنوں کے بعد موئے مقدّس بازیافت ہوا۔ مجرموں کو گرفتار کیا گیا۔ پارلیمنٹ میں ان مجرموں کے ناموں کا اعلان بھی ہوا لیکن اس کے بعد کیا ہوا؟ کسی کو معلوم نہیں۔ خوش قسمتی سے اس ریاست کو اب ایک قابل، محنتی اور دیانتدار انسپکٹر جنرل ملا ہے اور موئے مقدّس کی چوری کے مجرموں کا سُراغ نہ ملنا ان کی قابلیت اور اہلیت کے لئے ایک چیلنج ہے۔ کیونکہ مجرموں کے بارے میں عجیب وغریب افواہیں اُڑی ہوئی ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ پاکستان بھاگ گئے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ دراصل چینی ترکستان میں ہیں۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ صرف یہی ایک واقعہ پولیس کی نااہلیت اور نالائقی کا اتنا بڑا اشتہار ہے کہ میرے خیال میں اس تنظیم پر مزید تنقید کی ضرورت نہیں۔

اس سانحے کا ایک سیاسی پہلو بھی ہے۔ اس کی بدولت اس ریاست کی حکومت بدلی۔ اور صادق صاحب اور ان کے ساتھیوں کو برسرِاقتدار آنا نصیب ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر موئے مقدّس کی گمشدگی کا سانحہ رونما نہ ہوا ہوتا تو ابھی تک اس ریاست پر شمس الدّین صاحب کا راج ہوتا اور صادق صاحب لائن میں کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے ہوتے۔ اس لحاظ سے بھی صادق صاحب پر یہ لازم ہے کہ جس موئے مقدس کی خیرات میں انہیں اقتدارِ اعلیٰ نصیب ہوا۔ اس کے چوروں کا سُراغ لگا کر کماحقہٗ اپنا فرض ادا کریں۔

(۱۸/ اپریل ۱۹۶۸ء)

اتنی نہ بڑھا پاکئ داماں کی حکایت

آپ سے کوئی یہ کہے کہ علمائے دین نے اپنی سالانہ کانفرنس کے افتتاح کیلئے شہر کے سب سے مشہور جیب کترے کی خدمات حاصل کی تھیں، تو آپ کو ہرگز ہرگز اس بیان کی صداقت پر یقین نہیں آئے گا اور پھر اگر دوسرے دن یہی خبر اخباروں میں چھپ جائے اور خود علمائے دین اس کی تشہیر کریں تو بتائیے کہ آپ کا ردّ عمل کیا ہوگا؟ آپ حیران و پریشان ہوں گے۔ علمار کی ذہنی صحت پر سے آپ کا اعتبار اُٹھ جائے گا۔ اور آپ کو ان کے عالم ہونے پر بھی شک ہوگا۔ پچھلے دنوں اس شہر میں بالکل ایک ایسی ہی بات ہوگئی، لیکن ہمارا ضمیر اس درجہ مُردہ ہوگیا ہے کہ ہم میں سے نہ کسی نے احتجاج کیا اور نہ اظہارِ تعجب — اب یہ فریضہ بھی چراغ بیگ ہی کو انجام دینا پڑ رہا ہے۔

پچھلے دنوں ملک بھر میں جرائم کی روک تھام کا ہفتہ منایا گیا اور ریاستی پولیس نے بھی بڑی دھوم دھام سے یہ ہفتہ منانے کی رسم پوری کی۔ دلی میں وزیر داخلہ مسٹر چوان اور جموّں میں وزیرِ اعلیٰ خواجہ غلام محمد صادق نے ان تقریبات کا افتتاح کیا۔ لیکن سری نگر پولیس کے ستم ظریفوں نے ریاست کے سب سے بڑے اخلاقی، سیاسی اور سماجی مجرم شری درگا پرشاد در کو اس ہفتے کا افتتاح کرنے کے لئے منتخب کیا۔ شری درگا پرشاد در پولو گراؤنڈ میں نصب ایک خوبصورت سے شامیانے کے نیچے قانون، اخلاق، شرافت اور احترام آدمیت پر تقریر کر رہے تھے اور چراغ بیگ کو ایک مشہور انگریزی فلم کا وہ سین یاد آرہا تھا جس میں قبائلی ڈاکوؤں کا ایک سردار پادری کے لباس میں ایک بھاری اجتماع سے مخاطب ہوکر لوگوں کو خدا، یسوع مسیحؑ اور مریم کے تقدّس کی یاد دلا رہا تھا۔

فلم کے آخر میں جب پولیس غلطی سے "پادری" کے گھر چھاپہ مارتی ہے تو وہاں سے لاکھوں روپوں کی وہ جائداد برآمد ہوتی ہے جو اُس نے ڈاکے ڈال ڈال کر جمع کر لی تھی۔ درگا پرشاد در تقریر کر رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ افسانہ حقیقت سے کس درجہ قریب اور حقیقت افسانے سے کس درجہ پُراسرار ہوتی ہے۔ سرینگر کے پولو گراؤنڈ میں ایک ایسا شخص قانون، اخلاق اور شرافت کا درس دے رہا تھا، جس کی ساری زندگی دھوکے، دغا اور فریب میں گذری ہے۔ جس کے دامن پر قانون شکنی اور ناانصافیوں کے اتنے گہرے داغ ہیں کہ اگر اس ملک میں واقعی قانون اور انصاف کی عملداری ہوتی تو یہ شخص وزیر خزانہ ہونے کے بجائے کسی حوالات کی زینت ہوتا، لیکن ستم ظریفی یہ کہ جرائم کی روک تھام کا ہفتہ منانے کی تقریبات کا افتتاح بھی اسی مجرم کے ہاتھوں انجام دیا گیا۔ کون نہیں جانتا کہ درگا پرشاد در کی ساری زندگی محسن کشی، دغا بازی، بد دیانتی اور بداخلاقی کے جرائم سے بھری پڑی ہے۔ پیر غلام حسن ڈی آئی جی کشمیر نے در صاحب کا خیر مقدم کرتے ہوئے ٹھیک ہی کہا تھا کہ جرائم سے ڈی پی صاحب کا تعلق بہت پُرانا ہے۔ ۱۹۵۳ء میں سب سے پہلے درگا پرشاد در نے اپنے سب سے بڑے محسن۔ شیخ محمد عبداللہ کے خلاف سازش کر کے اُنکی پیٹھ میں چھُرا گھونپ دیا۔ اپنی اس خدمت کے عوض ڈی، پی صاحب کو بخشی غلام محمد کی قربت اور اعتماد حاصل ہو گیا۔ یہی وہ دور ہے جب۔ ڈی۔ پی۔ در نے قانون اور ضابطے کی دھجیاں اڑاتے ہوئے ہر وہ کام کیا جو قانون کی نگاہوں میں جرم اور اخلاق کی نگاہوں میں گناہ سمجھا جاتا ہے۔ یہی وہ دور ہے۔ جب ڈی۔ پی۔ در کا ہر لفظ قانون اور اسکی ہر ادا اس ریاست کا آئین تھا۔ یہی وہ دور ہے جب بخشی غلام محمد کو خدا سے زیادہ ڈی، پی در پر بھروسہ تھا۔ اور ڈی۔ پی۔ در بخشی کو اپنا خدا سمجھتا تھا۔ یہ فریب بھی بہت دیر کیلئے جاری نہ رہ سکا۔ اور ڈی۔ پی اپنے خدا کے خلاف سازشوں میں مصروف ہو گئے۔ اور جب اُسے اس بات کا احساس ہو گیا کہ بخشی اُسے اقتدار میں برابر کا شریک ماننے کے لئے تیار نہیں تو ڈی۔ پی۔ در نے "نظریاتی اختلاف" کا سہارا لیکر بغاوت کر دی۔ لیکن جلد ہی ڈی۔ پی نے اپنے بہترین ساتھیوں کو دغا دیکر پھر اقتدار کی بھیک مانگی۔ اور بخشی نے

ازراہِ ترحم کچھ ہڈیاں اس کی طرف بھی پھینک، اس کے بعد ۱۹۶۳ء تک ڈی۔پی، بخشی غلام محمد کی ہی نہیں، اس کے نائی رام ناتھ کی بھی خوشامد کرتے رہے اور پھر جب بخشی کے عروج کا ستارہ ڈوب گیا تو ڈی۔پی ایک بار پھر "مجاہدوں" کا روپ دھار کر خواجہ غلام محمد صادق کا معتمد خصوصی بن بیٹھا۔ پچھلے چار سال سے وہ اپنے اسی محسن اور رفیق کے خلاف سازشیں کرنے میں مصروف ہے۔ اور اس انتظار میں ہے کہ کب اُسے صادق صاحب کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کا موقع ملے۔ جس آدمی کا کردار اتنا گھناونا، جس کا ماضی اس قدر داغدار اور جسکی شہرت اس درجہ مشکوک ہے وہ عوام اور پولیس کو فرض شناسی، احترام قانون اور آدمیت کا درس کیا دے گا! جن لوگوں نے اس افتتاحی تقریب پر ڈی، پی صاحب کو شستہ انگریزی میں قانون کی عملداری اور اخلاق کی برتری کا قصیدہ پڑھتے سُنا، وہ جانتے ہیں کہ ڈی۔پی۔صاحب اس ریاست کے سب سے بڑے سیاسی اور اخلاقی مجرم ہیں۔ وہ خود ہی مجرم نہیں۔ مجرموں کے ایک بہت بڑے گروہ کے سردار بھی ہیں۔ اسی لئے انکی تقریر کے بعد بے اختیار یہ شعر زبان پر آگیا ؎

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

(۲۸ راپریل ۱۹۶۸ء)

قدرِ مشترک

جان کی امان پاؤں تو ایک بات پوچھنا چاہوں گا۔ اور وہ یہ کہ اس ریاست میں ہر سیاسی لیڈر کی یہ کوشش کیوں ہوتی ہے کہ کاروبارِ سیاست صرف اُسی کے عزیزوں، رشتے داروں اور بھائی بندوں تک ہی محدود رہے؟ یوں تو شیخ صاحب، بخشی صاحب اور صادق صاحب کردار، مزاج، افتادِ طبع، عادات اور اطوار سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لیکن جہاں تک عزیز و اقارب کو اپنا سیاسی جانشین مقرر کرنے کی عادت یا ادا کا تعلق ہے۔ میرے خیال میں تینوں لیڈروں میں زیادہ فرق نہیں۔ بخشی غلام محمد تو اپنی اقربا نوازی کے لئے عالمگیر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ کہ انہوں نے اپنے دورِ اقتدار میں بخشی عبدالرشید سے لیکر بخشی حمید تک ہر بخشی کو نیشنل کانفرنس کا عہدے دار بنا دیا۔ جب تک بخشی برسرِ اقتدار رہے، بخشی رشید کانفرنس کے جنرل سکریٹری بنے رہے اور یہی وجہ ہے کہ بخشی صاحب کے بعد رشید صاحب نے اپنی جگہ یہ طے کر لیا تھا کہ ریاست کی زمامِ اقتدار اُن ہی کو سونپ دی جائے گی۔ بخشی صاحب کی یہ اقربا نوازی ایک تاریخی حقیقت بن چکی ہے۔ اس لئے اس پر مزید تبصرہ بیکار ہے۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ صادق صاحب جیسے بے لوث اور بلند کردار رہنما بھی اس کمزوری پر غلبہ نہ پا سکے۔ اور انہیں بھی اپنے سیاسی کاروبار کی دیکھ بھال کے لئے اپنی ہمشیرہ محترمہ زینت بیگم کو ہی زحمت دینا پڑی۔ خدا کا شکر ہے کہ چراغ بیگ ہی کی طرح صادق صاحب کا بھی کوئی بھائی نہیں۔ ورنہ ضلع کانگریس کی صدارت سے لے کر محکمہ پریذیڈنٹ تک سبھی عہدوں پر برادرانِ صادق کا ہی قبضہ ہوتا۔

یہ رہی بات بخشی صاحب اور صادق صاحب کی، شیخ محمد عبداللہ جیسا عظیم المرتبت رہنما بھی اس الزام سے مبرا نہیں کہ پوری ریاست میں انہیں اپنے داماد خواجہ غلام محمد شاہ سے زیادہ سیاسی شعور اور رہنمایانہ اوصاف کا کوئی لیڈر نظر نہیں آیا جو محاذ رائے شماری کا جنرل سکریٹری بن سکتا تھا۔ اس طرح محاذ کی آدھی قیادت خواجہ علی شاہ کے ہی خاندان میں محصور رہ گئی اور شیخ صاحب کے بعد کون ؟ کا مسئلہ بھی طے ہوگیا۔ چراغ بیگ کو بخشی عبدالرشید، محترمہ زینت بیگم اور خواجہ غلام محمد شاہ کی اہلیت اور ان کی صلاحیتوں پر کوئی شک نہیں، کیونکہ اس ناچیز کو ان کے ساتھ کبھی کام کرنے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی ہے، لیکن وہ یہ جاننے کا ضرور خواہشمند ہے کہ ان رہنمایان کرام کی نظریں اپنے خاندان کی چار دیواری سے باہر کیوں نہیں جا سکتیں ؟ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس دور تشکیک میں اپنے عزیزوں، رشتہ داروں کے علاوہ کسی پر بھی بھروسہ کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ اس لئے ہر چھوٹا بڑا لیڈر اپنے ہی بھائی بندوں پر ہی بھروسہ کرنے کے لئے مجبور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سید میر قاسم کو سارے ضلع اننت ناگ میں اپنے بھائی سید حسین جیسا کوئی باشعور کارکن نظر نہیں آیا جو راجیہ سبھا میں کشمیر کی نمائندگی کر سکتا تھا۔ شری ڈی۔ پی۔ در کو اپنے سمدھی لالہ تیرتھ رام کو پارلیمنٹ میں بھجوائے بغیر چین نہیں آیا اور خواجہ شمس الدین اپنے چھوٹے بھائی کو ایم۔ ایل۔ سی بنانے کی تگ و دو کر رہے ہیں۔

(۲۸ر اپریل ۱۹۶۸ء)

کتنی بُلندی کتنی پستی

اس ہفتے سری نگر میں دنیا بھر کے ٹریول ایجنٹوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جسمیں دنیائے سیاحت کے بڑے بڑے شہسواروں کے علاوہ ایئر انڈیا اور بی، او، اے رسی کے چیئرمین بھی شریک ہوئے۔ کانفرنس کا افتتاح سیاحت اور شہری ہوابازی کے مرکزی وزیر ڈاکٹر کرن سنگھ نے کیا۔ اخباری نمائندے کی حیثیت سے چراغ بیگ کو اس کانفرنس کی کئی نشستوں میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ اور اب جبکہ یہ کانفرنس ختم ہوگئی، چراغ بیگ یہ سوچ رہا ہے کہ چار دن تک یہ لوگ کس دنیا کی باتیں کرتے رہے۔ کانفرنس میں سیاحوں کو زیادہ سے زیادہ سہولیات دینے، ہوائی سفر کی دقتوں کو دور کرنے، کرائے میں کمی کے سوال پر غور کرنے اور ہوائی اڈوں پر شاندار عمارت تعمیر کرنے پر غور ہوتا رہا، بعض مندوبین نے جمبو جیٹ سے وابستہ مسائل اور عالی شان ہوٹلوں کی کمی کی طرف توجہ دلائی۔ کئی مندوب نے پاسپورٹ اور ویزا کی دقتوں کو ختم کرنے کا سجھاؤ پیش کیا۔ ایک صاحب نے ہوائی جہازوں میں شراب خانوں کی عدم موجودگی پر افسوس کا اظہار کیا۔ اور دوسرے صاحب نے پیش گوئی کی کہ عنقریب ہی ہوائی جہازوں میں نائٹ کلبوں کا انتظام کیا جائے گا۔ میں یہ ساری بحث سُن رہا تھا۔ یہ لوگ کہاں رہتے ہیں ؟ اور کیوں یہاں آئے ہیں ؟ ان کانفرنسوں کا، اس ساری بحث کا ہم سے، ہماری زندگی سے کیا تعلق ہے ؟ ہم سائیکلوں اور پھٹیچر بسوں میں بھیڑ، بکریوں کی طرح سفر کرنے والوں کو اس سے کیا دلچسپی کہ ہوائی جہازوں میں شراب اور نائٹ کلب کی سہولیات بہم ہوتی ہیں یا نہیں۔ ہم کو اس سے کیا غرض کہ ہوائی اڈوں کی عمارات

ایئرکنڈیشنڈ ہیں یا نہیں ؛ ہم کو اس سے کیا مطلب ہے کہ فرانس، جرمنی، لندن، نیویارک یا پیرس سے آنے والے سیّاحوں کے لئے عالیشان ہوٹلوں میں عیّاشی کے سارے ساز و سامان مہیّا ہیں یا نہیں ؟ ہمیں تو دو وقت کی روٹی مل جائے تو ہم اپنے آپ کو دُنیا کے خوش قسمت ترین لوگوں میں شمار کرنے لگ جائیں۔ ہمیں غمِ روزگار سے اتنی فرصت کہاں کہ ہم اپنی اندھیری کوٹھریوں سے باہر آکر جہاں بینی شروع کریں۔ ہمارے اور ہمارے بال بچّوں کے لئے اتوار کو نشاط اور شالیمار کی سیر ہی عیاشی کی وہ منزل ہے جس سے آگے ہمارے تصوّر کے پَر جلتے ہیں۔ کانفرنس میں شرکت کے بعد ہمیں ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ہم ابھی تک پُرانے پتھر کے زمانے میں رہ رہے ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ خدا کی بنائی ہوئی اس دنیا میں کتنی بلندی اور کتنی پستی ہے۔

(۲۸ اپریل ۱۹۶۸ ء)

تقابلی مطالعہ — استدلال قاسمی

ابھی پچھلے دنوں حکومت ہند کے ایک بہت بڑے افسر سری نگر تشریف لائے تھے۔ سری نگر میں اپنے چند روزہ قیام کے دوران وہ بڑے بڑے وزیروں اور لیڈروں سے ملے۔ اور کشمیر کی موجودہ سیاسی فضا کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ روانگی سے پہلے انہوں نے نہ معلوم کس کے ایماء پر چراغ بیگ سے بھی ملاقات کی۔ اور ملاقات کے دوران کشمیر کی موجودہ صورتِ حال پر تبادلہ خیال ہوا۔ بڑے افسر صاحب ایک اچھّے ممتحن کی طرح سوال پر سوال کرتے گئے اور ناچیز چراغ بیگ حتی الامکان جوابات دینے کی کوشش کرتا رہا۔ گفتگو کے تقریباً آخر میں بڑے افسر نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ ایک بھرپور سوال کر ڈالا۔

"بیگ صاحب آپ کے نزدیک کشمیر کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟"

"سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس ریاست میں پچھلے بیس برسوں سے کوئی نمائندہ حکومت قائم نہیں ہوسکی ہے۔ اور ہندوستانی جمہوریت سے لوگوں کا اعتقاد اُٹھ گیا ہے۔ اِس اعتقاد کو بحال کرنا سب سے اہم مسئلہ ہے۔" میں نے جواب دیا۔ میرے اس جواب سے ایک نئی بحث شروع ہوئی اور بڑے افسر صاحب نے مجھے الیکشن کمیشن کی 'غیر جانبداری' اس کی شہرت اور اہلیت کے افسانے سُنائے۔ چراغ بیگ نے افسانوں کے مقابلے میں تلخ حقائق پیش کئے اور جب حقائق کی گرمی سے افسانے پگھلنے لگے، تو افسر صاحب نے ایک اور پینترا بدلا، کہنے لگے

"مگر یہ تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ صادق صاحب کی سرکردگی میں منعقد ہونے والے انتخابات یقیناً بخشی غلام محمد اور شیخ عبداللہ کے دور میں منعقد شدہ انتخابات سے زیادہ

آزادانہ اور ایماندارانہ تھے۔" مجھے ایسا محسوس ہوا کہ افسر صاحب ابھی ابھی سیّد میر قاسم (صدر پردیش کانگریس) کے دربار سے اُٹھ کر آئے ہیں۔ کیونکہ یہ خالص قاسمی استدلال تھا۔ اور قاسم صاحب ابھی تک پانچ ہزار چارسو بہتر مرتبہ یہ دلیل دُہرا چکے ہیں۔

"آپ قاسم صاحب سے کب ملے تھے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"میں آج صبح ہی ملا تھا، مگر آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟" بڑے افسر نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ تقابلی مطالعے والی دلیل قاسم صاحب ہی کی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"مگر اس میں بُرائی کیا ہے۔ یہ تو کافی وزن دار دلیل ہے۔" بڑے افسر نے کہا۔

"جی ہاں وزن دار بہت ہے، مگر دلیل نہیں ہے یہی اس میں بُرائی ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ اپنی بات کی وضاحت کریں تو مجھے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔" بھاری بھرکم افسر نے مجھ سے کہا اور اس کے بعد میں نے افسر صاحب سے جو کچھ کہا، وہ آپ بھی سُن لیجیئے!

شیخ صاحب نے اپنے دور میں انتخابات نہیں کروائے، 75 افراد کا انتخاب کیا۔ میں کہتا ہوں غلط کیا۔ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ آپ بھی اور سید میر قاسم صاحب بھی کہتے ہیں کہ یہ عوام کا انتخاب نہیں تھا، ایک فرد کا انتخاب تھا۔ کیونکہ جب آپ صادق صاحب کے دور میں کئے گئے انتخابات کو شیخ صاحب کے انتخابات سے زیادہ آزادانہ اور ایماندارانہ کہتے ہیں۔ تو اس کے صرف یہ معنی ہوئے ہیں کہ وہ غیر جانبدارانہ اور آزادانہ انتخاب نہیں تھے۔ اس کے بعد آپ یہ دلیل دیتے ہیں کہ بخشی کے انتخابات شیخ کے دور میں کئے گئے انتخابات کے مقابلے میں زیادہ آزادانہ اور ایماندارانہ تھے۔ ایسا کہہ کر آپ شیخ صاحب کے الزامات کا جواب دے سکتے ہیں۔ ان کا مُنہ بند کر سکتے ہیں اور آپ ایسا ہی کر رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ایسا کرتے ہوئے آپ کا اپنا کیس بگڑ جاتا ہے۔ اب صادق صاحب یہ کہتے ہیں کہ ان کے دور میں کئے گئے انتخابات بخشی کے مقابلے میں زیادہ آزادانہ، غیر جانبدارانہ اور ایماندارانہ تھے۔ اس طرح بخشی کے لگائے گئے الزامات کا مسکت جواب ملتا ہے۔ اس کا مُنہ بند ہو جاتا ہے۔ اور آپ شیخ اور بخشی دونوں کے خلاف کچھ پوائنٹس جیت جاتے ہیں۔

لیکن اس تقابلی مطالعے سے چراغ بیگ کا مسئلہ کیسے حل ہو جاتا ہے۔ میں نہ شیخ ہوں اور نہ بخشی، میں ان دونوں میں سے کسی کا پیروکار یا پرستار بھی نہیں۔ ایک کی زیادہ بے ایمانی، میرے لئے کسی کی کم بے ایمانی کا جواز کیوں کر سکتی ہے؟ میں ایک عام کشمیری ہوں۔ جو صرف یہ جانتا ہے کہ پچھلے بیس برسوں میں یہاں کے لوگوں کے ساتھ انتخابات کے نام پر فراڈ ہوا ہے۔ دھوکہ ہوا ہے اور بے ایمانی ہوئی ہے۔ میرے لئے یہ بات کس طرح وجہ تسکین ہو سکتی ہے کہ صادق نے شیخ اور بخشی کے مقابلے میں کم بے ایمانی کی ہے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ صادق کی حکومت ایک ڈپٹی کمشنر کے ہاتھ کی صفائی کا نتیجہ ہے اور بس۔ قاسمی استدلال سے میرا یہ دعویٰ زیادہ مستحکم بن جاتا ہے۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۸ء تک جمہوریت کے نام پر کشمیری عوام کے ساتھ ایک بے رحمانہ مذاق ہوتا رہا ہے۔

میرے اس جواب سے بڑے افسر صاحب مطمئن ہو گئے یا نہیں۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا، میں صرف یہ جانتا ہوں کہ اس کے بعد انہوں نے مجھ سے کوئی سوال نہیں پوچھا۔

(۱۸ر مئی ۱۹۶۸ء)

ہوجانا پیر صاحب کو میر صاحب سے عشق

لیجیے نیشنل کانفرنس کے جنرل سکریٹری اور لیجسلیچر پارٹی کے لیڈر پیر محمد یحییٰ صدّیقی بھی گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ پیر صاحب کچھ عرصے سے بیمار تھے۔ مایوس اور اداس نظر آتے تھے۔ چہرے سے نقاہت اور آنکھوں سے تھکن کے آثار ظاہر تھے۔ کبھی کبھی دور خلاؤں میں گھورتے رہتے۔ صادق صاحب یا سیّد میر قاسم کو دیکھتے ہی اپنی نظریں جُھکا لیتے۔ اسمبلی اجلاس کے دوران تقریر کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ حزبِ مخالف کے لیڈر نہیں بلکہ خالق میڈ کانگریسی ممبر ہیں۔ غرض بیماری کی وہ ساری علامتیں موجود تھیں، جنہیں دیکھ کر ان کے آئندہ رویے کے متعلق پیشین گوئی کی جا سکتی تھی اور انہی علامتوں کو دیکھ کر اس اخبار نے آج سے چھ ماہ پہلے یہ دعویٰ کیا تھا کہ پیر محمد یحییٰ صدّیقی رفتنی ہیں۔ اُس وقت موجودہ نیشنل کانفرنس کے خالق اور مالک بخشی غلام محمد نے "مدیر آئینہ" پر یہ الزام عائد کیا تھا کہ وہ اس قسم کی خبریں چھاپ کر نیشنل کانفرنس میں انتشار پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اور آج چھ ماہ بعد بخشی صاحب نے پیر یحییٰ کو بہ یک بینی و دو گوش اپنی جماعت سے خارج کر کے اپنی لاج بچا لی ہے۔ کیونکہ بخشی صاحب اخراج میں جلدی نہ کرتے تو پیر صاحب مستعفی ہو کر چلے جاتے۔ پیر صاحب کا کہنا ہے کہ ان کو ڈاکٹروں نے آب و ہوا تبدیل کرنے کا مشورہ دیا تھا اور ڈاکٹروں کا یہ خیال ہے کہ پیر صاحب کسی کے عشق میں گرفتار تھے۔ دونوں ہی باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں۔ نیشنل کانفرنس کی صحراؤں میں چلتے چلتے پیر صاحب کے پاؤں چھلنی ہو گئے تھے۔ انہیں پیدل چلنے کی عادت نہیں۔ اس لئے چلتے چلتے ان کا دم پھولنے لگتا تھا۔ انہیں صبح سے شام تک یہی فکر لگا رہتا کہ وہ کانفرنس کے صحراؤں کو چھوڑ کر کانگریس

کے نخلستانوں میں کیسے پہنچ جائیں۔ ادھر کانگریسی نیتا سیّد میر قاسم نے بھی اپنی مسکراہٹوں کا جال بچھا رکھا تھا۔ پیر صاحب جونہی نگاہ اُٹھا کر دیکھتے، قاسم صاحب مسکرا کر کہتے "آتے کیوں نہیں ہو؟ زندگی بڑے آرام سے گذرے گی، وہاں کیا رکھا ہے۔" رفتہ رفتہ پیر صاحب کو میر صاحب سے عشق ہو گیا اور بہت دنوں سے شہر بھر میں اس عشق کا چرچا ہو رہا تھا۔ بخشی صاحب نے پہلے سُنی ان سُنی کر دی۔ اب انہوں نے پیر کو گھر سے نکال دیا ہے اور چراغ بیگ کو شاد عارفی کا یہ شعر یاد آگیا ہے ؎

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

پیر صاحب نے ابھی تک کانگریس میں شامل ہونے کا اعلان نہیں کیا ہے، لیکن بالآخر یہ جنازہ کانگریسی قبرستان میں ہی دفن ہوگا۔ یہ ریاستی اسمبلی میں اغوا کی دوسری واردات ہے۔ اس سے پہلے کرگل سے منتخب ہونے والے آزاد ممبر علی محمد کاچو کو اغوا کر لیا گیا تھا۔ دیکھئے یہ سلسلہ کہاں جا کر رُکتا ہے۔ کیونکہ ایک اطلاع کے مطابق کانگریسی اغوا باز ان دنوں آزاد ممبر علی محمد نایک کو ورغلانے میں مصروف ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک دن حزب مخالف کے بینچوں پر صرف شمیم احمد شمیم ہی نظر آئیں۔

(۱۵ر جون ۱۹۶۸ء)

طالب علموں کی وکالت

انجنیرنگ کالج کی حالیہ گڑبڑ کے دوران شیخ صاحب نے جو تعمیری رول ادا کیا اسکی تعریف ان کے سیاسی حریفوں نے بھی کی ہے۔ وزیر اعلیٰ خواجہ غلام محمد صادق اور پر دیش کانگریس کے صدر سیّد میر قاسم بھی اس بات کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے کہ شیخ صاحب نے غیر معمولی جرأت اور تدبر کا ثبوت دیکر صورت حال کو خراب ہونے سے بچا لیا لیکن ادھر کچھ دنوں سے شیخ صاحب کی تقریروں اور ان کے بیانات میں ایک عجیب طرح کا تضاد نظر آتا ہے مثلاً وہ اس بات کے حق میں ہیں کہ فسادیوں کو سخت سے سخت سزا ملنا چاہیئے اور اس واقعہ کی پوری چھان بین ہونی چاہیئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ طالب علموں کی گرفتاری کے خلاف ہیں۔ چند دن ہوئے معزز شہریوں کی ایک میٹنگ میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ لڑکوں کو گرفتار کرنے سے کیا فائدہ ہوگا۔ اصلی مجرم تو وہ استاد ہیں، جو اس گڑبڑ کو قبل از وقت نہ روک سکے۔ پرسوں شاہی مسجد میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے یہ بات پھر دُہرائی ہے۔ اُنہوں نے کہا ہے کہ "لڑکوں کو بلا وجہ گرفتار کرنا کیا مقصد ہے۔ اس سے ان کے والدین پریشان ہو رہے ہیں، یہ ٹھیک نہیں۔ اسطرح سے یہاں کے حالات کو خراب کیا جا رہا ہے۔ بے گناہ طلبا کی گرفتاری سے تشویس پھیلی ہے۔ جو فساد کرتے یا کراتے ہیں اور تنخواہ حاصل کرتے ہیں وہ آسانی سے پھرتے ہیں اور ان کو ابھی تک نہیں پکڑا گیا"۔ چراغ بیگ کے لئے شیخ صاحب کی یہ منطق ناقابلِ فہم ہے۔ فساد کس نے کرایا ہے؟ یہ تحقیق طلب معاملہ ہے، اس کی ضرور تحقیقات ہونا چاہیئے لیکن ایک بات تو بالکل واضح ہے کہ یہ فساد انجنیرنگ کالج کے طالب علموں نے ہی

کیا۔ اُنہوں نے ہی چھُرے گھونپے، آگ لگائی، پتھراؤ کیا اور اپنے ہم جماعتوں کا سامان لوٹ لیا۔ ظاہر ہے کہ وہ قانون کی نگاہ میں مجرم ہیں اور ان کی دار و گیر بہت ضروری ہے۔ شیخ صاحب کا یہ کہنا کہ بے گناہوں کو گرفتار کیا جا رہا ہے قبل از وقت ہے، کوئی حکومت اپنے اس حق سے دست بردار نہیں ہو سکتی کہ جرم کی تحقیقات اور مجرم کو سزا دینے کے لئے ہر اس شخص سے مواخذہ کرے، جس پر جرم کے ارتکاب یا اعانت کا شبہ ہو۔ درجنوں طالب علموں نے کھُلے بندوں آگ لگائی ہے، چھُرے گھونپے ہیں، پتھراؤ کیا ہے۔ اب اگر ان کی گرفتاری سے ان کے والدین پریشان ہیں تو اس کا کیا علاج؟ شیخ صاحب کو غیر شعوری طور پر مجرموں کو قانون کی زد سے بچانے کا ذریعہ نہیں بننا چاہیئے۔ ابھی یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ مجرم کون ہے اور بے گناہ کون۔

(۱۵ر جون ۱۹۶۸ء)

تجدید عہد

"آئینہ" اپنی اشاعت کے چار سال مکمل کر کے نئی اُمنگوں، نئے ارادوں اور نئے حوصلوں کے ساتھ زندگی کی پانچویں منزل میں قدم رکھ رہا ہے۔ آج سے چار سال قبل جس بے سروسامانی کے ساتھ ایک غیر یقینی ماحول میں "آئینہ" کا اجراء ہوا تھا، اس کے پیشِ نظر خود مجھے بھی اس بات کا یقین نہ تھا کہ یہ اخبار چار سال تک زندہ رہے گا لیکن آج چار سال بعد نہ صرف "آئینہ" زندہ ہے بلکہ وہ اقدار بھی زندہ ہیں جن کو سامنے رکھ کر میرے "آئینہ" نے اپنی زندگی کا سفر شروع کیا تھا۔ اور یہ بات میرے لئے باعثِ اطمینان ہونے کے ساتھ ساتھ باعثِ فخر بھی ہے۔ اس دور میں جب کہ اقتدار کو اقدار سے زیادہ احترام اور زر کو ضمیر سے زیادہ اہمیت حاصل ہے "آئینہ" کا کچھ صحت مند قدروں کو اپنے سینے سے لگائے رکھنا میری مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کا ثبوت بھی ہے اور اُردو صحافت کے لئے ایک نیک شگون بھی! کیونکہ میرے نزدیک ایک اچھا اخبار صرف اپنے مدیر کی ذات کا ہی اظہار نہیں ہوتا، اُس زبان کا اشتہار بھی ہوتا ہے جس میں وہ شائع ہوتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ "آئینہ" نے اپنی مختصر سی زندگی میں ایک بہت ہی حقیر پیمانے پر اُردو صحافت کی لُٹتی ہوئی آبرو کو کسی حد تک بچانے کا فریضہ انجام دیا ہے اور میرے لئے "آئینہ" کے سیاسی اور صحافتی کردار سے زیادہ اس کی زندگی کا یہی پہلو زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

"آئینہ" کا اجراء کسی تجارتی مقصد کے لئے نہیں ہوا تھا اور میں نے کبھی بھولے سے بھی یہ خیال اپنے دل میں نہیں آنے دیا ہے کہ میں اسے اپنی آمدن کا تجارت کا ذریعہ بناؤں، کیونکہ

میرے خیال میں صحافت اور تجارت زیادہ دور تک ایک دوسرے کے ساتھ نہیں جا سکتے۔ اور جو لوگ اپنی تجارتی کامیابیوں کو اپنا صحافتی کارنامہ قرار دے کر اس فریب میں مبتلا ہیں کہ وہ صحافت کی خدمت کر رہے ہیں وہ ایک بہت بڑی خود فریبی کا شکار ہیں۔ اعلیٰ صحافت اعلیٰ قدروں کی ترجمان ہوتی ہے اور اقدار کی ترجمانی کا فرض وہی شخص انجام دے سکتا ہے جس کی آنکھیں اقدار اور مال و زر کی چکا چوندھ سے خیرہ نہ ہوں۔ میں نے حتی الامکان اپنے ذہن اور ضمیر کو ان آلائشوں سے پاک رکھنے کی کوشش کی ہے اور اسی لئے بڑے اعتماد کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ "آئینہ" تب تک زندہ رہے گا جب تک کہ زندگی کی اعلیٰ، صالح اور جمہوری اقدار پر میرا ایمان قائم ہے!

پچھلے ۴ سال بالعموم اور گذشتہ دو سال بالخصوص میرے لئے اور "آئینہ" کے لئے غیر معمولی کش مکش اور آزمائش کا درجہ رکھتے ہیں۔ ریاستی اسمبلی کا ممبر منتخب ہونے کے بعد سے میں اپنی ساری توجہ "آئینہ" کو نہیں دے سکا اور نتیجہ یہ نکلا کہ "آئینہ" کی اشاعت میں کچھ بے قاعدگی سی پیدا ہو گئی۔ اُدھر عملی سیاست کے تقاضے روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں اور میری سرگرمیوں کا دائرہ پھیلتا جا رہا ہے۔ خود زندہ رہنے اور "آئینہ" کو زندہ رکھنے کے لئے چار پیسے کمانا بھی ضروری ہیں، ان حالات میں، میں چاہوں بھی تو "آئینہ" کو اپنا سارا وقت اور اپنی تمام تر توجہ نہیں دے سکتا۔ اس لئے بارہا میں نے "آئینہ" کو بند کر کے صرف اپنی عاقبت سنوارنے کا ارادہ کیا۔ لیکن ہر بار ایک نامعلوم جذبے نے اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ "آئینہ" نے غیر ارادی طور پر اپنی ایک مخلوق تیار کر دی ہے۔ ریاست کے کونے کونے سے اس اخبار کے پڑھنے والوں کی ایک بھاری تعداد موجود ہے اور اس تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ان لوگوں کے لئے "آئینہ" ایک نئی صبح، ایک نئی امید اور ایک نئے افق کا درجہ رکھتا ہے اور "آئینہ" کے ساتھ ان کی ذہنی وابستگی اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ ان کے لئے ایک ہفتے کی تاخیر بھی ناقابل برداشت ہے! اور وہ اسے ایک روزنامے کی شکل میں دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ ایک حقیر سے اندازے کے مطابق ہر ہفتے ۲۵ ہزار سے میں سے صرف ۵ ہزار ہی پڑھنے والے ایسے ہوں جو اس ذہنی اور فکری تحریک سے متاثر ہوتے ہوں، جو

"آئینہ" کے اجرار کی محرک اور اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ تو میں یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ "آئینہ" ایک ایسی اہم ضرورت پوری کر رہا ہے کہ اُسے ہر قیمت پر جاری رہنا چاہیئے۔ یہی احساس آئینہ کو ہر حال میں اور ہر قیمت پر زندہ رکھنے کے لئے مجھے اُکساتا ہے! اور میں بہت سی مشکلات کے باوجود یہ شمع روشن کئے ہوئے ہوں! جہاں تک "آئینہ" کو روزنامہ بنانے کا سوال ہے، باوجود اس کے کہ اکثر "آئینہ" نوازوں نے اسے روزنامہ بنانے کا مشورہ دیا ہے، میں اسے فی الحال روزنامہ بنانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ ایک اس لئے کہ اچھے روزنامے کے لئے بہت سے پیسے درکار ہیں جو میرے پاس نہیں ہیں؛ دوسرا اس لئے کہ ہفتہ وار اخبار بقول آل احمد سرور "خبر کا نہیں، نظر کا اخبار ہوتا ہے۔" اور ہماری آج کی دنیا میں خبر کی نہیں، نظر کی کمی ہے۔

"آئینہ" کی چوتھی سالگرہ کے موقع پر میں اپنے قارئین کو ایک بار پھر اس بات کا یقین دلانا چاہوں گا کہ "آئینہ" نے ظلم، تشدد، بے انصافی، آمریت اور فرقہ پرستی کے خلاف جو جنگ شروع کی ہے وہ تب تک جاری رہے گی جب تک کہ میرے ہاتھ سلامت ہیں اور میری زندگی کا زیر و بم قائم ہے۔ "آئینہ" کے اجرار پر میرے استاد محترم آل احمد سرور نے میرے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ:

"آپ نے صحافت کا راستہ چُن لیا ہے، شاید یہ شعر آپ ہی کے لئے کہا گیا تھا ؎

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانئ صحرا نوشتہ ایم

سرور صاحب نے صرف میرے جذبات کی ہی ترجمانی نہیں کی تھی، میری منزل بھی معیّن کر دی تھی اور میں نے حتی الامکان اس راستے پر چلنے کی کوشش کی ہے۔ میں اس میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا فیصلہ آپ خود کریں گے!

یہ شاید محض اتفاق ہو لیکن بڑا ہی حسین اور معنی خیز انتخاب ہے کہ "آئینہ" کی سالگرہ آج ۱۲ر جولائی کو منائی جا رہی ہے۔ آج سے ٹھیک ۳۷ سال قبل آج ہی کی رات نے اس صبح کی پرورش کی تھی جس نے کشمیر کو اپنی غلامی اور ذلّت کا احساس دلا کر بغاوت

کا سبق دیا تھا اور میرے لئے یہ امر موجب مسرّت ہی نہیں، باعثِ صد افتخار بھی ہے کہ آج کی اس تقریب پر وہ باغی سکول ماسٹر بھی موجود ہے جس کی آواز پر کشمیر کے حریّت پسند جوانوں نے اپنا گرم لہو نچھاور کر کے تحریکِ حریّتِ کشمیر کو ایک فیصلہ کن سمت عطا کی تھی!

میں سمجھتا ہوں کہ "آئینہ" میرے پاس ان ہی شہدا کی امانت ہے جنہوں نے میرے لئے ایک شاندار مستقبل تعمیر کرنے کے لئے اپنی جان قربان کی۔

(۱۲ر جولائی ۱۹۶۸ء)

کشمیر کا جغرافیہ

پطرس بخاری سے معذرت کے ساتھ

تمہید: کشمیر کا جغرافیہ بغیر کسی تمہید کے شروع ہوتا ہے اور بغیر کسی نتیجے کے ختم ہوتا ہے۔ اس کے متعلق ابھی تک ماہرینِ اراضی و ریاضی یہ فیصلہ نہیں کر پائے ہیں کہ یہ ایک ریاست ہے یا ایک ملک؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تاریخ کے ابتدائی دور میں یہ خطۂ ارضی نہ ریاست تھی اور نہ ملک، ایک بڑا سا تالاب تھا۔ مچھلیوں نے اس تالاب کا پانی پی پی کر اسے خشک کر دیا۔ اور اس طرح کشمیر کی ریاست وجود میں آگئی، جو بعد میں آب و ہوا کے بدلتے ہوئے اثرات سے ایک ملک بن گئی۔ بہر کیف کشمیر ایک ملک ہے یا ایک ریاست؟ اس سوال کا تعلق کشمیر کے جغرافیہ سے زیادہ اس کی تاریخ سے ہے۔ جہاں تک کشمیر کے جغرافیہ کا تعلق ہے اس کے بارے میں یہ عرض کر دینا کافی ہوگا، کہ یہاں کا جغرافیہ، یہاں کے موسموں کی طرح صبح و شام بدلتا رہتا ہے اور معلوم نہیں کہ اس مضمون کے آخر تک اس کا وہی جغرافیہ رہے گا یا نہیں جو مضمون شروع کرتے وقت تھا۔

محل وقوع: کشمیر کا محل وقوع بہت بے محل ہے۔ یہ خود تو ہندوستان اور پاکستان میں واقع ہے لیکن اس کے ایک حصّے میں چین بھی آباد ہے۔ یہ خطِ استوا سے بہت دور، مگر جنگ بندی لائن کے بہت قریب ہے۔ اس کے بیچوں بیچ ایک دریا بہتا ہے جو عمارتی لکڑی چرانے کے کام آتا ہے۔ جہلم نام کا یہ دریا بغیر کسی پاسپورٹ یا ویزا کے جنگ بندی

لائن عبور کر کے ہندوستان اور پاکستان دونوں کا مذاق اُڑاتا رہتا ہے۔ یہ دریا کوڑا کرکٹ ڈالنے، کشتیاں چلانے اور خودکشی کرنے کے کام آتا ہے۔ اس کے سینے پر ہانجی لوگ اور اس کے کناروں پر امیر و غریب دونوں طرح کے لوگ آباد ہیں۔ اس پر ابھی تک ۹ پُل بن چکے ہیں اور ابھی ۹ پُل بننے کی مزید گنجائش موجود ہے۔ کشمیر تک پہنچنے کا راستہ بہت مشکل ہے، لیکن اتنا مشکل بھی نہیں کہ آدمی پہنچ ہی نہ پائے۔ اگر آپ کے پاس کافی پیسہ ہے تو ہوائی جہاز سے آئیے اگر کم پیسہ ہے، تب بھی ہوائی جہاز سے ہی آئیے۔ کیونکہ ہوائی جہاز اور بس کے سفر میں پیسے کا نہیں وقت ہی کا فرق رہتا ہے۔

حدود اربعہ: کشمیر کا حدودِ اربعہ بھی اکثر بدلتا رہتا ہے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہو پایا ہے کہ اس کے حدود اربعہ کا حتمی تعیّن ہو چکا ہے یا نہیں۔ بعض لوگ برابر یہ ضد کر رہے ہیں کہ اس کا حدودِ اربعہ ابھی طے ہونا باقی ہے۔ اصل بات کیا ہے؟ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ کشمیر کے حدود اربعہ کے ساتھ چونکہ بہت سے ممالک کا حدود اربعہ وابستہ ہے، اس لئے اس بات کا اندیشہ ہے کہ اِس کا حدود اربعہ متعین کرنے میں ابھی کافی دیر لگے گی۔

فی الحال یہ خطۂ ارضی چاروں طرف بڑے بڑے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ جنوب میں کوہ اندرا گاندھی، مشرق میں دیوارِ ماؤسی تنگ، شمال میں جن کوسی، مغرب میں ایوب خان نامی پہلوان پائے جاتے ہیں۔

یہ پہاڑ کبھی کبھی اپنی جگہ سے ہل کر ایک دوسرے سے ٹکرا کر گھن گرج کی آواز پیدا کرتے ہیں۔ اِس کے مشرق میں جمّوں نام کا ایک سطحِ مرتفع بھی واقع ہے جسے کچھ لوگ اپنی جگہ سے ہٹا کر ہماچل پردیش میں لے جانا چاہتے ہیں، لیکن آب و ہوا کے شدید اختلافات کی بنا پر شاید یہ ممکن نہ ہو۔ اسی لئے کچھ نوجوان جموں کی آب و ہوا تبدیل کر کے اسے کشمیر کا درجہ دینا چاہتے ہیں۔

آب و ہوا: کشمیر کی آب و ہوا کے متعلق بہت سی صحیح اور غلط باتیں مشہور ہیں۔ مثلاً یہ بات بالکل صحیح ہے کہ کشمیر میں جھیلوں کی بہتات ہے لیکن یہ قطعی غلط ہے کہ یہاں پانی کی

بہتات ہے۔ اکثر کشمیری آب و ہوا سے محروم اور اکثر جھیلیں پانی سے بھری پڑی ہیں۔ سرینگر میں پانی کی اس درجہ کمی ہے کہ گرمیوں میں بہت سے لوگ رات کو شبنم جمع کر کے دن کو پیتے ہیں۔ اور سردیوں میں برف پگھلا کر اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ سرینگر میں پانی کی اس قلت کے کئی اسباب بیان کئے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ زیادہ تر پانی چشمۂ شاہی میں قائم ملک سپلائی سکیم کو سپلائی کیا جاتا ہے۔ یہاں سے جو کچھ بچ جائے وہ منسٹروں کے کتوں کو نہلانے پر صرف ہوتا ہے۔ اس طرح اکثر دیہات اور کنڈی کا تقریباً تمام تر حصہ پانی کی دولت سے محروم ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر اپنے آنسو پی پی کر اپنے حکمرانوں کی بے وقت موت کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں، جہاں تک ہوا کا تعلق ہے۔ شہر سے باہر ابھی تک اس پر کوئی ٹیکس عائد نہیں ہوا ہے۔ اس لئے دیہات اور پہاڑوں پر رہنے والے لوگ پیٹ بھر کر ہوا پیتے ہیں۔ ان لوگوں کا گذارہ ہی اسی ہوا پر ہوتا ہے۔ شہر میں میونسپلٹی نے پانی ہی کی طرح ہوا کو بھی اپنی تحویل میں لے لیا ہے اور نتیجہ یہ کہ شہر میں پانی ہی کی طرح ہوا بھی غائب ہو گئی ہے۔ اندرونِ شہر میں کہیں ہوا کا نام و نشان بھی دیکھنے میں نہیں آتا۔ اور جس چیز کو ہوا سمجھ کر لوگ زندہ ہیں وہ دراصل ان کی موت کی تمہید ہے۔ شہر کے کم آباد علاقوں میں کبھی کبھی ہوا کے جھونکے چلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں لیکن میونسپلٹی کے ڈر کی وجہ سے یہ بھی زیادہ دیر تک ایک ہی علاقے میں سفر نہیں کرتے۔ میونسپلٹی نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے سرینگر کی آب و ہوا کی تاثیر بدل کر رکھدی ہے۔ اور اب تازہ ہوا میں بھی بدبو، عفونت اور غلاظت کے عناصر بدرجہ اتم موجود ہوتے ہیں۔ بارش کے دنوں میں ہر گھر کا صحن ایک چھوٹی سی جھیل اور ہر شاہراہ ایک چھوٹے سے دریا میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہی پانی جمع کر کے پھر نلوں کے ذریعے شہری عوام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ شہر سے باہر جن قصبوں اور دیہات میں پانی کے نل لگائے گئے ہیں، ان میں سال میں ایک یا دو بار پانی کا ظہور ہو جاتا ہے۔ اور جب کبھی اس قسم کی کرامت رونما ہو جاتی ہے تو دیہات کے سب لوگ نلوں کے گرد جمع ہو کر خدا کی قدرت کی داد دیتے ہیں۔ ایک گاؤں میں گاؤں والوں نے ایک بہت بڑے پیر صاحب سے تعویذ لے کر ایک نل کی گردن میں ڈال دئے کہ شاید اس میں پانی آجائے لیکن اس کے باوجود نل خشک رہا۔ اب اس نل کو شیطان نل

کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

پچھلے بیس برسوں میں یہاں کی آب و ہوا میں بہت بڑی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ پہلے یہاں کی آب و ہوا گرمیوں میں معتدل اور سردیوں میں سرد ہوا کرتی تھی۔ اب گرمیوں میں کبھی کبھی بے پناہ سردی اور سردیوں میں کبھی کبھی خاص گرمی پڑتی ہے۔

لیکن ایسا کبھی کبھی ہی ہوتا ہے۔ عام طور پر سردیوں میں شدّت کی سردی پڑتی ہے مثلاً اس سال یہاں ایسی سردی پڑی کہ تقریباً ڈیڑھ ماہ کے لئے ہندوستان اور کشمیر کا ناقابل تنسیخ الحاق تقریباً منسوخ ہو کر رہ گیا اور اب ان دنوں اس قیامت کی گرمی پڑ رہی ہے کہ دلی اور کشمیر میں فرق کرنا ناممکن بن گیا ہے۔ اسی طرح موسم سرما میں دلّی اور کشمیر کے درمیان جو خلیج حائل ہو گئی تھی وہ موسم گرما کے دوران سکڑ سکڑ کر تقریباً ختم ہو گئی ہے۔ غرضیکہ اب آب و ہوا میں اعتدال نام کی کوئی چیز موجود نہیں۔ سیاسی لیڈروں کے رویہ سے متاثر ہو کر یہاں کی آب و ہوا بھی انتہا پسند ہو گئی ہے۔

ذرائع آمدورفت: سیّاح حضرات پٹھانکوٹ اور جمّوں سے ہوتے ہوئے اگر بانہال تک بہ صحیح و سلامت پہنچ گئے تو پھر وہ جواہر ٹنل سے گذر کر کشمیر میں داخل ہوتے ہیں۔ جمّوں سے بانہال تک کا راستہ بہت خوبصوت ہے لیکن ہر خوبصورت عورت کی طرح بہت خطرناک بھی ہے۔ اس راستے پر سرکاری بسیں، پرائیویٹ گاڑیاں، موٹر کاریں اور فوجی گاڑیاں دن بھر رینگتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایک پیدل قسم کا جانور بھی کہیں کہیں پولیس کی وردی میں نظر آتا ٹہلتا ہوا نظر آئے گا۔ یہ اے۔ ٹی۔ آئی یا ڈی۔ ٹی۔ آئی کہلاتا ہے۔ یہ سواری کے کام نہیں آتا، لیکن سواریوں کو تکلیف پہنچانے میں ڈرائیور کی مدد کرتا ہے۔

سری نگر میں آمدورفت کے ذرائع کو چار بڑے حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پیدل، ٹانگہ، ٹیکسی اور کشتی۔ پیدل چلنا اس شہر میں سب سے زیادہ خطرناک اور مہنگا سودا ہے۔ خطرناک اس لئے کہ شہر کی سڑکیں اُن دنوں کی یادگار ہیں کہ جب کشمیر ایک بہت بڑا تالاب تھا اور یہاں بڑے بڑے مگرمچھ رہتے تھے۔ ان مگرمچھوں نے اپنے لئے جو گڑھے کھود دیے تھے،

ہماری سرکار نے انہیں آثار قدیمہ کی یادگار کے طور پر محفوظ کر لیا ہے اور اس بات کا ہر وقت ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں آپ کسی گہرے گڑھے میں لڑھک کر اپنی ٹانگ نہ توڑ بیٹھیں۔ شہر کی اکثر سڑکوں کے Mainhole بغیر کسی ڈھکنے کے شہر میں خوشبو پھیلانے کے لئے کھلے چھوڑ دئے گئے ہیں۔ اور کبھی کبھی کوئی راہ گیر خوشبو کی تلاش میں اتنی دور چلا جاتا ہے کہ پھر واپس نہیں آتا اور اگر آپ کے مقدّر میں زندگی کے کچھ دن باقی ہوں تب بھی جب آپ گھر لوٹیں گے تو آپ کا نیا جوتا گھس گھس کر چار برس پُرانا ہو چکا ہوگا اور اس طرح شہر کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے کے لئے آپ کو کم از کم ہر روز ایک نیا جوتا خریدنا پڑے گا۔ اس کے لئے بہتر یہی ہے کہ آپ پیدل چلنے کی زحمت گوارا نہ کریں۔ ٹانگہ ایک تاریخی سواری ہے اور شہر میں چھوٹے چھوٹے فاصلے طے کرنے کے لئے بہت کارآمد چیز ہے، لیکن ٹانگے پر بیٹھنے سے پہلے ٹانگے والے کا بغور جائزہ لیجئے کیونکہ اس بات کا زبردست امکان ہے کہ آپ کو سفر کے آخر میں ٹانگے والے سے کُشتی لڑنا پڑے۔ اگر ٹانگے والا جسمانی لحاظ سے آپ سے زیادہ مضبوط ہے، تو ہرگز ہرگز اس ٹانگے پر نہ بیٹھئے۔ آپ ٹانگے والے سے پوچھیں گے کہ امیراکدل یا زینہ کدل تک کیا لوگے، تو جواب دے گا کہ جو آپ کا جی چاہے اور جب آپ منزل مقصود پر پہنچ کر کچھ دیں گے تو وہ آستین چڑھا کر حملے کی تیاری کرے گا۔ اگر آپ شریف آدمی ہیں تو چپکے سے وہی کچھ دے دیجئے جو وہ مانگتا ہے، ورنہ آپ کی جان تو نہیں مگر عزّت ضرور خطرے میں ہے۔

سرکار کی طرف سے ریٹ مقرر ہیں لیکن آپ اس دھوکے میں نہ آئیے کیونکہ یہاں کی سرکا کو ٹانگے والے بھی Seriously نہیں لیتے۔ صبح اور شام کے وقت ٹانگے کے کرایہ میں کوئی فرق نظر آئے تو اس کی چنتا نہ کیجئے، کیونکہ شام کو یہاں ٹانگے والوں کا راج ہوتا ہے۔

ٹیکسی کو یہاں رائج ہوئے بہت دن ہوئے نہیں گذرے ہیں لیکن اسے مختصر عرصے میں ہی قبول عام کی سند حاصل ہو گئی ہے۔ شہر میں چلنے والی ٹیکسیوں کا میٹر چونکہ مخصوص سیاسی حالات کی بنا پر خراب ہو گیا ہے۔ اس لئے اس کی شکایت نہ کیجئے۔ اور جو کرایہ ٹیکسی والا طلب کرتا ہے وہ دیدیجئے۔ ٹیکسی پر سوار ہونے سے قبل ہی اگر ٹیکسی ڈرائیور یہ پوچھے کہ

کہاں جانا ہے تو حیران نہ ہو جائیے۔ وہ اس لئے پوچھ رہا ہے کہ کہیں آپ کو شہر اندر تو نہیں جانا ہے کہ ان راستوں پر ٹیکسی تو کیا پیدل چلنا بھی مشکل ہے۔ ٹیکسی حاصل کرنے کیلئے آپ کو ٹیکسی سٹینڈ تک پیدل آنا پڑے گا۔ چاہے آپ کو ایسا کرتے ہوئے دو میل کا سفر کیوں نہ کرنا پڑے، کیونکہ پورے شہر میں صرف دو عدد ٹیکسی سٹینڈ ہیں۔ ایک پرتاپ پارک کے پاس اور دوسرا سیّاحوں کے استقبالیہ مرکز سے باہر۔

کشتی کی سواری خالص سیّاحوں کے لئے مخصوص ہے اور سیّاحوں پر لازم ہے کہ کشتی پر سوار ہونے سے پہلے کرایہ طے کر لیں، کشتیوں کے خوبصورت ناموں پر نہ جائیے جو نام جتنا خوبصورت ہوگا وہ اتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

شہر میں آمد و رفت کے دو اور ذرائع بھی ہیں۔ سِٹی بس سروس اور آٹو رکھشا۔ جہاں تک ممکن ہو سکے اِن دونوں خطروں سے بچے رہیئے۔ سِٹی بس سروس میں سفر کرنے کے لئے عمرِ خضر درکار ہے اور آٹو رکھشا میں بیٹھنے سے پہلے زندگی کا بیمہ ضرور کروا لیئے۔

قابلِ دید مقامات: ویسے پورا کشمیر قابلِ دید ہے لیکن کچھ خاص مقامات کو جغرافیائی اہمیت کے علاوہ تاریخی اہمیت بھی حاصل ہے۔ جو لوگ صرف بصارت رکھتے ہیں انہیں گلمرگ، پہلگام، اچھ بل، نشاط باغ، شالیمار باغ اور اسی طرح کے مشہور مقامات دیکھنے چاہیئیں۔ لیکن کچھ لوگ بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی رکھتے ہیں، اُن لوگوں کو زینہ کدل، حبہ کدل، گاؤکھن، پرش یار، عالی کدل، صفاکدل اور چھتہ بل کے علاقے بھی ضرور دیکھنے چاہیئیں۔ اس کے علاوہ شہر میں اور کئی ایسے مقامات بھی ہیں جو قابلِ دید کی تعریف میں آسکتے ہیں۔ مثلاً بڈشاہ ہوٹل میں رہنے والے سیّاحوں پر لازم ہے کہ وہ کبھی کبھی اپنے ہوٹل کا عقب بھی دیکھ لیں، تاکہ انہیں ہمارے شہر کی "عظمت" اور "خوبصورتی" کا صحیح اندازہ ہو جائے۔ خاص طور پر وہ حصّہ قابلِ دید ہے جو ہوٹل کے کچن سے ملحق ہے۔

قابلِ دید عمارات: نئے سیکرٹریٹ کی عمارت صحیح معنوں میں قابلِ دید کہ یہ فنِ تعمیر

اور شومئی تقدیر کا ایک نادر نمونہ ہے۔ اس وسیع اور عریض عمارت میں ہزاروں لوگوں کی تقدیر اُلجھی ہوئی ہے۔ یہاں لاکھوں فائلیں سالہا سال سے اس انتظار میں بیٹھی ہیں کہ شاید کبھی ان کی تقدیر جاگ جائے۔ حکومت کو عوام سے محفوظ رکھنے کے لئے داخلے کے دروازے پر پولیس کا زبردست پہرہ قائم ہے اور صبح دس بجے سے تین بجے تک صرف وزیروں اور ان کے رشتہ داروں کو اس عمارت میں داخل ہونے کی اجازت ہے۔ تین بجے کے بعد عوام کو اندر داخل ہونے کی اجازت دی جاتی ہے۔ لیکن اس سے قبل وزیر اور اعلیٰ افسر لوگ گھر چلے گئے ہوتے ہیں، تاکہ اتفاقاً عوام سے ان کا سامنا نہ ہو جائے۔ یہ عمارت بخشی غلام محمد نامی شخص نے تعمیر کروادی ہے۔ اور اس میں ان دنوں غلام محمد صادق نامی آدمی بیٹھا ہے جو صبح سے شام تک فائلوں پر دستخط کرتا رہتا ہے۔

گپکار روڈ پر آفندی صاحب کا وہ مکان بھی قابلِ دید ہے جسمیں دورِ حاضر کا عمر عیار شری درگا پرشاد رہتا ہے۔ یہ مکان آفندی صاحب کے جمالیاتی ذوق اور ان کے شائستہ مذاق کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اس مکان کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ یہاں پچھلے پندرہ برسوں سے ایک ایسا شخص رہ رہا ہے جسے ہندو اور مسلمان دونوں ہی نفرت اور حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور جس کی زندگی کا مقصد عیش و عشرت کے سوا کچھ نہیں۔ اس شخص کو پوری ریاست میں دس آدمیوں کا اعتماد بھی حاصل نہیں۔ لیکن یہ اپنے آپ کو چالیس لاکھ عوام کا نمائندہ ظاہر کرتا ہے اور اس طرح پچھلے پندرہ برس سے اقتدارِ اعلیٰ پر قابض ہے۔ یہ مکان اور اس کا مکین قابلِ دید ہے اور قابلِ عبرت بھی۔

اس شہر میں ایک عدد یونیورسٹی ہے۔ کہنے کو تو یہ یہاں کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ ہے لیکن دراصل یہ ایک چراگاہ ہے۔ جہاں ملک کے پنشن یافتہ، ضعیف العمر اور ناکارہ لوگ عمر کے آخری ایّام میں چرنے آتے ہیں۔ ایک عرصے سے یہ یونیورسٹی اپنے وائس چانسلر کی تلاش میں دربدر پھر رہی ہے۔ لیکن ابھی تک اس کی تقدیر سوئی پڑی ہے۔ وائس چانسلر کے لئے چونکہ کم از کم اسّی بیاسی برس کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ اس لئے شاید اسی یونیورسٹی کو ابھی بہت دیر تک بغیر وائس چانسلر کے ہی رہنا پڑے۔ کیونکہ اس عمر کے لوگ اب نایاب ہوتے

جا رہے ہیں۔

یونیورسٹی کے ساتھ ہی ایک انجنیئرنگ کالج بھی ہے۔ اس کالج کا پرنسپل جغرافیہ کا پروفیسر ہے اور یہاں انجنیئرنگ کی بجائے فسادات کی تربیت دی جاتی ہے۔ اس لئے اسکو کالج کی بجائے "فتنہ گاہ" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ پچھلے کئی ہفتوں سے یہ کالج بند ہے اور شہر میں مکمل امن و امان قائم ہے۔ اس کالج کی عمارت اس لئے قابلِ دید ہے کہ اس کا بیشتر حصّہ انجنیروں نے جلا کر راکھ کر دیا ہے۔

صنعتیں: ریاست کی سب سے بڑی انڈسٹری یہاں کی پولیس ہے جس پر ہر سال کروڑوں روپیہ خرچ ہوتا ہے اور اسی لئے کشمیر کی انڈسٹریل اسٹیٹس پر پولیس کا قبضہ ہے۔ مخصوص سیاسی حالات کی بنا پر یہ انڈسٹری دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہی ہے اور جوں جوں جمہوری فضا عام ہوتی جا رہی ہے۔ جمہوریت کو بچانے کے لئے پولیس کی صنعت کو بھی فروغ دیا جا رہا ہے۔

افواہوں کی صنعت بھی زوروں پر ہے اور افواہ سازی کے کئی چھوٹے بڑے کارخانے شہر بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کارخانوں میں صبح سے شام تک ہزاروں افواہیں تیار کر کے دور دراز علاقوں میں بھیجی جاتی ہیں۔ شہر کی اکثر آبادی اس گھریلو صنعت میں مصروف ہے اور اندازہ ہے کہ تقریباً بائیس لاکھ لوگ افواہیں تیار کرنے اور پھیلانے میں حصّہ لیتے ہیں۔

ایک اور بڑی صنعت اخبارات کی ہے۔ شہر میں اخبارات کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو جاتا ہے۔

ایک سال قبل ہفتہ وار اخبارات کی صنعت زوروں پر تھی۔ اب روزانہ اخبارات کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ اس صنعت کو شروع کرنے کے لئے نہ سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ مہارت کی۔ اس لئے شہر کا ہر بے کار اور ان پڑھ آدمی اخبار کا ایڈیٹر بن جاتا ہے۔

سیاسی لیڈروں کو بھی کشمیر میں اب ایک اہم صنعت کا درجہ حاصل ہو چکا ہے، جو شخص اتنا اناڑی اور جاہل ہو کہ اخبار کا ایڈیٹر بھی نہ بن سکے۔ وہ سیاسی لیڈر بن جاتا ہے۔ اسی لئے سیاسی لیڈروں کی تعداد میں روز بروز غیر معمولی اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور ریاست کی بہت سی بے کار اور ناقابلِ کار آبادی اِس صنعت میں جُٹ گئی ہے۔ اِس زمانے میں سیاسی لیڈر کی تیاری میں چونکہ زیادہ محنت درکار نہیں ہوتی اس لئے دھڑا دھڑ لیڈر تیار ہو رہے ہیں۔ لیڈروں کی اِس بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر قوم کا بیڑا غرق ہونے میں اب کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہا ہے۔ (ناتمام)

(۱۲ر جولائی ۱۹۶۸ء)

جھوٹ اور سفید جھوٹ

صبح سے شام تک لوگ اتنا جھوٹ بولتے رہتے ہیں کہ چراغ بیگ نے جھوٹ کو ایک صداقت کے طور پر تسلیم کر لیا ہے اور اب اگر کوئی اس سے جھوٹ نہ بولے تو اُسے حیرت ہوتی ہے لیکن یہ بات صرف جھوٹ کے بارے میں صحیح ہے۔ سفید جھوٹ اُسے اب بھی چونکا دیتا ہے اور کبھی کبھی وہ اس کو جھٹلانے اور جھوٹے کو اس کے گھر تک پہنچانے کا عزم بھی کر لیتا ہے۔ آج ایسے ہی سفید جھوٹ کی قلعی کھول کر سفید جھوٹ بولنے والوں کو "آئینہ" دکھانے کے لئے قلم اُٹھایا ہے کہ لو دیکھ لو اپنی تصویر کہ کتنے باشرم، بے حیا اور بے غیرت دکھائی دیتے ہو!

ریاستی حکومت آئے دن چھوٹے موٹے جھوٹ بولتی رہتی ہے اور ریاستی عوام نے اِس حقیقت کو ناگزیر سمجھ کر گوارا کر لیا ہے کہ یہ حکومت جھوٹ بولنے سے باز نہیں آسکتی اور اِسی لئے انہوں نے صداقت پر کھنے کا ایک نیا معیار قائم کیا ہے۔ جس کی رو سے ہر وہ بات صحیح ہے، جس کی تردید حکومت کرے اور ہر وہ بات غلط جس کی تصدیق ریاستی حکومت کرے۔ اِس ریاست میں سچ اور جھوٹ کے پرکھنے کا اِس سے مؤثر، مفید اور قابلِ عمل نسخہ موجود نہیں اور چراغ بیگ اہلِ کشمیر کو اس نسخے کی دریافت پر مبارکباد دیتا ہے۔

۱۹ر اگست کو محاذ رائے شماری نے ۱۹۵۳ء کے "انقلاب" کی یاد منانے کے لئے وادی بھر میں مکمل ہڑتال منانے کی اپیل کی۔ چراغ بیگ کا اپنا خیال یہ تھا کہ شہر کے

کچھ اندرونی حصّوں میں دکانیں بند رہیں گی اور زیادہ سے زیادہ اننت ناگ اور بارہ مولہ کے قصبوں میں جزوی ہڑتال رہے گی۔ لیکن ۹ اگست کو دن کے بارہ ایک بجے جب یہ خاکسار اپنے معصوم سکوٹر پر سوار شہر کا جائزہ لینے کے لئے نکلا، تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ریذیڈنسی روڈ کی اکا دُکا دکانوں کے بغیر شہر کی ساری دُکانیں کچھ اس طرح بند تھیں کہ جیسے دُکاندار ہمیشہ کے لئے اپنی دُکانوں میں تالا ڈال کر شہر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ ٹانگے، ٹیکسی اور بسیں سڑکوں سے کچھ اس طرح غائب ہو گئی تھیں کہ سری نگر پر ایک اُجڑے ہوئے شہر کا گماں ہوتا تھا۔ سینما ہال، ہوٹل، موٹر ورکشاپ ادویات کی دُکانیں، حتیٰ کہ شہر کے چنڈو خانوں پر بھی موت کا سا سکوت طاری تھا۔ اگر سرکاری دفتروں میں اتفاق سے اس دن چھٹی ہوتی اور کوئی اجنبی شہر میں وارد ہوتا، تو اس کا پہلا تاثر یہی ہوتا کہ شہر والے کسی حملہ آوار کی خوف کی وجہ سے شہر چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ مفصلات سے کوئی اطلاع موصول ہونا ممکن ہی نہ تھا کہ آمد و رفت کے تمام ذرائع بند تھے۔ ٹیلی فون پر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ شوپیان، اننت ناگ، بارہ مولہ، سوپور اور بانڈی پور میں مکمل ہڑتال ہے۔ نہ صرف دُکانیں ہی بند ہیں بلکہ ہر طرح کا کاروبار معطل ہے۔ چراغ بیگ نے شہر کی تاریخ میں اتنی مکمل اور مؤثر ہڑتال نہیں دیکھی ہے، لیکن اسی شام کو ریاستی حکومت کا ایک ترجمان یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ہڑتال کی اپیل ناکام رہی۔ شہر میں جزوی ہڑتال تھی، شوپیان، اننت ناگ، بارہ مولہ، میں دُکانیں بند رہیں، لیکن گاندربل، پہلگام، گلمرگ اور کنگن میں کوئی ہڑتال نہیں ہوئی۔ سرکاری ترجمان کا بیان، سرکاری اخبارات میں شائع ہونے کے علاوہ ریڈیو کشمیر اور آل انڈیا ریڈیو سے بھی شائع ہوا۔

چراغ بیگ کو اس بات سے غرض نہیں کہ ۹ اگست کو ہڑتال کی اپیل جائز تھی یا ناجائز۔ اسے اس بات سے بھی کوئی سروکار نہیں کہ ہڑتال کی اپیل کرنے والے کون ہیں، کیسے ہیں اور کیوں ہیں؟ وہ ایک اخبار نویس کی حیثیت سے صرف یہ جانتا ہے کہ ۹ اگست کو وادیٔ کشمیر میں اتنی زبردست ہڑتال ہوئی ہے کہ جس کی نظیر ملنا مشکل

ہے۔ اُس نے اپنی آنکھوں سے شہر کی حالت دیکھی، اور یہ تاثر لے کر شام کو ریڈیو سننے بیٹھ گیا، کہ اپنی آنکھوں سے شہر کا احوال دیکھ کر اب وہ اپنے کانوں سے دنیا بھر کے حالات سے روشناس ہوگا۔ لیکن سرکاری ترجمان اور سرکاری زبان ــــ ریڈیو کشمیر ــــ نے اُسے نہ صرف مایوس کر دیا بلکہ کسی حد تک مشتعل بھی۔ سرکاری ترجمان کا بیان اور ریڈیو کشمیر کے نشریے کا مقصد یقیناً یہ تھا کہ ریاست سے باہر کے لوگوں کو یہ یقین دلایا جائے کہ کشمیر میں سب کچھ ٹھیک ہے۔ اور لوگ مسجدوں، مندروں، سڑکوں اور بازاروں میں شریمتی اندرا گاندھی کی درازیٔ عمر کے لئے دُعائیں کر رہے ہیں، لیکن اس کا کیا کیجیئے کہ یہ بیان اور یہ خبریں ان ہزاروں نہیں لاکھوں لوگوں نے بھی سنیں جنہوں نے اپنی آنکھوں سے ہڑتال اور احتجاج کا یہ بے نظیر مظاہرہ دیکھ لیا تھا۔ ان لاکھوں لوگوں کی نگاہوں میں اِس حکومت، اس کے ترجمان اور اس کے زیر انتظام چلنے والے ریڈیو اسٹیشن کی کیا وقعت باقی رہی ہے۔ یہ لوگ یہ سمجھنے میں حق بجانب ہونگے کہ جو حکومت اس دیدہ دلیری، بے حیائی اور بے شرمی سے جھوٹ بول سکتی ہے اور دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کر سکتی ہے وہ کیا کچھ نہیں کر سکتی۔ اس لئے میرے بعض دوستوں کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکومت اتنی نکمی، ناکارہ اور نالائق ہے کہ اِسے جھوٹ بولنے کا بھی سلیقہ نہیں۔ اسمبلی کے گذشتہ اجلاس میں شمیم احمد شمیم نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ "پچھلے دو برسوں میں اتنی ناکارہ اور نکمی حکومت ریاست کے لوگوں پر کبھی مسلط نہ ہوئی تھی ــــ" سفید جھوٹ بولنے والی یہ بے غیرت سرکار لوگوں کا اعتماد کیا حاصل کرے گی۔ اپنا اعتبار بھی قائم نہیں کر سکتی۔

آواز دو قانون کو، قانون کہاں ہے؟

۵، ۶ر اکتوبر کو ٹیگور میموریل ہال میں ملک بھر کے قانون دانوں کا ایک سیمنار سپریم کورٹ کے چیف جسٹس شری ہدایت اللہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جسمیں ملک بھر کے اعلیٰ ترین قانون دانوں نے عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی اور قانون کی عملداری کے عنوان سے بصیرت افروز مقالے پڑھے۔ چراغ بیگ نے ماہر قانون کے یہ پُرمغز مقالے نہ صرف پوری توجہ اور غور سے سُننے بلکہ اپنی مقدور کے مطابق انہیں سمجھنے کی بھی کوشش کی۔ چیف جسٹس ہدایت اللہ کے عالمانہ خطبے اور شری ستیلواد کی معنی آفرینی کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ لیکن اس کا کیا کیجئے کہ یہ عالمانہ مقالے اور یہ فاضلانہ تقریریں سُن کر اپنی مجبوری، بے بسی، بے کسی کا احساس پہلے سے زیادہ شدید ہو گیا۔ اور پھر جب خواجہ غلام حسن نخوی نے بھی عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی پر اپنا قابلِ تعریف مضمون پڑھ ڈالا، تو ریاستی ہائیکورٹ کے چیف جسٹس مرتضیٰ فضل علی کی ستم ظریفی کی داد دئے بغیر نہ رہا گیا۔

کشمیر پچھلے اکیس سال سے لاقانونیت، جبر و تشدد، ظلم و ستم اور بدترین آمریت کا گہوارہ رہا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ ہر بار جب قبائے اخلاق اور انسانیت تار تار ہوئی ہے۔ چنگیزوں نے آئین، قانون اور انصاف کے نام پر اپنی آمریت کا محل تعمیر کیا ہے۔ ۱۹۵۱ء میں آئین ساز اسمبلی کا انتخاب ہو یا ۱۹۵۳ء کا شب خوں،

۱۹۵۷ء کا فریب ہو یا ۱۹۶۷ء کی ڈکیتی ہر بار رہبروں نے قانون کا سہارا لیکر رہزنی کی ہے۔ اقتدار کے مسندوں پر بیٹھے ہوئے بُت ہوں یا شاہی محلات سے نکلے ہوئے پجاری سبھی کے ہاتھ آئین اور قانون کے خون سے رنگے نظر آتے ہیں۔ انصاف کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے شاہزادے ہوں یا انصاف کی دُہائی دینے والے مظلوم، سب نے مل کر آئین، قانون، عدل، انصاف اور اخلاق کی بے حُرمتی کی ہے۔ عین اس وقت جب اس سرزمین پر رہنے والے لاکھوں لوگ ظلم، جبر، بے ایمانی اور طاقت کو سب سے مقدّس، معتبر اور موثر قانون تسلیم کر کے اپنے آپ کو اس نئے قانون کے سپرد کرنے لگے ہیں۔ چیف جسٹس مرتضیٰ فضل علی ملک کے مایہ ناز قانون دانوں کو سری نگر کے ٹیگور میموریل ہال میں جمع کر کے انسانی حقوق، قانون کی عملداری اور عدلیہ کی انتظامیہ سے علیحدگی کے موضوعات پر تقریریں کرواتے ہیں اور مقالے پڑھواتے ہیں۔ مرتضیٰ صاحب مجھے معاف کریں گے کہ ایک مجبور، بے بس، اور بے زبان مخلوق کے ساتھ اس سے بڑھکر کوئی زیادتی ممکن نہیں، مجھے چیف جسٹس صاحب کا احترام ہی نہیں، مجھے ان کی ذات سے ایک پُر خلوص عقیدت ہے اور اسی عقیدت کی بنا پر میں ان سے یہ کہنا چاہوں گا کہ اگر چیف جسٹس ہدایت اللہ کے خطبے، شری ستیلواد کی تقریر، جسٹس بھٹ کا مقالہ، مسٹر نصر اللہ بیگ کے مضمون، شری تلک راج بھسین کی خیال آرائی اور غلام حسن نحوی کی مضمون آفرینی میں کوئی حقیقت ہے تو اقتدار کے اعلیٰ منصبوں پر فائز حکمرانوں کو عدالت کے کٹہروں میں کھڑا ہونا چاہیئے۔ انصاف کی اونچی اونچی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے سبھی نوشیروانوں کو تو نہیں، لیکن بہت سے "عادلوں" کو ان بلندیوں سے اُتر کر پستیوں کی طرف آنا پڑے گا۔ اگر قانون کی عملداری اور انسانی حقوق کا وہی تصور صحیح ہے جو سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سے لے کر سری نگر کے تصدق حسین نے پیش کیا ہے تو چیف جسٹس مرتضیٰ فضل علی کو ایک اعلان جاری کرنا پڑے گا کہ گذشتہ اکیس سال سے اس ریاست میں قانون کی نہیں لاقانونیت کی عملداری رہی ہے، انصاف کی نہیں، نا انصافی کی حکومت رہی ہے اور آج جو لوگ آئین اور

قانون کا نام لے کر آئین اور قانون کے محافظ بننے کا دعویٰ کرتے ہیں ان کے وجود سے خون کی بُو آتی ہے اور یہ خون ہے آئین اور قانون کا۔ جمہوریت اور انصاف کا۔ اخلاق اور شرافت کا؟

کہتے ہیں کہ جہالت بھی ایک نعمت ہے۔ قانون دانوں کے سیمنار میں شرکت سے پہلے ہمیں یہ معلوم ہی نہ تھا کہ قانون کی عملداری کیا ہوتی ہے اور انسانی حقوق کی عظمت کیا ہے؟ چیف جسٹس مرتضیٰ علی نے روشنی جلا کر اندھیرے کے احساس کو زیادہ گہرا کر دیا ہے۔

(۱۱/ اکتوبر ۱۹۶۸ء)

چاند زیادہ دور ہے یا زینہ کدل؟

یہ کسی امتحانی پرچے کا سوال نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارے ممتحنوں میں اتنا تخیّل نہیں کہ وہ کوئی طبع زاد سوال پوچھ سکیں۔ لیکن چراغ بیگ کو یقین ہے کہ اگر سری نگر کے طالب علموں سے اس سوال کا جواب پوچھا جائے تو وہ بلا کسی تامّل کے جواب دیں گے "زینہ کدل"۔ آپ کو یقین نہ ہو تو شام کے پانچ بجے کے بعد زینہ کدل جانے کا پروگرام بنائیے۔ انشاء اللہ چار گھنٹوں کی مسلسل بھاگ دوڑ کے بعد آپ بھی اس جواب کی برجستگی کے قائل ہو جائیں گے۔ شاید امریکہ کرۂ ارضی ہیں اپالو سلسلے کا ایک اور خلائی جہاز چاند کی طرف روانہ کر دے گا جو چند دنوں کے بعد واپس کیپ کنیڈی پہونچ جائے گا لیکن زینہ کدل اس کے باوجود ایک عام شہری، ایک سیّاح کے لئے ایک دور افتادہ مقام ہو گا۔ شام ہوئی تو لال چوک سے ہری سنگھ سٹریٹ تک زینہ کدل جانے والوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے نظر آتے ہیں۔ کوئی تانگہ گذر گیا تو ان کی آنکھوں میں امید کی روشنی چمک اٹھتی ہے لیکن تانگے بان ان کی اس بے قراری پر ایک خندۂ زیرِ لب کر کے گذر جاتا ہے۔ کسی سواری نے ذرا زیادہ جوش دکھایا اور تانگے کی طرف بڑھا تو اُسے ایسا دھکّا ملتا ہے کہ اس کے ساتوں طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ اب کئی گھنٹے کی جدوجہد کے بعد وہ بس سٹینڈ کا رُخ کرتا ہے۔ پہلے تو بس کبھی سٹاپ پر موجود ہی نہیں ہوتی، اگر شومئی قسمت سے کھڑی نظر آئی تو اس کو دیکھ کر کلکتہ کے بلیک ہول کی مہیب واردات چشمِ تصوّر کے سامنے آتی ہے۔ بس کی تنگ کوٹھڑی میں حشر کا سا عالم نظر آتا ہے۔ مرد خواتین کی باہوں میں جھولتے ہوئے نظر آتے ہیں اور عورتیں اس پامالی پہ بھی سر دُبک

کے خوش رہتی ہیں کہ آخر جگہ تو مل ہی گئی۔ ادھر سینما ہالوں سے نکلے ہوئے ٹیڈی دوستوں کے مُنہ میں جلے ہوئے سگریٹ ساری بس کو اس قدر دھواں دھار بنا دیتے ہیں کہ سانس لینا دوبھر ہو جاتی ہے۔ اور اگر کوئی دمے کا مریض ہو تو اُسے ایکدم قفص عنصری سے رہائی کا سندیسہ مل سکتا ہے۔ اب کوئی سخت جان ہوا تو ٹیکسی سٹینڈ کا رُخ اختیار کرتا ہے۔ منہ مانگے داموں ٹیکسی کی سواری حاصل کرنے کے لئے تڑپتا ہے۔ لیکن کس کو پڑی ہے کہ اس کی فریاد کی طرف توجہ دے۔ یہ وقت تو امن و قانون کی معطلی کا وقت ہوتا ہے ٹیکسی ڈرائیور اور تانگے بان خود مختاری کا اعلان کر چکے ہوتے ہیں اور یک لخت آپ کو احساس ہو جاتا ہے کہ لوگ کس قدر نکمّے ہیں جو مُنہ مانگے داموں آپ کو دو میل کا فاصلہ طے کرنے میں مدد دے نہیں سکتے اور پھر یہ کہ یہ کیسی نکمّی حکومت ہے جس کو یہ احساس بھی نہیں کہ روزمرّہ زندگی کا اتنا اہم مسئلہ حل کرنے کے لئے صرف تھوڑی سی توجہ تھوڑی سی دلچسپی کی ضرورت ہے۔ سرکاری موٹروں اور جیپوں کا ایک ایسا فلیٹ بنانے والے حکمرانوں کو، جو کسی ترقی یافتہ ریاست کے لئے بھی بوجھل ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ مسئلہ اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ شراب کی ایک بوتل منگوانے کے لئے یہ لوگ بیک وقت کئی جیپوں کئی کاروں کو دوڑا سکتے ہیں۔ اور خزانۂ عامرہ کا سینکڑوں روپے پل بھر میں برباد کر سکتے ہیں لیکن انہیں احساس نہیں کہ ایک عام شہری ایک سیّاح اپنی گرہ سے روپے خرچ کر کے وقت پر زینہ کدل نہیں پہونچ سکتا۔ اگر ٹرانسپورٹ کا مسئلہ کلکتہ، بمبئی، مدراس اور دہلی جیسے عظیم شہروں میں طے ہو سکتا ہے تو کشمیر میں یہ روگ اس قدر لاعلاج کیوں ہو گیا ہے؟ کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ سرکاری موٹروں کے اتنے زبردست فلیٹ کو چند رنگیلے حکمرانوں کی ترنگوں کا غلام بنانے کی بجائے سرکاری ٹیکسی کی حیثیت سے استعمال کیا جائے۔ اگر اس طرح سے حکمران طبقے کو پریشانی ہوتی ہے تو فنانشل کارپوریشن سے چند لاکھ روپے کا قرض حاصل کر کے کچھ ٹیکسیاں خریدی جا سکتی ہیں۔ چراغ بیگ انہیں یقین دلاتا ہے کہ یہ پیسہ کچھ مہینوں میں ہی بے باق ہو جائیگا۔ اور شہریوں کو بھی تھوڑی سی آسائش بہم ہوگی اور رعیت کی خوشنودی خود حکمرانوں کے اقتدار کی بقاء کیلئے مفید ثابت ہوگی۔

(۱۲ر نومبر ۱۹۶۸ء)

بے پر کی

• شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ آج کل معجزات کا ایک نیا سلسلہ منسوب کیا جارہا ہے۔ ایک خبر یہ ہے کہ انہوں نے اپنی نظر سے ایک ایسے مریض کو ٹھیک کر دیا جو کینسر جیسے لاعلاج مرض میں مبتلا تھا۔ چراغ بیگ کو اس سلسلے میں ایک دوست کی زبانی ایک دلچسپ واقعہ سننے کا اتفاق ہوا۔ یہ صاحب شیخ صاحب کے ساتھ کسی دعوت میں شریک تھے۔ شیخ صاحب مجلس میں تھے کہ ایک بزرگ صورت شیخ تشریف لائے اور شیخ صاحب کے پاس پہونچ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ جب شیخ صاحب نے سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ صاحب کئی بیویوں کے شوہر بننے کے باوجود ابھی تک اولاد سے محروم ہیں اور اب شیخ صاحب کی مدد کے طلبگار ہیں۔ شیخ صاحب نے فوراً شیرینی کی ایک بڑی مٹھی بزرگ کے ہاتھ میں تھما دی، لیکن جب ہمارے دوست نے اشارہ کیا کہ کہیں شیرینی کے اس قدر دانے فیملی پلاننگ مہم کے خلاف تو نہیں ہیں۔ شیخ صاحب ہنس دئے اور انہوں نے بزرگ کے ہاتھ میں صرف تین دانے رہنے دئے۔

• نئے ناظم تعلیمات کی تقرری صادق صاحب کے لئے سر درد بن کر رہ گئی ہے کیونکہ اس معاملے میں اُن کے کوئی دو صلاح کار ایک سی رائے نہیں رکھتے۔ صادق صاحب فیصلہ کرنے کی قوت سے بچنے کے لئے اب اس معاملے کو لاٹری کے ذریعہ حل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ مختلف امیدواروں نے اب صادق صاحب کے دروازے کی بجائے میرک شاہ صاحب کے آستانے کی قدمبوسی شروع کر دی ہے۔

● میر غلام رسول نازکی اپنے ہفت روزہ "الغفران" کی رسمِ فاتحہ کے لئے احباب کی ایک فہرست تیار کر رہے ہیں۔ نازکی صاحب کا کہنا ہے کہ اُن کے اخبار کی پذیرائی خوب ہوئی۔ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور سراہا گیا، لیکن پھر بھی میں اسے بند کرنے پر مجبور ہوں، جب ان سے وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے جواب دیا کہ نئے مکان کی تعمیر نے میرے دل میں حسرتِ تعمیر کے تمام ولولوں کو ٹھنڈا کر دیا ہے۔ میں اب یہ نکتہ پہچان گیا ہوں کہ مکان بنانے سے مکان کو کرایہ پر حاصل کرنا اچھا ہے۔ اور اسی طرح اپنا اخبار نکالنے سے یہی بہتر ہے کہ دوسروں کے اخباروں میں لکھا جائے۔

یہ آئے دن کی ہڑتالیں

ایک غیر ملکی اخبار نویس نے ہمارے ملک کو ہڑتالوں کا دیس قرار دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں تقریباً تین سو دن ملک کے کسی نہ کسی حصّے یا زندگی کے کسی نہ کسی شعبے میں ضرور ہڑتالیں ہوتی ہیں۔ اور جوں جوں دن گذرتے جاتے ہیں۔ ہڑتالوں کی اصناف میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اب ہڑتال کا لفظ شاذ و نادر ہی اکیلے استعمال ہوتا ہے۔ اب اس کے ساتھ PEN DOWN ہڑتال، SIT-DOWN ہڑتال، WORK TO RULE ہڑتال اور اسی نوع کی درجنوں اضافتیں شامل رہتی ہیں۔ آجکل پارلیمنٹ میں سرکاری ملازموں کو ہڑتال کے حق سے محروم کرنے کے سرکاری بل کے خلاف حزبِ مخالف کے ممبران جو دھما چوکڑی مچائے ہوئے ہیں۔ اِس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان کی ساری جنگِ آزادی، سرکاری ملازموں کو ہڑتال کا حق دلانے کے لئے لڑی گئی تھی اور اگر سرکاری ملازموں کو "اس بنیادی حق" سے محروم کر دیا گیا تو ہندوستان کے لئے ایک "آزاد جمہوریہ" کہلانا ممکن نہ ہوگا۔ مخالف ممبران اس شدّت سے سرکاری ملازموں کے حق ہڑتال کی مدافعت کر رہے ہیں۔ کہ بیچارے سرکاری ملازمین کو بھی اپنے آپ سے ہمدردی ہونے لگی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہڑتال کئے بغیر یہ ملک اور یہ قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہڑتال، احتجاج، ناراضگی، برہمی، بیزاری، عدم تعاون اور عدم اعتماد کے اظہار کا سب سے آسان، کم خرچ اور بالانشین ذریعہ ہے۔ من حیثیت القوم چونکہ ہم کام چور اور حرام خور ہیں۔ اس لئے ہم کوئی ایسا موقع ہاتھ سے کھو دینے کے قائل نہیں کہ جس سے کام نہ

کرنے کی صورت پیدا ہو۔ اور اسی لئے ملک بھر میں ہڑتالوں کو جو مقبولیت حاصل ہے کسی اور صنفِ احتجاج کو حاصل نہیں۔ کشمیر کو چونکہ ملک بھر میں ایک امتیازی درجہ حاصل ہے اور دفعہ ۳۷۰ کی رُو سے کچھ خصوصی مراعات ابھی تک باقی ہیں۔ اسلئے ہڑتالوں کے معاملے میں بھی ہمیں ملک کے دیگر حصّوں کے مقابلے میں ایک امتیاز حاصل ہے۔ ہمارے ہاں ہڑتال، مطالبات منوانے یا احتجاج کرنے کے لئے ہی نہیں کی جاتی ہے۔ اظہار غم اور اظہارِ مسرت کے لئے بھی کی جاتی ہے اور پھر ہڑتالیں کی نہیں جاتی، کروائی جاتی ہیں۔ اعلان کیا جاتا ہے کہ کل ہڑتال ہوگی اور دوسرے دن ہڑتال ہوتی ہے۔ کوئی ماں کا لال یہ نہیں پوچھتا کہ کیوں ہڑتال ہوگی۔ کوئی پوچھ بھی کیسے سکتا ہے۔ اعلان کرنے والا تانگے یا ٹیکسی میں تیزی سے اعلان کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ سُننے والے کو صرف یہ یاد رہتا ہے کہ کل ہڑتال ہوگی اور وہ دوسرے دن ہڑتال کر دیتا ہے۔ سال بھر میں ہڑتال کے کچھ دن پہلے ہی سے مقرر ہیں۔ اور باقی دنوں کا وقتاً فوقتاً اعلان ہوتا رہتا ہے۔ ذراسی بات ہوئی اور ہڑتان کا اعلان ہو گیا۔ سارا کاروبار ٹھپ، ذرائع آمد ورفت بند اور سارے لوگ اپنے اپنے گھروں کی جانب روانہ۔ کسی کو معلوم نہیں کہ کیا ہوا ہے، لیکن سب لوگ غیر شعوری طور پر ہڑتال کو کامیاب بنانے میں اپنا حصّہ ادا کر رہے ہیں۔ سیاسی تنظیموں کو اپنی اہمیت اور مقبولیت جتانے کا بڑا ہی آسان نسخہ ہاتھ آیا ہے۔ اور ہر تنظیم ہڑتال کی کامیابی کو اپنے سیاسی موقف کی کامیابی سے تعبیر کر کے بزعم خود مطمئن ہو جاتی ہے کہ اُسے کشمیر کے چالیس لاکھ لوگوں کا اعتماد حاصل ہے۔ چاہے چالیس لاکھ لوگ اسے جی ہی جی میں گالیاں ہی کیوں نہ دے رہے ہوں۔ سرینگر میں ہڑتال کرانا اتنا آسان بن گیا ہے کہ نوّے فیصد دکانداروں اور دیگر کاروباری اداروں کی مرضی کے خلاف بھی ہڑتال ہو سکتی ہے۔ ہڑتال کا اعلان سُنتے ہی بیچارے دکاندار اور دیگر شہری اتنے ہراساں ہو جاتے ہیں کہ وہ بادلِ ناخواستہ اپنا کاروبار بند کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ اگر انہوں نے دکانیں بند نہیں کیں، تو پچاس ساٹھ بچّے جمع ہو کر دکانوں پر پتھراؤ کریں گے اور امن وقانون کی محافظ پولیس دیکھتی ہی رہ جائے گی۔ گاڑیاں چلنا اس لئے بند ہو جاتی ہیں کہ راستے میں گھیراؤ کے ساتھ پتھراؤ بھی ہوگا۔

نتیجہ یہ کہ ساری شہری آبادی "پچاس ساٹھ بچوں" کے خوف کی وجہ سے ہڑتال کو کامیاب بنانے کی ذمہ دار بن جاتی ہے اور سیاسی جماعتیں عدم تحفّظ اور خوف کے اِس احساس سے پورا پورا فائدہ اُٹھاتے ہوئے محل بے محل، بے موقع ہڑتال کا مطالبہ کرتی رہتی ہیں۔ لیڈرانِ کرام میں کسی کو اِس بات کا احساس نہیں رہتا، کہ ایک دن کی ہڑتال سے کتنے لوگوں کو زحمت ہوتی ہے۔ دن میں ڈیڑھ دو روپے کمانے والا مزدور، تانگے والا، دکاندار، سبھی ہڑتال کی زد میں آکر ایک دن کی آمدنی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اور ہر شہری کے لئے درجنوں مصیبتیں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ کاروبار کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے اور ایک دن کی ہڑتال سے زندگی کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی تو یہ ہڑتال ایک نہیں دو نہیں چار چار یا پانچ پانچ دنوں تک بھی جاری رہتی ہے۔ ملک کے دوسرے حصّوں میں ہڑتال کوئی مطالبہ منوانے یا حکومت کی توجہ دلانے کے لئے کی جاتی ہے۔ اِس شہر میں ہڑتال لیڈروں کی یاد منانے، غم اور مسرّت کا اظہار کرنے، سیاسی قوت کا مظاہرہ کرنے اور اپنی کھوئی ہوئی ساکھ بحال کرنے کے لئے کی جاتی ہے، اور سال میں اتنی بار کی جاتی ہے کہ اِس کی اہمیت اور اس کا اثر بالکل زائل ہو گیا ہے۔ چراغ بیگ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کاروبار بند کرنے یا کام نہ کرنے سے کسی لیڈر کی یاد منانے میں کیا خوبی ہے؟ وہ یہ بھی نہیں سمجھتا کہ بار بار ہڑتال کرنے یا کرانے سے حکومت کا کیا نقصان ہوگا۔ سارا نقصان تو عام آدمی کا ہوتا ہے۔ پھر ہمارے لیڈرانِ کرام بار بار کیوں پریشان کرتے ہیں؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہمارے ہاں کے سیاسی لیڈر اپنی اہمیت اور مقبولیت کا مظاہرہ کرنے کے لئے عام ہڑتال کی بجائے مہاتما گاندھی کی طرح بھوک ہڑتال کا نسخہ آزمانے کی زحمت گوارا کریں تاکہ انہیں اندازہ ہو جائے کہ ایک دن کی ہڑتال سے وہ کتنی بھوک اور بے چینی کو جنم دیتے ہیں؟ ہمیں امید ہے کہ ہماری تجویز پر ہمدردانہ غور ہوگا اور آئندہ جب بھی عام ہڑتال کی "ضرورت" محسوس ہو ہمارے لیڈر بھوک ہڑتال پر ہی اکتفا کریں گے اور عام لوگوں کو ہڑتال کی زحمت نہیں دیں گے!

(۲۰ دسمبر ۱۹۶۸ء)

ہونا کانگریس میں شامل اور بننا منسٹر

کچھ دنوں سے شہر میں (بلکہ دیہات میں بھی) بڑے زوروں سے یہ افواہ گرم ہے کہ شمیم احمد شمیم کانگریس میں شامل ہو رہے ہیں۔ بعض افواہ بازوں نے "ہو رہے ہیں" کو "ہو گئے ہیں" قرار دیکر اس حادثے پر مزید قیاس آرائیوں کے دروازے بھی کھول دئے ہیں۔ شمیم صاحب کے ایک ووٹر نے ان تمام افواہوں کو مصدقہ خبروں کا درجہ دے کر یہ نتیجہ بھی اخذ کر لیا کہ شمیم صاحب منسٹر ہونے والے ہیں۔ اُنہوں نے بڑے رازدارانہ لہجے میں مجھ سے کہا " آپ کو معلوم ہی نہیں، سمجھوتہ ہو گیا ہے، اگلے جمعہ کو شمیم صاحب اپنے عہدے کا حلف لینے والے ہیں"۔ "آئینہ" کے بہت سے قارئین نے چراغ بیگ کے نام اپنے خطوط میں اس خبر نما افواہ پر مسرت اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے مجھے اس شک میں مبتلا کر دیا کہ کہیں ہو نہ ہو یہ بات صحیح ہو اور مجھے ہی علم نہ ہو۔ جب بہت سے لوگ اظہارِ تعزیت کے لئے چراغ بیگ کے گھر آنے لگے، تو شک یقین میں بدلنے لگا۔ چراغ بیگ شمیم صاحب کے کانگریس میں شامل ہونے یا بقول کسے وزیر ہونے پر ناراض نہیں تھا، لیکن اُسے اس بات کا افسوس ضرور تھا کہ اُنہوں نے اُس سے پوچھے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کیوں کر لیا؟ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اس سانحۂ عظیم پر کس طرح اپنا ردِّ عمل ظاہر کروں کہ کسی نے یہ اطلاع دی کہ شمیم صاحب جموں سے سری نگر آ گئے ہیں۔ شمیم صاحب کی اس غیر متوقع آمد کو بھی میں نے "کانگریس اور منسٹر" والی افواہ سے جوڑ دیا اور میں سمجھا کہ وہ اب اپنے حلقۂ انتخاب کے سادہ لوحوں سے اپنے فیصلے کی تصدیق کروانے کے لئے آ گئے ہیں۔ کچھ دیر بعد جب اُن سے

ملاقات ہوئی تو میں نے ایک زہر خند کے ساتھ انہیں مبارکباد دی۔

"مبارکباد ؟ کس چیز کی مبارکباد ؟" شمیم صاحب نے مسکراتے ہوئے پوچھا اور میں نے اُن کی مسکراہٹ کا ترجمہ یوں کیا۔ کہ جو کچھ میں نے سُنا ہے صحیح ہے۔

"کانگریس میں شامل ہونے کی، وزیر بننے کی اور کس چیز کی"۔ میں نے جل بھن کر کہا۔

"اچھا تو یہ افواہ یہاں بھی پہنچ گئی ہے۔ کم بخت یہ افواہیں اپالو۸ سے بھی زیادہ برق رفتار واقع ہوئی ہیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ جموں میں اُڑی تھی اور وہیں دفن بھی ہو جائے گی۔ حیرت یہ ہے کہ تم نے اس افواہ پر یقین کیسے کر لیا"۔ شمیم صاحب نے شکایت کے انداز میں پوچھا۔

"آپ ہی نے تو ایک بار کہا تھا کہ اس شہر کی افواہیں خبروں سے زیادہ معتبر، مستند اور محترم ہوتی ہیں"۔ میں نے اپنی صفائی پیش کی۔

"میری ہر بات کو حرفِ آخر سمجھ کر قبول نہ کیا کرو، میرے بہت سے اندازے مفروضے اور فارمولے غلط ثابت ہو گئے ہیں اور ویسے بھی ہر قاعدے میں ایک استثنار ہوتا ہے۔ اور میرے بارے میں اُڑی ہوئی ہر افواہ کو استثنار سمجھ کر نظر انداز کیا کرو۔ شمیم صاحب نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"لیکن اصل بات کیا ہے، یہ افواہ کچھ دنوں سے اس شدّت کے ساتھ گشت کر رہی ہے کہ اس پر یقین نہ لانا مشکل ہو گیا"۔ میں نے شمیم صاحب سے رازدانہ لہجے میں کہا اور میرے اس سوال کے جواب میں اُنہوں نے جو کچھ کہا، میں اُسے حرف بحرف آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

"دراصل ہمارا معاشرہ اس درجہ بے ایمان، بددیانت اور کورپٹ ہو گیا ہے کہ یہاں ایمانداری، خلوص یا ایثار جیسی اصطلاحیں محض ایک تکلف ہو کر رہ گئی ہیں۔ اہلِ سیاست کے کردار نے سیاستدانوں کا اعتبار کھو دیا ہے اور عوام کی ریاکاری نے رائے عامہ کا وقار کم کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ہر انسان کی نیّت، اس کا خلوص اور اس کا ایثار مشکوک بن کر رہ گیا ہے۔ اکثر لوگ میرے بارے میں یہ سوچتے ہوں گے کہ میں اس لئے حکومت یا کانگریس کی مخالفت کرتا ہوں کہ حکومت میری مخالفت سے تنگ آکر مجھے اپنے اقتدار میں شریک بنا لے۔ ان لوگوں کے لئے یہ

یقین کرنا مشکل ہے کہ بے ایمانی اور ریا کاری کے اس دور میں بھی کچھ لوگ خلوصِ نیّت کے ساتھ کچھ اعلیٰ مقاصد کو سامنے رکھ کر جد و جہد کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر شخص کے بارے میں یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ اس کا اصل اور آخری مقصد اقتدار حاصل کرنا ہے اور بس۔ ویسے ان لوگوں کا بھی کوئی قصور نہیں، اکثر لوگوں کے طرزِ عمل اور طریقِ کار نے انکے شبہات کو تقویت پہنچائی ہے اور یہی وجہ ہے کہ میرے بارے میں بھی کبھی کبھی یہ افواہیں اُڑتی ہیں کہ میں کانگریس میں شامل ہو رہا ہوں یا وزیر بنایا جا رہا ہوں۔ کانگریس میں شامل ہونا بہت آسان ہے لیکن میرے لئے یہ اتنا ہی مشکل ہے جتنا شیخ محمد عبداللہ کا جن سنگھ میں شامل ہو جانا یا خواجہ غلام محمد صادق کا محاذ رائے شماری میں۔ باقی رہا وزیر بننا، یہ اپنے بس کی بات نہیں، لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر میرے بس کی بات بھی ہو تو میں صرف وزیر بننے کی خاطر وزیر بننا کبھی قبول نہ کروں گا۔ میرے سامنے واقعی کچھ بلند مقاصد اور ایک نصب العین ہے۔ مجھے جب تک اس بات کا یقین نہ ہو جائے کہ میرے اقتدار میں شرکت کرنے سے ان مقاصد اور اس نصب العین کو تقویت پہنچ سکتی ہے۔ میں اقتدار کے قریب نہیں پھٹکوں گا۔ اور ابھی تک صورتِ حالات میں کوئی ایسی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔ جو مجھے اپنے موقف کو بدلنے کی ترغیب دے سکے۔

مجھے اپنے بارے میں کوئی زعم نہیں ہے لیکن یہ اعتماد ضرور ہے کہ اقتدار کی چکاچوند سے میری آنکھیں کبھی خیرہ نہیں ہوتی ہیں۔ میری آنکھوں نے اقتدار کا انجام دیکھا ہے اور اس سے ان کی بصیرت بڑھ گئی ہے۔

(مارچ ۱۹۶۹ء)

"دی بائبل" اور معترضین!

پچھلے ہفتے شہر میں ایک شہرہ آفاق انگریزی فلم "دی بائبل" کی نمائش نہ ہوسکی، اسلئے کہ "کچھ" مسلمانوں کو اس کی نمائش پر اعتراض تھا۔ اور وجہ اعتراض یہ کہ فلم میں حضرت آدم ؑ، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاء کرام کے کردار پیش کئے گئے ہیں۔ یہ فلم یورپ، امریکہ، فرانس، جاپان اور جرمنی کے علاوہ ایران، ترکی، مصر، عراق اور ہندوستان میں دکھایا جاچکا ہے۔ اور فنی اعتبار سے اسے ایک اول درجے کی تخلیق کا رتبہ حاصل ہے۔ دنیا کے کسی شہر حتیٰ کہ افریقہ کے جنگلوں میں کسی شخص نے اس فلم پر وہ اعتراض نہیں کیا جو سرینگر کے چند "ضرورت سے زیادہ مسلمانوں" نے فلم کی نمائش روکنے کے لئے کیا۔ اور باوجود اس کے کہ مسلمانوں کی اکثریت اس معاملے میں بالکل غیر جانبدار تھی، سنیما والوں نے چند اشخاص کے احتجاج کو عامۃ الناس کے احتجاج سے تعبیر کر کے فلم کی نمائش کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور اس طرح سرینگر ہی نہیں وادی بھر کے لوگ ایک اچھا فلم دیکھنے سے محروم رہ گئے۔

چراغ بیگ کو اس بات کا غم نہیں ہے کہ شہری لوگ بین الاقوامی معیار کا ایک بہت ہی اچھا فلم دیکھنے سے محروم رہ گئے، کیونکہ اس بدقسمت شہر کے بدقسمت لوگ دنیا کی ہر اچھی چیز سے محروم ہیں۔ اُسے افسوس ہے تو اس بات کا کہ ایک بالکل بے ہنگم اور بے معنی اعتراض کی بنا پر فلم کی نمائش نہ ہوسکی اور سنیما والوں نے محض کچھ تنگ نظر اور ناعاقبت اندیش معترضین کو مسلمانانِ کشمیر کی آواز سمجھ کر ان پر یہ اتہام تراشنے کا موقع دیا کہ یہاں کے مسلمان دنیا بھر کے مسلمانوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ پسماندہ، تنگ نظر اور

اور قدامت پسند ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصویر یا ان کی شبیہ رکھنا یا دیکھنا منع ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خود حضور نے اسے منع فرمایا ہے اور مسلمانوں کے دل میں آج ساڑھے تیرہ سو سال بعد بھی نبی پاک کے تئیں اتنی گہری عقیدت اور احترام کا جذبہ پایا جاتا ہے کہ کوئی مسلمان اپنے پاس ان کی تصویر یا شبیہ رکھنا تو درکنار کسی دوسرے کے ہاتھ میں دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ اس لئے جب بھی کبھی کسی غیر ملکی رسالے نے آنحضورؐ کی تصویر چھاپنے کی جسارت کی تو ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں نے اس کے خلاف زبردست احتجاج کیا ہے۔ مسلمانوں کا یہ احتجاج بجا ہے یا نہیں؟ اس وقت یہ میرا موضوع نہیں ہے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ فلم "دی بائبل" میں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ذکر نہ تھا، نہ ان کا کردار پیش کیا گیا تھا، نہ ان کے کسی صحابہ کا، پھر اس کی نمائش پر چیں بہ چیں ہونے کا سوال کیونکر پیدا ہوا۔ کیا سری نگر کے مسلمانوں نے ایک لاکھ ۲۴ ہزار انبیاء کرام کی حرمت اور ان کے تقدس کی حفاظت کا ٹھیکہ لیا ہے؟ کیا وہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنے مذہب کی پاسداری کے ساتھ ساتھ عیسائیت کے محافظوں کے فرائض بھی انجام دیں؟ فلم کا موضوع عیسائیوں کی مذہبی کتاب بائبل ہے۔ خود عیسائیوں نے یہ فلم بنایا ہے۔ اور تمام عیسائی دنیا میں اس کی نمائش کر کے دادِ تحسین وصول کی ہے۔ انہیں نہ فلم بنانے والوں پر کوئی اعتراض ہے اور نہ دیکھنے والوں پر لیکن سرینگر کے کچھ نازک مزاجوں کو فلم کی نمائش پر سخت اعتراض ہے۔ اس لئے کہ اس میں حضرت آدمؑ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور کچھ دیگر انبیاء کرام کو دکھایا گیا ہے۔ اگر اعتراض کرنے والے "باغیرت" مسلمانوں کو فلم سازوں کی یہ "ناپسندیدہ حرکت" مرغوب نہ تھی تو انہیں زیادہ سے زیادہ اپنی اور اپنے خاندان کی نجات کا سامان کرنا چاہیئے تھا۔ اور اپنے گھر میں یہ سرکلر جاری کرنا چاہیئے تھا کہ خبردار! کسی نے یہ بےہودہ فلم دیکھا۔ لیکن ہوا یہ کہ انہوں نے شہر کی ساری آبادی کے ایمان اور نجات کا ٹھیکہ لے کر فلم کی نمائش ہی روک دی۔ یہی معترضین اس سے پہلے حضرت سلیمانؑ، ملکہ صبا، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ کے متعلق فلم دیکھ چکے ہیں لیکن آج انہیں یاد آیا کہ "دی بائبل" کے

کے نام پر ایمان کی نمائش اور اپنی قوت کی آزمائش کا موقع ہاتھ آیا ہے اور اسے ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیئے۔

چراغ بیگ کو حیرت اس بات پر نہیں ہے کہ کچھ لوگوں نے اعتراض کیا، حیرت اس بات پر ہے کہ سرینگر کے درجن ڈیڑھ درجن علماء میں سے کسی کو یہ ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اعتراض کرنے والوں سے یہ پوچھتا کہ، ان کے اعتراض میں اسلام کتنا ہے اور خود نمائی کتنی ہے؟ علماءِ کرام نے اس خاموشی سے اعتراض کو سُنا، کہ ہم جیسے لوگوں کو بھی یہ شبہ ہونے لگا کہ ہو نہ ہو اس اعتراض میں کوئی وزن ہو۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ یہ سوال ایک فلم کی نمائش کا نہیں، اُصول کا ہے۔ اور اس اُصول کا تعلق مسلمانوں کی موجودہ معاشرت سے ہے۔ ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ ہماری ذہنی قیادت کن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ کیا ہم اس بیسویں صدی کے آخر میں جبکہ دنیا چاند پر کمندیں ڈال رہی ہے۔ دقیانوسی اور فرسودہ خیالات کے بتوں کو اپنے سینے سے چمٹائے رہیں گے؟ کیا کشمیر کا مسلمان صرف فلموں کی نمائش پر اعتراض کر کے ہی اپنی مسلمانی کا ثبوت دے سکتا ہے؟ کیا اس کی قدامت پرستی اور تنگ نظری کو صرف اس لئے گوارا کیا جائے گا کہ اس کے خلاف آواز بلند کرنے سے بڑے بڑے رہنماؤں کی مقبولیت میں کمی ہونے کا اندیشہ ہے۔ کسی کو آگے بڑھ کر حق بات کہنا ہی پڑے گی۔ ورنہ ہم آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہی کی طرف لڑھکتے جائیں گے۔

"دی بائبل" کی نمائش رکوا کر ہم نے غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر گاؤکشی پر پابندی عائد کرنے کا جواز پیدا کر لیا ہے۔ ہندوؤں کا دعویٰ ہے کہ گائے ان کیلئے متبرک ہے اور وہ اس کی قربانی گوارا نہ کریں گے۔ ہم کہتے ہیں کہ گائے آپ کے لئے متبرک ہے، آپ اس کو ذبح نہ کیجیے۔ لیکن ہمیں کیوں روکتے ہو ہمارے لئے تو متبرک نہیں ہے۔ دنیا تو ہم سے یہ کہے گی کہ اگر آپ انبیاء علیہم السلام کو پردۂ سیمیں پر نہیں دیکھ سکتے ہیں تو نہ دیکھئے، لیکن ہم تو دیکھنا چاہتے ہیں، ہمیں دیکھنے دیجیے۔ اگر فلم "دی بائبل" کی نمائش روکنا مستحسن ہے تو یقیناً گاؤکشی پر بھی پابندی قائم رہنا چاہیئے۔

(۱۰ رمئی ۱۹۶۹ ء)

کارِ مکاں دراز ہے.........

چراغ بیگ کا شمار ان بدقسمتوں میں ہوتا ہے جو کرایوں کے مکان میں جنم لے کر
پرایوں کے قبرستان میں دفن ہوتے ہیں۔ وہ ساری زندگی ایک مکان کی تعمیر کا خواب
دیکھتے رہتے ہیں اور پھر حسرتِ تعمیر لئے راہی ملکِ عدم ہو جاتے ہیں۔ خواب دیکھنے کے
لئے چونکہ میونسپلٹی کی اجازت نہیں لینا پڑتی۔ اس لئے یہ ناچیز کمترین پچھلے کئی سال سے
اپنے لئے ایک مکان تعمیر کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ لیکن پچھلے ہفتے ایک ایسا سانحہ پیش آیا
کہ یہ خواب بھی چکنا چور ہو گیا۔ اب نہ مکان بنانے کی حسرت ہے اور نہ آرزو، بلکہ ان لوگوں پر
رحم آنے لگا ہے کہ جو اس شہر میں مکان بنانے کی جسارت بلکہ حماقت کرتے ہیں۔ ہوا یہ کہ میرے
ایک عزیز کو مکان بنانے کی سُوجھی (جو سُوجھی بھی تو کس قیامت کی سُوجھی) اُنھوں نے میونسپلٹی سے
مکان کی تعمیر کے لئے اجازت حاصل کرنے کی ذمہ داری مجھے سونپ دی۔ اور میں نے سفر کی مشکلات
کا اندازہ کئے بغیر یہ ذمّہ داری قبول کر لی۔ اس وقت مجھے یہ اندازہ نہ تھا کہ اِس بظاہر معمولی
سے کام کیلئے مجھے کیا کیا ہفت خوان طے کرنا ہونگے اور میونسپلٹی سے نقشہ منظور کروانا کس درجہ
جان جوکھوں کا کام ہے۔ اب جبکہ پندرہ دن کی جہدِ مسلسل کے بعد مجھے اپنے مقصد میں کامیابی
ہو گئی ہے۔ میں ساری دنیا مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ اِس شہر میں رہ کر جو چاہو کرو، مکان
بنانے کی حماقت نہ کرنا، میونسپلٹی اور حکومت نے مل کر مکان کی تعمیر کو اس درجہ مشکل بلکہ ناممکن
بنا دیا ہے کہ ایک معمولی مکان تعمیر کرنے کے لئے چالیس پچاس ہزار روپے کے علاوہ صبرِ
ایوبؑ اور عمرِ خضر کی بھی ضرورت ہے۔ چراغ بیگ بڑا بارسوخ آدمی ہے، ہر دفتر میں اس کی

بڑی آؤبھگت ہوتی ہے اور جو کام عام طور پر ایک مہینے میں ہو جاتا ہے، وہ اس کی وجہ سے ایک دن میں طے پا تا ہے۔ افسر لوگ اس سے بے حد خائف رہتے ہیں اور اس کی ناز برداریاں کرتے ہیں۔ اس کے باوجود اُسے مکان کا نقشہ حاصل کرنے میں پورے پندرہ دن صرف ہو گئے۔ اُن لوگوں کا خیال کیجئے کہ جنہیں دفتروں میں کوئی نہیں جانتا، جن کو نہ افسر خاطر میں لاتے ہیں اور نہ کلرک، جن کی فریاد سُننے کے لئے نہ میونسپلٹی کے ایڈمنسٹریٹر کو فرصت ہے اور نہ ٹاون پلینر کو۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو میونسپلٹی سے نقشے کی منظوری حاصل کرنے میں کم از کم دو سال صرف کرنے پڑتے ہیں۔ میں نے جب کسی سے شکایت کی کہ مکان کا نقشہ حاصل کرنے کے لئے مجھے پندرہ دن صرف کرنے پڑے تو وہ حیرت سے میری طرف دیکھ کر کہتا "صرف پندرہ دن بڑے خوش قسمت ہیں آپ۔ ہم لوگوں کو دو سال کے بعد بھی اجازت مل جائے تو ہم اُسے اپنی خوش نصیبی سمجھتے ہیں۔" ان دو سالوں کے اندر کیا ہوتا ہے۔ اس کی مختصر سی روداد سُن لیجئے:۔

سب سے پہلے نقشہ نویس سے بلڈنگ پلان کی چار کاپیاں بنوائیے، اس کے بعد سائیڈ پلان کی چھ کاپیاں تیار کروا کر میونسپلٹی کے دفتر پہنچ جائیے۔ میونسپلٹی میں متعلقہ کلرک کے پاس جا کر اپنی درخواست بمعہ نقوش پیش کیجئے۔ فیس داخلہ چار روپے بھی ساتھ ہی ادا کیجئے۔ اب آپ پندرہ بیس دن کے بعد اپنی درخواست کی خیر خیریت پوچھنے جائیں گے۔ صرف یہ جاننے کے لئے، کہ آپ کی درخواست کا کیا ہوا۔ کلرک متعلقہ کو معمولی سا نذرانہ پیش کیجئے۔ اب میونسپلٹی بلڈنگ انسپکٹر کی باری ہے۔ وہ درخواستِ نقشہ اپنے پاس رکھ لے گا اور جب تک آپ اس کی خدمت نہ کریں وہ موقع ملاحظہ کر کے اپنی رپورٹ نہیں دے گا۔ بلڈنگ انسپکٹر کو آمادہ کرنے، اُسے اپنے ہاں مدعو کرنے، مناسب رپورٹ لکھوانے اور رپورٹ سمیت دفتر میں دوبارہ پیش کرنے پر کم از کم چار مہینے اور پچاس ساٹھ روپے صرف ہوتے ہیں۔ اب اس کے بعد میونسپلٹی اس نقشے کو ٹاون پلینر کے پاس بھیجتی ہے میونسپلٹی سے ٹاون پلینر تک پہنچنے میں کم از کم ایک مہینے کا عرصہ درکار ہو گا۔ اب آپ ٹاون پلینر کے دفتر کا طواف شروع کیجئے۔ ٹاون پلینر صاحب جب تک بہ نفسِ نفیس موقع ملاحظہ نہیں کرتے، وہ رپورٹ نہیں لکھیں گے۔ وہ چونکہ بے حد مصروف آدمی ہیں۔ اس لئے یہاں آپ

کو کچھ دیر انتظار کی زحمت اُٹھانا پڑے گی۔ زیادہ نہیں صرف دو تین ماہ۔ ٹاون پلینر صاحب نے موقع ملاحظہ کیا۔ اور اگر آپ خوش قسمت ہیں، تو مناسب رپورٹ بھی لکھ دی۔ ورنہ معاملہ یہیں پر رُک جائے گا! وہ نون میں کوئی بھی نکتہ پیدا کر سکتے ہیں۔ خدا خدا کر کے یہاں سے فراغت ہو گئی، تو اب ایگزکٹو انجنیر ڈرینج کے دفتر میں چلے جائیے کہ اب اُنہیں موقع ملاحظہ کرنا ہے۔ اِس دفتر میں بھی بہت سے کام ہیں۔ اس لئے جب تک انجنیر صاحب کو اور ضروری کاموں سے فرصت نہ ہو۔ آپ انتظار کیجئے۔ زیادہ نہیں، ایک ڈیڑھ ماہ۔ آپ کی خوش قسمتی کہ ایک دن انجنیر صاحب کو فرصت مل ہی گئی۔ انہوں نے جائے واردات پر جاکر اپنی رپورٹ مرتب کر دی۔ اب اپنا کیس لے کر واپس میونسپلٹی کے دفتر میں پہنچ جائیے۔ آدھی منزل طے ہو گئی۔ اب یہ کیس ڈپٹی ڈائریکٹر ہیلتھ کے پاس جائے گا۔ ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب کے پاس اتنا کام ہے کہ انہیں سر کھجانے کو فرصت نہیں۔ ان کے ذمے وادی بھر کے ہسپتالوں کی نگرانی، ادویات کی تقسیم، ڈاکٹروں کی تبدیلی اور کمپونڈروں کی ترقی کا کام ہے۔ آپ کے مکان سے انہیں کیا دلچسپی۔ بہر حال جب فرصت مل جائے گی وہ موقع ملاحظہ کریں گے۔ آپ انتظار کیجئے۔ زیادہ نہیں ایک ڈیڑھ ماہ! ڈپٹی ڈائریکٹر ہیلتھ سے ”سب ٹھیک ہے“ کا سرٹیفکیٹ حاصل کر کے اب آپ کو چیف انجنیر پی۔ ڈبلیو۔ ڈی، کے پاس جانا ہے۔ ان کی مصروفیت کا یہ عالم ہے کہ وہ دفتر میں بیٹھ ہی نہیں سکتے۔ ان پر اتنی ذمہ داریاں ہیں کہ وہ خود تو موقع ملاحظہ کرنے جا ہی نہیں سکتے۔ اب ان کے دفتر سے آپ کو متعلقہ ڈویژن میں جانا پڑے گا۔ یہاں اسسٹنٹ انجنیر اور اُورسیر کی خوشامد میں صرف دو تین مہینے صرف ہوں گے۔ جوں توں کر کے یہاں سے چیف انجنیر کے دفتر میں واپس پہنچا تو اب اس بات کا انتظار کیجئے کہ چیف صاحب کب اس رپورٹ پر اپنے دستخط ثبت کرتے ہیں یہاں سے کیس پھر میونسپلٹی میں جائے گا اور اب میونسپلٹی اپنی تحقیقات شروع کر دے گی۔ اب میونسپل انجنیر معاملے کی چھان بین کرے گا اور موقع ملاحظہ کر کے اپنی رپورٹ لکھے گا۔ اس کے بعد ہیلتھ آفیسر صاحب موقع پر جائیں گے اور اپنی رپورٹ لکھیں گے اور تب کہیں جاکر کا غذات سیکریٹری صاحب کے پاس پہنچیں گے۔ اور آپ نے زندگی

میں کوئی نیکی کی ہو تو اس کے صدقے میں آپ کے نقشے کو منظور کیا جائے گا۔ لیکن باون روپے ضرب ڈبل شاہی بطورِ فیس وصول کرنے کے بعد!

میں نے بہت مختصر طور پر اس سفر کی روداد لکھی ہے۔ ورنہ عملاً یہ سفر اتنا طویل اور کٹھن ہے کہ اس کی مفصل روداد لکھنے بیٹھوں تو ایک کتاب تیار ہوگی۔ سوال صرف یہ ہے کہ کیا نقشہ منظور کرنے کا اختیار صرف ایک ادارے۔ میونسپلٹی یا ٹاؤن پلینر کو نہیں سونپا جا سکتا تھا؟ لیکن ایسا کرنے کے لئے عقلِ سلیم اور خلوصِ نیّت کا ہونا ضروری اور موجودہ حکمرانوں کے پاس یہی دو چیزیں نہیں ہیں!

(۲۵ مئی ۱۹۶۹ء)

تارہ بل سے اپالو ۱۱ تک

عین اُس وقت جبکہ تین امریکی خلاباز چاند سے صرف نو میل کی دوری پر، چاند کی تصویریں لے رہے تھے۔ سری نگر میں تارہ بل کے مقام پر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں اس بات پر لڑ رہے تھے کہ جلوس میں کس کا علم سب سے آگے رہے گا۔ یوں کہیئے کہ جب امریکہ اور روس کے درمیان اِس بات پر مقابلہ ہو رہا تھا کہ چاند پر سب سے پہلے کون پہنچے گا۔ سرینگر کے مسلمانوں کے سامنے یہ سوال تھا کہ تارہ بل کے پُل پر سے پہلے کون گذرے گا۔ چاند پر انسان کے اُترنے کے امکانات کا جائزہ لے کر اپالو ۱۱ کے تینوں خلاباز چار لاکھ میل سے زائد فاصلہ طے کر کے بخیر و عافیت زمین پر اُتر گئے ہیں۔ لیکن عیدگاہ سے تارہ بل سفر میں چار قیمتی جانیں تلف ہو گئیں۔ تارہ بل کے سانحے کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو ہے پولیس کی زیادتی اور ڈیوٹی پر تعینات مجسٹریٹ کی بدحواسی کا، اس کے متعلق سرکار نے مکمل تحقیقات کا وعدہ کیا ہے۔ اور چراغ بیگ کو امید ہے کہ یہ تحقیقات جلد از جلد مکمل کی جائے گی۔ دوسرا پہلو ہے مسلمانوں کی ذہنی، فکری، تہذیبی اور مذہبی پسماندگی کا۔ اس پہلو کی طرف کسی نے اشارہ کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ محاذ رائے شماری کے لیڈروں اور دوسرے سرکردہ علماء نے پولیس کی زیادتی کے خلاف احتجاج کر کے اپنا دامن بچانے کی کوشش کی ہے، حالانکہ اصل سوال یہ ہے کہ اس بیسویں صدی میں کشمیر کا مسلمان اس درجہ قدامت پسند، تنگ نظر اور پسماندہ کیوں ہے کہ وہ اس بات پر مرنے مارنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے کہ تارہ بل کے پُل سے پہلے کون گذرے گا؟ چراغ بیگ

کوئی مذہبی عالم یا رہنما نہیں ہے لیکن مسلمان ہونے کے ناطے وہ اپنے سماج اپنے بھائی بندوں اور اپنے ہم مذہبوں کی پسماندگی، جہالت اور قابلِ اعتراض قدامت پسندی سے خاصا پریشان ہے۔ اُسے اس بات کا افسوس ہے کہ بیسویں صدی کے اس دور میں بھی مسلمان ایسی ایسی حرکتیں کرتے ہیں کہ مہذّب دنیا میں ان کی ہنسی اُڑائی جاتی ہے۔

تعلیمی ترقی اور تہذیبی عروج کے اس دور میں جبکہ انسان تسخیرِ فطرت کے ہزاروں سال پُرانے خوابوں کو حقیقت کا روپ دے رہا ہے۔ مسلمان اس بات پر لڑ رہا ہے کہ تارہ بل کے پُل سے پہلے وہ گذرے کا یا کوئی اور! ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے کہ لڑنے والے دونوں ہی مسلمان۔ مسلمانوں کے زوال کی یوں تو بہت سی وجوہات ہیں لیکن میرے نزدیک سب سے اہم وجہ ایسے باکردار، بلند اخلاق اور جرأت مند رہنماؤں کا عدم وجود ہے جو مصلحتوں اور نزاکتوں سے بلند ہو کر اس قوم کو اپنی ذلّت، اخلاقی پستی، تہی مائگی اور قدامت پسندی کا احساس دلائیں۔ اپنی ذاتی عافیت اور مقبولیت کی قیمت پر بھی مسلمانوں کو یہ بتائیں کہ وہ مذہب کے نام پر گمراہ ہو رہے ہیں اور انہیں مذہب کی اصلیت، عظمت اور اُس کے تاریخی رول سے آگاہ کریں۔ آج امریکہ کے عیسائی اور روس کے کافر، تو چاند پر سب سے پہلے پہنچنے کی دوڑ میں مصروف ہیں۔ اور مسلمان توہمات، روایات اور طلسمات کے چکر میں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لئے بے چین نظر آتے ہیں۔ یہ زوال پذیر معاشرے کی نشانی اور مسلمانوں کے تہذیبی زوال کی علامت ہے اور جب تک مسلمانوں کے علماء، اُنکا دانشور طبقہ، ان کے سیاسی رہنما اخلاقی جرأت سے کام لیکر توہمات، تنگ نظری، ماضی پرستی اور تعلیمی پسماندگی کے خلاف جہاد نہ کرینگے اس قوم کی حالت سُدھرنے کی بجائے بگڑتی ہی جائے گی اور اُن پر یہ مصرع صادق آئے گا ع گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا!

تارہ بل کے سانحہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ مشرق و مغرب کے درمیان ہزاروں میلوں کا ہی نہیں کئی سو صدیوں کا فاصلہ ہے۔ جب وہ لوگ چاند پر پہنچ کر نئی بستیاں آباد کر رہے ہوں گے ہم لوگ تارہ بل کے پُل پر "پہلے کون" کے سوال پر جھگڑتے ہونگے۔ اقبال نے ٹھیک ہی کہا ہے ؎

حقیقت خرافات میں کھو گئی   یہ اُمّت روایات میں کھو گئی

(۷ رجون ۱۹۶۹ء)

ہدایت نامۂ ممبرانِ اسمبلی

نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو شادی خانہ آبادی کے اسرار و رموز سمجھانے کے لئے 'ہدایت نامۂ خاوند' اور 'ہدایت نامۂ بیوی' جیسی بہت سی کتابیں بازار میں عام ملتی ہیں۔ لیکن اسمبلی کی ممبری کے خواہشمند نوجوانوں اور بزرگوں کو آنے والے حادثات سے باخبر رکھنے کے لئے اس شہر میں "ہدایت نامۂ ممبر اسمبلی" نام کی کوئی کتاب موجود نہیں۔ اور اب جبکہ انتخابات اور ضمنی انتخابات قریب تر آ رہے ہیں۔ اور بہت سے بالغ، بچے اور نابالغ بزرگ ممبر اسمبلی بننے کے لئے لنگر لنگوٹے کس رہے ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ ان خواہشمند حضرات کو آنے والے خطرات سے آگاہ کرنے کے لئے "ہدایت نامہ ممبران اسمبلی" کے عنوان سے چند سطریں قلمبند کی جائیں تاکہ یہ لوگ بہت سے ممبران اسمبلی کی طرح یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں خبر نہ تھی! ہمارا روئے سخن براہِ راست اُن اُمیدواروں سے ہے جو ریٹرننگ افسر کی بے ایمانی سے یا اس کے باوجود اپنی بدبختی کی بنا پر انتخاب میں کامیاب ہو کر ممبر اسمبلی بن جاتے ہیں۔ اگرچہ اس سے وہ خوش بخت نامراد بھی فیض (بلکہ لطف) اُٹھا سکتے ہیں کہ جن کی امیدواری پر ریٹرننگ افسر یا ووٹروں نے پانی پھیر دیا ہو۔ تو لیجئے ہدایت نامۂ ممبران اسمبلی پیشِ خدمت ہے!

قطع نظر اس کے کہ آپ کسی سیاسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں، یا مادر پدر آزاد قسم کے ممبر ہیں۔ انتخابات جیتنے کے لئے آپ کو اپنے ووٹروں سے کچھ وعدے کرنے پڑیں گے اور اپنی کامیابی کو یقینی بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ بڑھ چڑھ کر وعدے

کریں۔ اپنے مخالف کو شکست دینے کا سب سے کامیاب نسخہ یہ ہے کہ آپ وعدوں کی اس جنگ میں اُسے شکست دیں اور اپنے ووٹروں سے اتنے وعدے کریں کہ وہ آپ کو ہر دُکھ کی دوا اور ہر مرض کا علاج سمجھنے لگیں۔ منتخب ہونے کے فوراً بعد آپ ان وعدوں کو بھولنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن آپ کا ووٹر آپ کو ایک بھی وعدہ بھولنے نہیں دیگا۔ وہ پورے پانچ سال تک آپ کو آپ کی ہر بات یاد دلاتا رہے گا۔ آپ ساری دُنیا سے بھاگ سکتے ہیں اپنے ووٹروں سے نہیں بھاگ سکتے۔ انتخاب لڑتے وقت آپ کا خیال تھا کہ آپ کو اس ملک کی تقدیر سنوارنے کے لئے بڑی معرکہ خیز جنگیں لڑنا ہوں گی۔ اور آپ نے اپنے ووٹروں سے وعدہ کیا تھا کہ ان فیصلہ کُن جنگوں میں آپ ہمیشہ عوام کا ساتھ دینگے لیکن ممبر اسمبلی بننے کے فوراً بعد آپ کو یہ اندازہ ہوجائے گا کہ آپ کا ووٹر آپ سے ملک اور قوم کی خدمت کا نہیں، اپنے حلقۂ انتخاب، اپنے محلے بلکہ اس کے گھر کی خدمت کا طلبگار ہے۔ وہ آپ کو اپنا ممبر اسمبلی نہیں، اپنا چیف منسٹر سمجھتا ہے۔ اور اس کے خیال میں آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ اس بات کا خیال رکھئے کہ آپ کے ہر ووٹر کے کم از کم دو مسئلے ایسے ہیں جو فوری حل چاہتے ہیں اور اس طرح اگر آپ کے حلقۂ انتخاب میں ۲۷ ہزار ووٹر ہیں تو آپ کے سامنے ۵۴ ہزار مسئلے ہیں اور اگر آپ اس حلقۂ انتخاب سے دوبارہ منتخب ہونا چاہیں تو آپ کو کم از کم پچاس ہزار مسائل کو حل کرنا پڑے گا۔ صحیح صورت حال سے باخبر ہونے کے لئے ان انفرادی مسائل کی نوعیت کا اندازہ کیجئے۔

آپ کے ایک ووٹر کا لڑکا تین سال سے آٹھویں جماعت میں فیل ہو رہا ہے۔ اسکو کسی طور پاس کروا دیجئے۔ اور ساتھ ہی اُسے کہیں ملازم کروا دیجئے۔ دوسرا بیٹا محکمہ سوشل ویلفیئر میں کلرک ہے، اُسے جنگلات میں فارسٹ گارڈ لگوائیے۔ ایک ووٹر صاحب کا اپنے دو بھائیوں کے ساتھ جائداد کا جھگڑا چل رہا ہے۔ ان دو بھائیوں نے بقول ووٹر صاحب آپ کو ووٹ نہیں دیا تھا اس لئے آپ اس جھگڑے میں اپنے ووٹر کی حمایت کیجئے۔ اور ان کا حق غصب کرنے میں اس کا ہاتھ بٹائیے۔ ان صاحب کو محکمہ جنگلات سے تین درختان کائرو اور بدلو کا فارم دلوائیے تاکہ وہ یہ لکڑی بازار میں فروخت کرکے چار پیسے کمائیں

ایک ووٹر صاحب کی لڑکی میٹرک میں صرف دس نمبروں کی وجہ سے فیل ہو گئی ہے۔ اس کی ملازمت کا بندوبست کیجئے۔ ایک اور صاحب کے لڑکے نے (جو ہسپتال میں ملازم ہیں) چار ہزار روپے کا غبن کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو ٹیلی فون کیجئے کہ وہ چشم پوشی کریں۔ ایک صاحب کا مقدمہ عدالت سیشن میں آج چار سال سے چل رہا ہے ان کے لئے جج صاحب کے نام ایک سفارشی خط لکھ کر دیدیجئے کہ فیصلہ بہرحال ان ہی کے حق میں ہو۔ ایک اور ووٹر صاحب کا لڑکا آپ نے پچھلے ماہ ملازم لگوایا تھا، اُسے اپنے گھر سے تین میل کی دوری پر تعینات کیا گیا ہے۔ بے چارے کی صحت خراب ہو گئی ہے۔ تین میل چلتے چلتے۔ اُسے کسی طرح اپنے گھر کے قریب تبدیل کروائیے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر اُسے جنگلات میں ملازم کروا دیجئے (اس کے بعد دس میل چلنے سے بھی اس کی صحت پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔)

ایک ووٹر صاحب کی بہو کو اس کا باپ ورغلا کر گھر لے گیا ہے اور وہ کسی دوسری جگہ اس کی شادی کرنا چاہتا ہے۔ آپ پولیس تھانے چل کر باپ کے خلاف وارنٹ جاری کروا کر ووٹر صاحب کی بہو کو برآمد کر دیجئے۔ ووٹر صاحب کا لڑکا حد درجہ نالائق، نکما اور نکھٹو ہے لیکن اس کے باوجود اس کی بیوی کو اس کے ساتھ رہنے پر راضی کیجئے۔ بحیثیت ممبر اسمبلی یہ آپ کا کام ہی نہیں، فرض ہے۔ ایک ووٹر صاحب کی مالی حالت بہت خراب ہے۔ اُسے دس ہزار کا صنعتی قرضہ دلائیے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ اِس دس ہزار روپے سے اپنی بیٹی کی شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ آپ کا ایک ووٹر ٹھیکیدار ہے اُس نے کسی دفتر میں ٹینڈر دئیے ہیں آپ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے یہ ٹینڈر اس کے حق میں منظور کروائیے۔ آپ کے ووٹر اور ایک افسر کی آپس میں نہیں بنتی، اس لئے افسر کا فوراً تبادلہ کروائیے۔ آپ کا ایک ووٹر دفتر میں سب سے جونیئر کلرک ہے لیکن آپ کسی طرح اُسے ترقی دلا کر سینئر گریڈ میں لے آئیے۔ آپ کے کچھ ووٹروں کو جنگل سے ناجائز لکڑی برآمد کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے آپ فوراً مداخلت کر کے ان کو قانون کے چنگل سے بچائیے بلکہ ہو سکے تو یہ لکڑی بھی ان کے نام واگذار کروائیے۔ آپ کے ووٹروں کے مکانات خستہ حالت میں ہیں۔ آپ کسی قرضے، تقاوی یا دوسری کسی سرکاری امداد کا بندوبست کیجئے۔

آپ کے بہت سے ووٹروں کے نام بہت سے سرکاری قرضے بقایا ہیں۔ آپ کا فرض ہے کہ آپ جب تک ممبر اسمبلی ہیں، اُن کی وصولی نہ ہونے دیں گے۔ یہ اور اسی نوعیت کے ہزاروں مسئلے ہیں کہ جن کو حل کرنے یا نہ کرنے پر آپ کی شہرت ہی نہیں بلکہ آیندہ کامیابی یا ناکامی کا دارومدار ہے اور ظاہر ہے کہ پانچ سال کے عرصے میں آپ پچاس ہزار کیا دس ہزار ایسے مسئلے بھی حل نہیں کر سکتے۔ نتیجہ یہ کہ آپ کو صبح شام اپنے ووٹروں سے گالی کھانا پڑے گی۔ یہ رہے انفرادی نوعیت کے مسائل جنکو حل کرنے کے لئے آپ نے وعدہ بھی نہیں کیا تھا۔ مسائل کی دوسری فہرست اجتماعی نوعیت کے مسائل کی ہے۔ جنکو حل کرنے کے لئے آپ نے لمبے چوڑے وعدے کئے تھے۔

آپ کے حلقۂ انتخاب میں کم از کم ڈیڑھ سو گاؤں تو ہوں گے ہی۔ آپ کو ان ڈیڑھ دو سو گاؤں کو سب سے پہلے بجلی مہیا کرنی ہوگی۔ ہر گاؤں میں نلکوں کا انتظام کرنا ہوگا۔ قصبے سے دیہات کو جانے والی ہر سڑک پختہ اور کشادہ ہونا چاہیئے لیکن آپ کے کسی ووٹر کی زمین اس کی زد میں نہ آنا چاہیئے۔ اور اگر آجائے تو اُسے چار گنا زیادہ معاوضہ مل جانا چاہیئے۔ ہر گاؤں میں کم از کم لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک ایک سکول تو ہونا ہی چاہیئے، اور جب سکول قائم ہو جائے تو پھر ہر سال اس میں ایک کلاس کا اضافہ ضروری ہے۔ دو دو تین تین دیہات میں ایک ایک ہیلتھ سنٹر اور ایک ایک ویٹرنری یونٹ قائم ہونا ضروری ہے۔ ان ہیلتھ سنٹروں پر مرد ڈاکٹر کے علاوہ ایک لیڈی ڈاکٹر بھی موجود ہونا چاہیئے۔ قصبے میں ایک کالج کا قیام بہت ضروری ہے اور اس میں تاخیر کا مطلب یہ ہے کہ ممبر اسمبلی اپنے علاقے کی تعمیر و ترقی میں دلچسپی نہیں لیتا ہے۔ قصبے اور گاؤں سے گذرنے والے ہر دریا کے دونوں طرف ایک اونچا بندھ تعمیر ہونا چاہیئے تاکہ دیہات کو نقصان نہ پہنچے۔ جن پہاڑوں پر لوگ آباد ہیں وہاں پانی پہنچانے کے لئے نہریں تعمیر ہونا چاہئیں۔ جو لوگ بے کار ہیں انہیں کاروبار مہیا ہونا چاہیئے۔ اور اگر حلقۂ انتخاب میں تعلیم یافتہ بے کاروں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ممبر اپنے حلقۂ انتخاب کے مسائل

سے بے نیاز ہے۔ غرض ہر حلقۂ انتخاب اپنے ممبر سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ اپنی پانچ سالہ ممبری کے دوران دس بیس نہیں سینکڑوں سال کے مسائل کو حل کر دے۔ اور ووٹر صاحبان کے خیال میں ممبر، ممبر نہیں پوری حکومت کا نعم البدل ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے اور اگر نہیں کرتا ہے تو نالائق ہے اور نکمّا ہے۔

آپ کی پرائیویٹ زندگی کا اسی دن خاتمہ ہو جائے گا کہ جب انتخابات میں آپ کی کامیابی کا اعلان ہو جائے گا۔ پھر آپ کے گھر کا کوئی کمرہ بلکہ کوئی کونہ آپ کا اپنا نہ رہے گا۔ آپ کے ووٹروں کی ملکیت بن جائے گا۔ صبح، شام، آدھی رات کے وقت بھی آپ کو اپنے ووٹروں کی خدمت کیلئے تیار رہنا ہوگا۔ آپ کے دن کا ایک لمحہ بھی آپ کا اپنا نہیں ہوگا۔ آپ جہاں بھی جائیں آپ کے ووٹر آپ کا تعاقب کریں گے، اگر آپ ان کے اجتماعی مسائل حل کرنے میں کسی حد تک کامیاب بھی ہو جائیں۔ پھر بھی آپ کو اہلیت، دیانت یا اچھی شہرت کا سرٹیفکیٹ نہ ملے گا۔ جب تک کہ آپ ہر ووٹر کا کم از کم ایک ذاتی کام بھی انجام نہ دیں۔ اور ذاتی خدمت کا آسان ترین نسخہ ہے کہ آپ اپنے ووٹر کے مڈل فیل یا میٹرک پاس لڑکے کو ملازم کروا دیجئے۔ اور ہاں اس بات کا بھی خیال رکھئے کہ اگر آپ صرف دس لڑکوں کو ملازم لگوانے میں کامیاب ہو گئے تو پورے دس ہزار ووٹر آپ سے ناراض ہو جائیں گے۔ وہ آپ سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ بیک وقت دس ہزار لڑکوں کو ملازم کروائیے۔ وہ آپ کو ممبر نہیں چیف منسٹر سمجھتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ !

جو لوگ اس امید پر ممبر اسمبلی بننے کے خواہشمند ہیں کہ وہ اسمبلی میں جا کر بڑے بڑے سیاسی مسائل کے متعلق اپنے موقف پر زور دیں گے اور اس طرح اپنے ووٹروں کی تسکین کا سامان کریں گے۔ ان کی خدمت میں گذارش ہے کہ منتخب ہونے کے بعد ان کے ووٹروں کو نہ ان کی سیاست سے دلچسپی ہوگی اور نہ ان کی دیانت سے، انہیں دلچسپی ہوگی تو صرف اس بات سے کہ کتنے مقدموں میں سفارش ہوئی، کتنے لڑکے ملازم لگے اور کتنے دیہات کو بجلی مہیّا کی گئی۔ پچھلے دس بیس سال کے دوران ممبر اسمبلی کے ساتھ اتنی توقعات وابستہ کی جاتی رہی ہیں کہ اب ووٹر حضرات ممبر اسمبلی کو ممبر نہیں، جائز اور ناجائز مطالبات پورا کرنے کی ایک

ایسی مشین سمجھتے ہیں کہ جن کا کوئی ذہن، ضمیر یا اُصول نہیں ہوتا۔
میں نے اس ہدایت نامے میں، صرف اُن ممبران اسمبلی کی بات کی ہے جو دیانتداری سے اپنے فرائض انجام دینے کی خواہش رکھنے کے باوجود ناکام ہو جاتے ہیں۔ ان کا ذکر نہیں کیا ہے کہ جن کے لئے اسمبلی کی ممبری دولت، آسودگی اور عیاشی کا ایک کامیاب ذریعہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں، میں نے راہگیروں کی بات کی ہے، جیب کتروں کی نہیں!

(۲۰ر جون ۱۹۶۹ء)

چاند کے افسانے کی حقیقت

۲۱ر جولائی کی صبح نے ایک نئی دنیا، ایک نئے عہد اور ایک نئے خواب کو جنم دیکر انسانوں کی محدود دنیا کو کچھ نئی وسعتیں عطا کی ہیں۔ اِس روز چاند کے کنوارے اور پوتر سینے پر پہلی بار انسانی قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ اور انسان کا ہزاروں سال پُرانا خواب پورا ہوگیا۔ صبح ایک بج کر ۴۸ منٹ پر جب آرم سٹرانگ اور آلڈرن انسانی تاریخ میں پہلی بار چاند پر اُترے تو ان کے ساتھ دنیا کے کروڑوں انسانوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں اور وہ لوگ بھی ان خلائی مسافروں کی سلامتی کی دُعائیں مانگنے لگے جو دُعا کی تاثیر سے زیادہ فطرت کی تسخیر پر یقین رکھتے ہیں۔ کچھ دیر بعد جب آرم سٹرانگ نے چاند گاڑی اُتر کر چاند کی سطح پر چہل قدمی شروع کر دی، تو اس کے ایک ایک قدم پر ہزاروں سال پُرانی قدریں، تصورات اور مفروضات نچھاور ہوتے رہے۔ چاند کی حقیقت، چاند کے افسانے سے اس درجہ مختلف ہوگی، یہ ہم نے سوچا بھی نہ تھا۔ ہمارے ادب، ہماری دیومالا، اور ہماری دادی اماں نے چاند کو خوبصورتی، معصومیت، رومان اور محبّت کی علامت قرار دیا تھا، ہم چاند سے مکھڑے، چاند سی صورت، چودھویں کا چاند اور چندے ماہتاب کہہ کر اپنے محبوب کے حُسن کو خراج تحسین پیش کیا کرتے تھے۔ اب معلوم ہوا کہ چاند کی سطح پر چٹانوں آتش فشاں پہاڑوں اور ریتیلی مٹّی کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ دادی اماں نے بچپن سے اس فریب میں مبتلا کر دیا تھا کہ چاند کے چہرے پر جو ہلکا سا سایہ نظر آرہا ہے، یہ دراصل ایک بڑھیا کا سایہ ہے جو وہاں بیٹھ کر چرخا کات رہی ہے۔ اب معلوم ہوا کہ یہ ان بڑی بڑی چٹانوں

اور پہاڑوں کا سایہ ہے جو چاند کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں نہ پانی ہے، نہ ہوا اور نہ زندگی کے کوئی آثار۔ آرم سٹرانگ نے انسان کے ایک خواب کو پورا کر دیا لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے خوابوں کے بڑے بڑے تاج محل بھی چکنا چور کر دئے۔ سوچتا ہوں کہ اب شاعر و صورت گر افسانہ نویس اپنی محبوبہ کو کس چیز سے تشبیہ دیں گے۔ کیونکہ اب چاند سی صورت کے معنی یہ ہوں گے کہ محبوب ایک چٹان یا آتش فشاں پہاڑ کی مانند ہے جس کے گرد و پیش میں نہ کچھ اُگتا ہے نہ کچھ اُگنے کا امکان ہے۔

اپنے چہیتوں کو چاند کا ٹکڑا کہنے میں یہ اندیشہ ہے کہ وہ پلٹ کر یہ نہ کہہ دیں کہ:

"زبان سنبھالیئے اپنی، ورنہ ہم سا بُرا کوئی نہ ہوگا۔"!

جن حسینوں کو چودھویں کا چاند کہہ کر اس خوش فہمی میں مبتلا کر دیا تھا کہ ہم ان پر مرتے ہیں (اور انہی کے لئے جیتے ہیں) وہ کہیں اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوں کہ دراصل ہم ان کی بدصورتی کا مذاق اُڑا رہے تھے 'چاند سا بیٹا اور چاند سی بیٹی' کی اصطلاح پر غور کیجئے۔ پھر چاند کی تعریف میں امریکی خلا بازوں کا بیان ملاحظہ کیجئے۔ اور اندازہ کیجئے کہ ۲۰ جولائی اور ۲۱ جولائی کے درمیان کتنا طویل فاصلہ کتنی مختصر مدّت میں طے ہو گیا۔ اس فاصلے کو میلوں کے حساب سے نہیں صدیوں کے فیتے سے ناپا جا سکتا ہے۔ اور پھر یہ سوچئے کہ انسان کی ہوس تسخیر نے کہاں کہاں اپنی کمندیں ڈال دی ہیں۔ ابھی آٹھ سال قبل چاند پر قدم رکھنا تو کجا، چاند کی کشش کے دائرے میں داخل ہونا دیوانے کا خواب معلوم ہوتا تھا۔ آج دیوانوں نے نہ صرف اس خواب کو پورا کر دیا ہے بلکہ بہت سے نئے خوابوں کو بھی جنم دیا ہے۔ اب انسان کی سیمابی فطرت کچھ نئی بستیاں آباد کرنے کی فکر میں ہے اور ہو سکتا ہے کہ چاند کی تسخیر اس کے عزائم کی انتہا نہ ہو، اس کے نئے سفر کا نقطۂ آغاز ہو۔

چاند پر انسان کے اُترنے کا کارنامہ اس درجہ حیرت انگیز اور رونگٹے کھڑا کر دینے والا ہے کہ ابھی تک دنیا حیرت و استعجاب سے دم بخود ہے۔ اور یقین نہیں آ رہا ہے کہ یہ سب کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ آیندہ دس بیس برسوں میں کیا کچھ ہو گا، یہ سوچتے ہوئے تصوّر کے پر جل جاتے ہیں۔ لیکن یہ بے رحم حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ چاند پر کمندیں ڈالنے سے پہلے اگر وہ اپنی دنیا میں بسنے والے ان کروڑوں انسانوں کی زندگی سنوانے کی

نفرت، کدورت اور ہوس کے سینے کا ناسور بن کر اس دنیا کو جہنم بنائے ہوئے ہیں تو اس کے نئے سفر میں ایک مقصد، ایک منزل، ایک افادیت پیدا ہو جاتی، لیکن اُسے اتنی فرصت کہاں؟ وہ تو اپنی ذاتی تسکین کے لیے عالم انسانیت کا گلا گھوٹنے کے لئے بھی آمادہ ہے اور اسی لئے وہ اپنے گردوپیش سے بے نیاز اور اپنی منزل سے ناآشنا صرف اس خیال میں مگن ہے کہ وہ کسی طرح اپنے ساتھیوں اور اپنے رقیبوں سے آگے بڑھے، چاہے آگے کوئی بہت بڑی خندق ہی کیوں نہ ہو۔ اقبال نے اسی خیال کو یوں نظم کیا ہے:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افلاک کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاؤں کو گرفتار کیا
آج تک اپنی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

(۲۱ر جولائی ۱۹۶۹ء)

چھوٹا مُنہ بڑی بات

امریکی خلاباز آرم سٹرانگ اور آلڈرن نے چاند پر اُتر کر تمام دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے اور چہار دانگ عالم میں داد و تحسین کے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ امریکی صدر مسٹر نکسن کو دنیا بھر سے مبارکبادی کے پیغامات موصول ہو رہے ہیں اور دنیا کے تمام بڑے بڑے لیڈروں نے اس موقع پر خصوصی بیانات جاری کئے ہیں جو خاص طور پر اخبارات میں شائع ہو رہے ہیں۔ اور ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہو رہے ہیں۔ چراغ بیگ نے اس عظیم کارنامے کے متعلق کچھ ایسے لوگوں کے تاثرات، بیانات اور پیغامات جمع کئے ہیں جو بدقسمتی سے نہ کسی اخبار میں شائع ہو سکتے ہیں اور نہ کسی ریڈیو سٹیشن سے نشر کئے جا سکتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ لوگ اتنے چھوٹے ہیں کہ ان کے تاثرات کو کسی بڑے اخبار میں جگہ نہیں مل سکتی۔ اسی لئے تیسرے صفحے کے کچھ کالم ان تاثرات کی اشاعت کیلئے وقف کر رہا ہوں کہ بڑے آدمیوں کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے آدمیوں کا ردِ عمل بھی تاریخ کے سینوں میں محفوظ ہو جائے۔

عبدُ الغنی آف پیراماونٹ ہیئر کٹنگ سیلون

" یہ بالکل گپ ہے ایسا ہونا ناممکن ہے، سالے امریکی ساری دنیا کو بیوقوف بنا رہے ہیں۔ مجھے امراکدل سے زینہ کدل جانے میں ڈیڑھ گھنٹہ لگتا ہے، یہ لوگ چاند تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔"

عبدالمجید آف کشمیر موٹر ڈرائیورس ایسوسی ایشن

معلوم نہیں کہ چاند تک بسیں چلانے کے لئے روٹ پرمٹ کون جاری کرے گا؟ اگر یہ کام بھی اپنے ہی محکمۂ ٹرانسپورٹ کے سپرد ہوا تو ہم مارے گئے۔ یہ ٹرانسپورٹ والے اپنے ہی رشتہ داروں پر نظر رکھتے ہیں۔

ماسٹر دینا ناتھ آف ہواند چولگام

کیا عظیم کارنامہ ہے؟ اتنے بڑے کارنامے کے لئے تو پورے ایک ہفتے کی چھٹی منانا چاہیئے تھی۔ یوں سکول کھلنے کے بعد ہم لڑکوں کو اس واقعہ کی اہمیت تو سمجھا سکتے، کیونکہ بغیر چھٹی کے نہ ماسٹر سمجھا سکتا ہے اور نہ لڑکے سمجھ سکتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے ہمارے ہاں آئے دن چھٹی ہوتی ہے لیکن چاند یاترا کی خوشی میں ایک گھنٹے کی چھٹی بھی نہیں دی گئی۔

مولوی نیاز احمد آف کنہ کدل

اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ تیرہ سو سال پہلے قرآن شریف میں اس کا ذکر آیا ہے۔ کم بخت انگریز بڑے چور ہیں۔ انھوں نے یہ سارا راز قرآنِ حکیم ہی سے چرایا ہے۔ خدا تعالیٰ قرآن شریف میں کہتا ہے ....

پنڈت جیوتشی رام آف چنکرال محلہ

(ایک طنزیہ ہنسی ہنس کر) بیوقوف لوگ یوں خوش ہو رہے ہیں کہ جیسے آج پہلی بار انسان چاند پر اُترا ہو، ارے کم بختو! وید اور شاستر پڑھو تو تمہیں معلو ہو جائے گا کہ آج سے ہزاروں سال پہلے یہ کام ہمارے اوتاروں نے انجام دیا ہے۔ وہ تو چندرمان پر چڑھ کر یوں چاند پر آتے جاتے تھے کہ جیسے زینہ کدل سے امیرا کدل اور امیرا کدل سے براڈوے سینما تک جاتا ہوں!

عبد الغفار آف "سینہ گزٹ" سرینگر

سوال یہ ہے کہ چاند پر سکنڈل کا کوئی امکان ہے یا نہیں؟ آرم سٹرانگ کے بیان کے مطابق وہاں نہ آدم ہے نہ آدم زاد۔ چاروں طرف چٹانیں ہی چٹانیں ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اغوا، چوری یا معاشقے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ نہ ہوگا، تو بلیک میلنگ کیسے ہوگی؟ بلیک میلنگ نہ ہوگی تو ہم زندہ کیسے رہیں گے؟ نا بابا! ہماری دھرتی کا کوئی جواب نہیں۔

سلطان شوگہ آف محاذ رائے شماری

ابھی تک صرف تین راستے تھے، ہندوستان، پاکستان یا خود مختار کشمیر، اب چوتھا راستہ بھی کھُل گیا ہے۔ اب ریاست کے چالیس لاکھ عوام کو یہ حق بھی حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ چاند کے ساتھ الحاق کے سوال پر بھی اپنی رائے ظاہر کریں۔ اور بیگ صاحب میری بات مان لیں، تو آنے والے پنچایتی انتخابات میں چاند سے الحاق کا نعرہ بلند کریں۔

جبار چاپری آف عوامی ایکشن کمیٹی

دیکھ لیا آپ نے امریکہ کتنا زبردست ملک ہے! اسی لئے تو پاکستان نے بہت پہلے امریکہ کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اب خدا کے فضل سے امریکہ کشمیر کو ہندوستان سے آزاد کر کے پاکستان کے ساتھ ملانے کے لئے جلد ہی اپنے خلا باز بھیج رہا ہے۔ خدا تعالیٰ امریکہ کو سلامت رکھے اور اس کا سایہ پاکستان پر ہمیشہ موجود رہے۔

جمال گوٹہ آف سٹی کانگریس (صادق گروپ)

امریکی خلا بازوں کی کامیابی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس شور وغل میں کسی کو قاسم صاحب کا نام ہی یاد نہیں رہا۔ میرا خیال ہے کہ چاند کی تسخیر سے قاسم صاحب

کے ستارے بھی گردش میں آگئے ہیں، اور وہ کشمیر کے سیاسی مطلع سے ہمیشہ کے لئے غروب ہو گئے۔

بنٹر تنگا آف پردیش کانگریس (قاسم گروپ)

انسان اگر چاند پر اُتر سکتا ہے تو قاسم صاحب کا دوبارہ پردیش کانگریس کا صدر بننا کیوں ممکن نہیں۔ امریکی خلابازوں کی کامیابی دراصل غلام محمد صادق کے منہ پر ایک زوردار طمانچے کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ صادق صاحب اور ان کے دستِ راست پیر غیاث الدین اپنے آپ کو روسی کمیونسٹ کہتے ہیں۔ جس طرح روسیوں کا خلائی جہاز چاند پر پہنچتے ہی چکنا چور ہو گیا، اسی طرح صادق صاحب کے اقتدار کا جہاز بھی ڈوب جائے گا۔ صدر نکسن زندہ باد!

رحمان طوطہ آف نیشنل کانفرنس

امریکی خلابازوں کی شاندار کامیابی کا سہرا دراصل بخشی صاحب کے سر ہے۔ ابھی حال ہی میں جب بخشی صاحب یورپ کے دورے پر گئے تھے تو انہوں نے صدر نکسن کو ٹیلی فون پر ہدایت دی تھی کہ اپالو ۱۱ کو کس طرح خلا میں بھیجا جائے۔ صدر نکسن نے ان کے مشورے پر عمل کیا تو کامیابی نے ان کے قدم چوم لئے۔

رام کمار ایڈوکیٹ جموں و کشمیر

سُنا ہے چاند پر نہ کوئی عدالت ہے نہ ہی عدالتِ عالیہ، سو وہاں نہ موکل ہونگے اور نہ ہی وکیل۔ بالفاظ دیگر وہاں بڑی "بے انصافیاں" اور "زیادتیاں" ہوتی ہونگی۔ "انصاف" کا نام ونشان نہ ہوگا۔ چاند پر دوسری اُڑان میں ایک وکیل کو وہاں بھیجنا چاہیئے تاکہ وہ وہاں "مقدمے بازی" کی رسم افتتاح انجام دے سکے۔ اس کے بعد مجھے چاند پر جا میں کوئی اعتراض نہیں۔ فی الحال میں یہاں بیحد مصروف ہوں۔

(۲۱ رجولائی ۱۹۶۹ء)

مقابلۂ حسن کیوں؟

پچھلے تین ماہ سے مقامی اخبارات سرینگر میں ہونے والے مقابلۂ حسن کے خلاف بیانات، مقالات اور مراسلات شائع کر رہے ہیں۔ اسلامک سٹڈی سرکل کی طرف سے اخبارات کے نام جاری کئے گئے بیانات میں اِس اخلاق سوز مقابلے کے تباہ کن نتائج کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اور حکومت سے استدعا کی گئی ہے کہ وہ اس مقابلے کے اہتمام کی ہرگز ہرگز اجازت نہ دے۔ اس سلسلے میں ڈویژنل کمشنر سے کئی وفد ملے اور انہوں نے احتجاج کرتے والوں کو اطمینان دلایا کہ شہریوں کے اخلاق تباہ کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس یقین دہانی کے بعد اس بحث کو ختم ہوجانا چاہیئے تھا لیکن مقامی اخبارات میں "مقابلۂ حسن کیوں؟" کے عنوان سے ابھی تک اِس مضرِ صحت موضوع پر لے دے ہو رہی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ایک مقامی روزنامے میں سری نگر میں مجوزہ مقابلۂ حسن کے خلاف ایک بڑا زوردار مقالہ شائع ہوا جسمیں مسلمانوں کی عزّت، غیرت، خودی اور ان کی شاندار روایات کا واسطہ دے کر ان سے یہ اپیل کی گئی تھی کہ وہ اس قسم کے مقابلے کی سرینگر میں اجازت نہ دیں۔ مقالہ نگار نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس قسم کے مقابلوں سے اسلام اور مسلمانوں کو زبردست خطرہ لاحق ہے۔ اور اسی لئے موصوف نے کشمیری مسلمانوں کو غیرت دلانے کے لئے اپنی ساری انشار پردازی ختم کر دی تھی۔ بعض مراسلہ نگاروں نے یہ خطرہ بھی ظاہر کیا ہے کہ مقابلۂ حسن کا اہتمام کرنا دراصل کشمیری مسلمانوں کے اخلاق کو تباہ کرنے کی ایک منظم سازش کا حصّہ ہے۔ چراغ بیگ پچھلے تین ماہ سے ایک خاموش تماشائی کی حیثیت سے اس ساری بحث سے لطف اندوز ہو رہا ہے لیکن کچھ دنوں سے اُسے یہ احساس ہو رہا ہے کہ یہ بحث غیر ضروری طور پر طول پکڑتی جا رہی ہے۔

اور مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کرنے کی بجائے کچھ لوگ انہیں فروعی مسائل میں اُلجھانے کی کوشش کر رہے ہیں ورنہ مقابلۂ حُسن کے ضرر رساں نتائج سے محفوظ رکھنے کے لئے اتنی منظم اور مسلسل جدو جہد کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ مجھے بعض احتجاج کرنے والوں کی نیت پر شبہ ہو رہا ہے اور اسی لئے میں اس بحث میں شریک ہو کر کچھ اہم سوالات اُٹھانے کی کوشش کرونگا۔

سب سے پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ مقابلۂ حسن کا اہتمام کب ہو رہا ہے؟ کہاں ہو رہا ہے؟ کس سلسلے میں ہو رہا ہے؟ اور اس کا اہتمام کون کر رہا ہے؟ جہاں تک چراغ بیگ کی معلومات کا تعلق ہے (اور اس کی معلومات کے وسیع ہونے میں شک کرنے کی گنجائش نہیں، خاص طور پر جب حُسن کا معاملہ درپیش ہو) سری نگر میں اس قسم کا کوئی مقابلہ نہیں ہو رہا ہے۔ معلوم نہیں کس اخبار نے یہ افواہ اُڑائی اور شہر کے اخلاقی محافظ اسے لے اُڑے۔ اس کے بعد اب تک مقالات اور مراسلات کا سلسلہ ختم ہونے نہیں آتا۔ اور ڈویژنل کمشنر کی یقین دہانی کے بعد بھی احتجاج کی آوازیں سُنائی دے رہی ہیں۔

اب فرض کیجئے کہ واقعی اس قسم کے مقابلے کا اہتمام ہو رہا ہے اور یہ بھی فرض کیجیے کہ اس سے نوجوانوں (حالانکہ زیادہ خطرہ بوڑھوں کو ہے) کے اخلاق پر بُرا اثر پڑے گا۔ میں یہ جاننا چاہوں گا کہ اس پر اس شدید احتجاج اور غیر معمولی بیان بازی کا کوئی جواز ہے؟ شہر کے بعض مصلحین اخلاق نے جس شدّت اور تسلسل کے ساتھ اس اخلاق سوز مظاہرے کی مذمت کی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مقابلۂ حُسن کا اہتمام شہریوں کے اخلاق پر ڈاکہ ڈالنے کی پہلی کوشش ہے۔ اور اسی لئے اخلاق اور شرافت کے نام لیوا فوراً ہی اس کے خلاف منظم ہو گئے ہیں

بات دراصل یہ نہیں ہے اصل بات یہ ہے کہ مقابلۂ حُسن کے خلاف جدو جہد کرنا عام لوگوں کے جذبات کو اُبھارنا، اور انشاء پردازی کا کمال دکھانا قدرے آسان ہے ورنہ یہ کوئی اتنی بڑی قباحت نہیں کہ اس کے خلاف اس شدّت کے ساتھ احتجاج کیا جائے۔ شہر میں ایک نہیں سینکڑوں شراب خانے دن رات نوجوانوں کے اخلاق کو تباہ کرنے کے کاروبار میں مشغول ہیں۔ لیکن ہمارے اخلاق کو مقابلۂ حُسن سے محفوظ رکھنے والے مصلحین نے آج تک ان کے وجود کے خلاف احتجاج نہیں کیا۔ اسلامک سٹیڈی سرکل کا ایک وفد بھی ڈویژنل کمشنر سے اس مقصد کے لئے نہیں ملا کہ شہر کے

شراب خانے بند کر دئے جائیں۔ مصلحین میں سے کسی کو آج تک یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ ان شراب خانوں کے باہر دھرنا لگا کر بیٹھ جائیں کہ کوئی نوجوان، کوئی مسلمان یہاں کا رُخ نہ کرے۔ شہر کے آدھ درجن سینما ہالوں میں ہر روز دن میں کئی بار عریاں اور فحش فلموں کی نمائش ہوتی ہے۔ یہ عُریانی اور فحاشی مقابلہ حسن کی بے حیائی کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ مخرب اخلاق اور جذبات انگیز ہوتی ہے۔ ہمارے اِن اخلاقی محافظوں نے آج تک کتنی بار ان فلموں کی نمائش کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ کیا ان حضرات نے آج تک کبھی عریاں اور فحش فلمی پوسٹروں کے خلاف بھی بیزاری کا اظہار کیا ہے؟ شہر کے بہت سے کتب فروش انتہائی لچر، فحش اور گھٹیا قسم کی کتابوں کا کاروبار کر کے نوجوانوں کے اخلاق کو تباہ کر رہے ہیں۔ مقابلہ حسن کے خلاف جدوجہدِ منظم کرنے والے ان نوجوانوں نے کبھی اِس ننگِ انسانیت کاروبار کے خلاف کوئی مظاہرہ منظم کیا ہے؟

شہر کی شاہراہوں پر ہر صبح اور ہر شام سینکڑوں نوجوان لڑکیاں، نیم عریاں اور چست لباس زیب تن کر کے اپنے حُسن کی نمائش کرتی پھرتی ہیں۔ کیا حسن کا یہ مقابلہ ہمارے اخلاق کو تباہ کرنے کے لئے کافی نہیں؟ پھر اسلامک سٹیڈی سرکل اور دوسری "اخلاق بچاؤ" تنظیمیں ان چلتی پھرتی نمائشوں کے خلاف احتجاج کیوں نہیں کرتیں؟

ان تمام اخلاق سوز اور مضرت رساں بُرائیوں کے مقابلے میں حُسن کا مقابلہ ایک ایسا معصوم اور بے ضرر مظاہرہ معلوم ہوتا ہے کہ اس پر اتنی توجہ اور وقت صرف کرنے کی بظاہر کوئی ضرورت نہیں تھی۔ حسن کا یہ مقابلہ اگر کہیں منعقد کیا بھی جائے، تو زیادہ سے زیادہ اسے دو تین سو نوجوان دیکھ سکیں گے۔ ان مظاہروں کی فکر کیجئے کہ جو پوری نسل کے اخلاق کو تباہ کرنے کے لئے دن رات سڑکوں پر، کلبوں میں اور کالجوں میں منظم کئے جاتے ہیں۔ باقی رہا چراغ بیگ سو اس کے اخلاق کی فکر نہ کیجئے کہ اس کے اخلاق کا آبگینہ اتنا نازک نہیں کہ ایک حُسن کے مقابلے کی تاب نہ لا سکے۔

(۱۰ر نومبر ۱۹۶۹ء)

صادق صاحب کا چڑیا گھر

پچھلے دنوں جموّں میں شہری ہوا بازی اور سیاحت کے مرکزی وزیر ڈاکٹر کرن سنگھ نے جموّں کے اخبار نویسوں کو ایک غیر رسمی بات چیت کے لئے اپنی قیام گاہ پر مدعو کیا ، تو ناچیز کمترین چراغ بیگ بھی بن بُلائے وہاں پہنچ گیا اور جب ڈاکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے پوچھا "کہیئے بیگ صاحب، آپ کیسے تشریف لائے ؟" تو اس ناچیز کمترین نے جواب دیا ، کہ " علاقائی نابرابری کو دور کرنے کے لئے آیا ہوں ." ڈاکٹر صاحب بڑے ذہین اور فطین آدمی ہیں ۔ چراغ بیگ کی بات سمجھ گئے اور بڑے زور کا قہقہہ بلند کیا ۔ اس کے بعد رسمی طور پر غیر رسمی بات چیت کا آغاز ہوا ۔ اد جموّں کے اخبار نویس بھائیوں نے تابڑ توڑ سوالات کی بوچھاڑ کر دی ۔ زیادہ تر سوالات کی تان اس بات پر آکر ٹوٹ جاتی تھی کہ کشمیر کے مقابلے میں جموں میں کم روپیہ خرچ ہو رہا ہے اور ایسا کیوں ہو رہا ہے ۔ کچھ دوستوں کو یہ شکایت تھی کہ کشمیر میں سیاحت کو فروغ دینے کے لئے بڑے بڑے پروجیکٹ ہاتھ میں لئے گئے ہیں اور اس کے مقابلے میں جموّں میں کچھ نہیں ہو رہا ہے ۔ اس شکایت کا ڈاکٹر صاحب نے بڑا دلچسپ جواب دیا ۔ اُنھوں نے کہا کہ اس بات میں میرا اور میرے آبا و اجداد کا قطعی کوئی قصور نہیں ہے کہ پہلگام ، گلمرگ ، سونہ مرگ اور مغل باغات جیسی خوبصورت جگہیں کشمیر میں واقع ہیں اور ظاہر ہے کہ ٹورزم کے نکتہ نظر سے صرف انہیں جگہوں کو اہمیت حاصل ہوگی ، جو خوبصورت اور دلکش ہوں ۔ اس کے بعد ایک اخبار نویس نے جھلّا کر پوچھا کہ جموّں میں کوئی چڑیا گھر کیوں نہیں ہے ؟ ڈاکٹر کرن سنگھ اس سوال کو یہ

کہہ کر ٹال گئے کہ جموّں میں چڑیا گھر کی کیا ضرورت ہے۔ آپ دہلی آکر چڑیا گھر دیکھ لیجئے۔
لیکن میں ذاتی طور پر اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ بلکہ میرے دل میں پوشیدہ علاقائی
تعصب نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کشمیر میں بھی ایک چڑیا گھر کیوں نہیں ہے۔ اور
واقعہ یہ ہے کہ جب سے اس اخبار نویس بھائی نے "جموں میں کوئی چڑیا گھر کیوں نہیں
ہے"۔ کا سوال پوچھا ہے۔ میرے دل میں بار بار یہ کرید ہو رہی تھی کہ اس ریاست میں ابھی
تک کسی کو ایک چڑیا گھر کھولنے کا خیال کیوں نہیں آیا۔ پھر دفعتاً روشنی ہو گئی، اور مجھے
میرے سوال کا جواب مل گیا۔ اس ریاست میں ایک نہیں کئی چڑیا گھر ہیں۔ غور سے دیکھا
جائے تو یہ پوری ریاست ایک بہت بڑا چڑیا گھر ہی تو ہے۔ جسمیں طرح طرح کے مقامی
جانوروں کے علاوہ بیرونِ ریاست سے بھی کچھ نادر اور نایاب جانور وقتاً فوقتاً درآمد کئے
جاتے ہیں۔ ریاستی چڑیا گھر کا سب سے دلچسپ اور قابلِ دید شعبہ وہ ہے، کہ جس پر
ریاست کی آمدن کا اکثر حصّہ صرف ہوتا ہے اور جسے وزیروں کا شعبہ کہتے ہیں۔ بخشی صاحب
نے اپنے دورِ اقتدار میں اس شعبے میں ہاتھی، گینڈے، گائے، بیل، گھوڑے اور بھیڑ جیسے
کار آمد جانور جمع کر رکھے تھے۔ صادق صاحب نے چڑیا گھر کی رونق بڑھانے کیلئے بہت
سے گدھے اور بندر بھی جمع کر دئے ہیں۔ اور بچّوں کا دل بہلانے کے لئے مسخروں کی خدمات
بھی حاصل کی ہیں۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ریاست کا یہ چڑیا گھر سال کے چھ ماہ
جموں میں عوام کی دلچسپی کا باعث بنا رہتا ہے اور اس لحاظ سے یہ دنیا کا واحد متحرک
چڑیا گھر ہے اور صادق صاحب اس بات کے لئے تعریف کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے اپنے
چڑیا گھر میں ایک سے ایک نادر نمونہ جمع کر رکھا ہے۔

وزارتِ خزانہ اور ہیرا پھیری کے سب سے بڑے وزیر شری گردھاری لعل ڈوگرہ
چڑیا گھر کے سب سے پُرانے جانور ہیں۔ ان کی وضع قطع ہاتھی اور گینڈے دونوں سے ہی ملتی
ہے، لیکن ان کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کیا ہیں۔ کیونکہ یہ ہر
محفل میں اپنا رنگ و روپ بدل دیتے ہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۷ء سے لیکر اب تک
جتنے بھی چڑیا گھر آراستہ کئے گئے ڈوگرہ صاحب ہر چڑیا گھر کی زینت بنے رہے۔

وہ وضع قطع سے ہاتھی، لیکن فطرتاً گرگٹ ہیں۔

کنور رنجیت سنگھ جموال ایک ایسا نادرِ روزگار نمونہ ہے کہ ان کی دریافت واقعی صادق صاحب ہی کا کارنامہ ہے۔ پرانے زمانے کے اس عجیب الخلقت جانور کو ڈھونڈھ نکالنے میں صادق صاحب کو بڑی محنت اور جانفشانی سے کام کرنا پڑا ہوگا۔ جموال صاحب کی ظاہری صورت تو اونٹ سے مشابہ ہے۔ لیکن صادق صاحب انہیں گھوڑا سمجھ کر اپنے چڑیا گھر میں لائے ہیں۔ اور اسی لئے انہیں ٹرانسپورٹ کا وزیر بنا دیا ہے۔

پیر غیاث الدین ایک ایسا جانور ہے کہ جس کی دُم پر پیسہ ہے۔ یہ دور سے اونٹ، نزدیک سے گھوڑا، رفتار سے کچھوا، گفتار سے آدمی اور کردار سے پاجامہ معلوم ہوتا ہے۔ ان کی دریافت صادق صاحب کے بڑے بھائی پیر عبد الاحد کا کارنامہ ہے کہ جنہوں نے انہیں بٹہ مالو کے جنگل سے پکڑ کر ترقی پسندی کی چراگاہ میں چرنے کے لئے چھوڑ دیا، غیاث صاحب بخشی صاحب کے چڑیا گھر میں جانوروں کو گھاس ڈالنے پر مامور تھے صادق صاحب نے اپنے دور میں انہیں صنعت اور بجلی کے محکمے کا چیتا بنا دیا ہے۔

خرابیٔ صحت اور بیماری کے وزیر محمد ایوب خان کو یوں تو جنگل کا بادشاہ کہنا چاہیئے کہ اب وہ کچھ عرصے سے جنگلات کے وزیر بھی ہیں۔ لیکن شکل و شباہت کے اعتبار سے وہ شیر نہیں بھیڑ لگتے ہیں اور فطرت سے بھی بھیڑ چال ہیں۔ اپنی کوئی رائے نہیں رکھتے، اور اسی لئے خاصے فربہ نظر آتے ہیں۔ ہاتھی، گینڈے اور اونٹ سے ہی ڈرتے تو بات سمجھ میں آجاتی، لیکن ایوب صاحب کچھوے اور خرگوش سے بھی خائف رہتے ہیں اور اسی لئے محکمۂ صحتِ عامہ کے ڈائرکٹر نے انہیں "اپنا پالتو" بنا لیا ہے۔

ان بڑے بڑے جانوروں کے علاوہ صادق صاحب کے چڑیا گھر میں گونی، نور محمد، چودھری شفیع، پرنانند، گورمکھ سنگھ، محمد دین بانڈے اور مفتی سعید نام کے کچھ چھوٹے جانور بھی پائے جاتے ہیں۔ آئندہ کسی صحبت میں چراغ بیگ قارئین کو ان جانوروں سے بھی متعارف کرے گا، جب تک کے لئے اجازت دیجئے۔

(۲۶ جنوری ۱۹۷۰ء)

سفارش نہیں سفارشات!

نراد،سی چودھری نے اپنی خود نوشت سوانح "گمنام ہندوستان" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ہندوستانیوں کو رشوت کی کرامت پر غیر متزلزل اعتقاد ہے۔ اور ان کے خیال میں دنیا میں کوئی ایسی مشکل نہیں جو رشوت کی مدد سے حل نہ ہو سکے۔ میرا اپنا تجربہ ہے کہ جموّں وکشمیر کے لوگ رشوت سے بھی زیادہ سفارش پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور ان کے خیال میں دنیا میں کوئی ایسا کام نہیں کہ جو سفارش کے ذریعے انجام نہ پا سکتا ہو۔ میں تو اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ 'سفارش' ہمارے ہاں کے لوگوں کے لئے ضرورت سے زیادہ عادت بن گئی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ضرورت کو عادت کا مرتبہ دینے کی ذمہ داری اس سیاسی نظام پر ہے کہ جس نے عام آدمی کے ایمان، ایقان اور اعتقاد میں اتنے رخنے پیدا کر دئے ہیں کہ اُسے اربابِ اقتدار اور اہلِ اختیار کی دیانت، شرافت اور انسانیت پر کوئی بھروسہ نہیں رہا ہے۔ اور اُسے اس بات پر یقین ہوگیا ہے کہ سفارش کے بغیر اس سماج میں اس کا زندہ رہنا ممکن نہیں، لیکن اس وقت میں اسباب وعلل کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ ایک ایسی حقیقت کا ذکر کر رہا ہوں کہ جس نے چراغ بیگ کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ میں اپنی داستان سنانے سے پہلے اس بات کا اعلان اور اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ میں بنیادی طور پر سفارش کے خلاف نہیں ہوں اور مجھے عبدالمجید سالک کے اس خیال سے اتفاق ہے کہ سفارش تعلقات کی زکوٰۃ ہوتی ہے اور اس نظام اور اس معاشرہ میں سفارش کرنا انصاف اور حق کی دستگیری کرنا ہے مگر ہر چیز کی ایک حد ہوا کرتی ہے۔ اور

حد سے تجاوز کرنے سے ہر اچھی چیز بھی بلائے بے درماں بن جاتی ہے۔ اپنے ہاں سفارش، تعلقات کی زکوٰۃ کی بجائے تعلقات ختم کرنے کا ایک وسیلہ اور زندگی گذارنے کا ایک طریقہ بن گیا ہے۔ صبح چھ بجکر چالیس منٹ سے رات کے دس بجے تک اگر روزانہ ڈیڑھ سو آدمی آپ کو اپنے تعلقات کی زکوٰۃ بانٹنے کی ایک انجمن تصوّر کریں تو آپ ہی بتائیے کہ آپ کیا کریں گے۔ چراغ بیگ کے لئے تو گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر پہنچنا مشکل ہو گیا ہے۔ راستے میں جو بھی ملتا ہے وہ اپنی روداد سُنا کر پھر سفارش کی فریاد کرتا ہے۔ اب اگر آپ بہت ہی مخلص اور شریف آدمی ہوں اور ہر مصیبت زدہ آدمی کی مدد کرنا بھی چاہیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ آپ ایک دن میں پچاس ساٹھ آدمیوں کی سفارش کر سکیں اور پھر سفارشوں کے طالب اکثر وہ لوگ ہوتے ہیں کہ جو کسی دوسرے کا حق مار کر سفارش کے ذریعے آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ اور لوگ کیا کرتے ہیں۔ لیکن میں اکثر اوقات سخت مشکل میں پڑ جاتا ہوں اور ان حالات میں بے تحاشا جھوٹ بولنے کے علاوہ فرار کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ میری صورت دیکھ کر ہی لوگوں کو نہ معلوم سفارش کرانے کی تحریک کیوں ہوتی ہے۔ بہت سے لوگوں کے نزدیک اب میں ایک اخبار نویس یا انسان نہیں ہوں کہ جس سے ادب، اخلاق، سیاست یا صحافت کے متعلق بات ہو سکتی ہے، وہ مجھے سفارش کی ایک مشین سمجھتے ہیں اور جب بھی کوئی دوست یا اجنبی مجھے محبّت سے سلام کرتا ہے یا بہت دنوں کے بعد ملنے کی شکایت کرتا ہے تو میں اس انتظار میں رہتا ہوں کہ کب اپنا مدعا ــ سفارش ــ بیان کرے گا اور میری بدقسمتی کہ اکثر اوقات میرا اندازہ صحیح ثابت ہوتا ہے۔

بعض لوگوں کو سفارش کی سخت ضرورت ہوتی ہے کہ ان کے جائز حقوق پر ڈاکہ پڑنے والا ہوتا ہے۔ اور وہ سفارش کے جادو ٹونے سے ڈاکوؤں کو مار بھگاتے ہیں۔ مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ اکثر لوگوں کو سفارش کی عادت ہو گئی ہے۔ وہ ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں اُسے باقاعدہ فیس ادا کرتے ہیں اور اس کے بعد ڈاکٹر کے کسی دوست کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں کہ جو ان کی سفارش کر سکے۔ بہت سے لوگوں کے کام

خود ہی ہو جاتے ہیں، لیکن انہیں تب تک اطمینان نہیں ہوتا جب تک کہ کوئی دوسرا ان کی سفارش نہ کرے۔ مجھے کئی بار یہ بھی تجربہ ہوا ہے کہ بہت سے لوگ مجھ سے سفارش کروانے کے لئے بھی کچھ لوگوں کو بطور سفارش کے میرے پاس لاتے ہیں اور اسطرح سفارش کا سلسلہ روز بروز پے چیدہ سے پے چیدہ تر ہوتا جا رہا ہے اور مجھ جیسے بد قسمت لوگوں کا اکثر وقت بے مقصد، بے معنی اور بعض اوقات غلط قسم کی سفارشیں کرنے میں صرف ہوتا ہے۔ میں یہاں پر صرف اپنی بات کر رہا ہوں، ان لوگوں کی بات نہیں کر رہا ہوں کہ جنہوں نے اس بیمار اور بوسیدہ نظام میں سفارش کو تجارت اور کاروبار کا ایک ذریعہ بنایا ہے۔ 'سفارش، کو پیشہ بنانے والے بد کردار لوگوں نے ہی ہم جیسے لوگوں کے لئے مشکلات پیدا کر دی ہیں اور میں نہیں جانتا کہ اس بیماری سے نجات کی کیا صورت ہے؟ لوگ خود غرض بھی ہیں اور مجبور بھی، ان کو قصوروار گردانتا کافی نہیں، اس علّت کا اصل سبب وہ سیاسی نظام ہے کہ جس نے سفارش کو انصاف اور عدل کی جگہ دیکر اسے آگے بڑھنے کا ایک ذریعہ بنا دیا ہے۔ جوں جوں انتظامیہ اور عدلیہ کی حق پسندی، انصاف پسندی اور غیر جانبداری پر سے عام لوگوں کا اعتماد کمزور ہوتا جائے گا سفارشوں پر ان کا اعتماد مستحکم ہوتا جائے گا اور ان سفارشوں پر ریاستی عوام کے بڑھتے ہوئے اعتقاد کی ایک نشانی یہ ہے کہ صبح سے شام تک اس ناچیز کے پاس سفارش کے لئے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ کسی کا کام ہو جاتا ہے تو وہ دُعائیں دیکر چلا نہیں جاتا بلکہ دوسرے دن دوسری سفارش کے لئے حاضر ہو جاتا ہے اور جن لوگوں کے لئے میری سفارش کارگر نہیں ہوتی (اور انکی تعداد بہت زیادہ ہے) وہ مجھے مغرور، بے مروّت، بے ایمان اور بد معاش سمجھ کر چلے جاتے ہیں، لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ پھر چلے آتے ہیں! قصّہ کوتاہ کہ چراغ بیگ تعلقات کی زکوٰۃ ادا کرتے کرتے خود فقیر ہو گیا ہے!

(۲۶ر جنوری ۱۹۷۰ء)

اخبارات کی فیملی پلاننگ

شاعروں کی بہتات کو معاشرے کے انحطاط کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ اخبارات کی کی افراط کو اخلاقی گراوٹ اور کردار کی کمزوری سے تعبیر کیا جانا چاہیئے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ریاستِ جموّں و کشمیر میں ہفتہ وار اور روزانہ اخبارات کی تعداد میں بے تحاشا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ سرینگر سے شائع ہونے والے روزناموں کی کُل تعداد بارہ سے تجاوز کر چکی ہے اور ہفت روزوں کی تعداد تیس کے لگ بھگ ہے۔ جموں روزناموں کے مقابلے میں سرینگر سے بہت پیچھے ہے (یہاں صرف چھ روزنامے شائع ہوتے ہیں۔) لیکن ہفت روزوں کی اشاعت میں یہ شہر بازی جیت گیا ہے۔ یہاں سے کل ملا کر پچاس ہفت روزے شائع ہو رہے ہیں۔ آپ سوچتے ہونگے کہ چراغ بیگ حسد اور رقابت کی آگ میں جل رہا ہے اور اسی لئے اسے "کثرتِ اخبار" پر اعتراض ہے۔ بات یہ ہوتی تو میں اس موضوع پر قلم ہی نہ اُٹھاتا کیونکہ "موضوع" کے انتخاب سے میں اپنے آپ کو رُسوا نہ کرتا لیکن حق بات یہ ہے کہ مجھے اخبارات کی اس غیر معمولی تعداد کو دیکھ کر بڑی وحشت ہو رہی ہے، کیونکہ ان اخبارات میں سے ایک اچھی خاصی تعداد اُن اخباروں کی ہے اکہ جو صحافت کی مقدّس پیشانی پر کلنک کے داغ کی حیثیت رکھتے ہیں، اور یہ ان لوگوں نے جاری کئے ہیں کہ جو زندگی کے ہر دوسرے شعبے میں ناکام اور نامراد ہو کر صحافت کی وادیوں اپنی قسمت آزمانے کے لئے آئے ہیں۔ ان کے نزدیک صحافت بھی حجامت اور طباعت کی طرح ایک پیشہ ہے، جس کا مقصد چار پیسے کما کر اپنا

اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالنا ہے۔ اور صحافت کے تئیں یہ رویہ ایک خطرناک ذہنی رجحان ہے کہ جس کو ہماری ریاست میں کم وبیش قبول کر لیا گیا ہے۔ میں ہندوستانی آئین میں یہاں کے شہریوں کو دئے گئے حقوق کا احترام کرتا ہوں۔ اور میرا عقیدہ ہے کہ ہر شخص کو اپنا من پسند پیشہ اختیار کرنے کا حق ہونا چاہیئے لیکن میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ اگر کوئی کمپونڈر بغیر لائسنس حاصل کئے چار آنے کی دوائی نہیں بیچ سکتا۔ اگر کوئی نائی باقاعدہ لائسنس کے بغیر آپ کی حجامت نہیں بنا سکتا اور کوئی قصائی میونسپلٹی کی مہر کے بغیر گوشت فروخت نہیں کر سکتا۔ تو کیا وجہ ہے کہ اخبار شائع کرنے والے مدیرانِ محترم پر اس قسم کی کوئی پابندی نہیں ؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ کمپونڈر کو دوائی بیچنے سے پہلے اپنی تربیت کا سرٹیفکیٹ پیش کرنا ہوتا ہے ؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ حجام کو اپنی دوکان سجانے سے پہلے اپنی فنّی مہارت کا ثبوت دینا پڑتا ہے ؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ قصائی کو گوشت بیچنے سے پہلے میونسپلٹی کو اطمینان دلانا پڑتا ہے کہ یہ گوشت قابلِ استعمال اور قابلِ فروخت ہے ؟ اگر ان تمام سوالات کا جواب اثبات میں ہے تو میں جاننا چاہوں گا کہ اخبارات کے لئے ڈیکلریشن جاری کرنے سے پہلے یہ اطمینان کیوں نہیں کیا جاتا کہ درخواست دہندہ دماغی طور پر صحت مند ہے یا نہیں ؟ اس کی تعلیمی استعداد کیا ہے ؟ اس نے اپنی زندگی میں کبھی قلم ہاتھ میں اُٹھایا ہے یا نہیں ؟ اس نے کبھی اخبار یا کتاب کا مطالعہ کیا ہے ؟ اسے کسی اخلاقی جرم میں کبھی سزا تو نہیں ہوئی ہے ؟ اس کا کسی مجرموں کی ٹولی سے کوئی تعلق تو نہیں ہے ؟ یہ پیشہ ور بلیک میلر تو نہیں ؟ کیا یہ صحیح نہیں کہ اخبارات کے ذریعے معاشرے میں گندگی، غلاظت اور بیماریوں کے پھیلنے کا زیادہ احتمال موجود ہے ؟ پھر کیا وجہ ہے کہ اظہار و تشہیر کے اس موثر ترین Medium کو استعمال کرنے سے پہلے استعمال کرنے والے کی ذہنی، نفسیاتی اور علمی جانچ پڑتال کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ نائیوں، نانبائیوں اور قصائیوں نے صحافت کی سرحدوں میں قدم رکھ کر اس پیشے کی عزت و حرمت کو داغدار

بنا دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اخبارات کی اس کثرت میں بہت سے اخبارات ایسے بھی نظر آئیں گے کہ جن کو صحافتی اصطلاحات میں چیتھڑے کہا جاتا ہے۔ اگر انسانوں کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کے لئے "فیملی پلاننگ" کی ضرورت کو ناگزیر سمجھا گیا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ صحافت کے معیار کو بلند کرنے کے لئے اخبارات کی فیملی پلاننگ بہت ضروری ہے۔ اور آئندہ ہر اخبار والے کو ڈیکلریشن حاصل کرنے کے لئے جرنلزم میں اپنے تجربے اور اپنی تعلیمی استعداد کے ساتھ ساتھ اس بات کا اطمینان دلانا ہوگا کہ وہ اس پیشے کو تجارت کے طور پر نہیں، ایک مشن کے طور پر اپنا رہا ہے۔ اور میرا خیال یہ ہے کہ اس "جانچ پڑتال" کا کام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے بجائے صحافیوں کی ایک کونسل کے سپرد کیا جانا چاہیئے، جو آزادئ تحریر و تقریر کی حفاظت بھی کر سکے اور صحافت کی اعلیٰ اقدار کا احترام بھی!

(۱۵ر فروری ۱۹۷۰ء)

ڈی، آئی، جی کشمیر کے نام

ڈی، آئی، جی (کشمیر) پیر غلام حسن شاہ کی سرگرمی میں ہماری پولیس کچھ عرصے سے ناقابلِ یقین فرض شناسی اور قابلِ تعریف کارکردگی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ چرس کے تاجروں اور جنگلات کے لٹیروں کی سرکوبی کے بعد پولیس نے سرکاری سٹوروں سے چرائے سیمنٹ اور لوہے کی کھوج شروع کر دی ہے۔ اور اس سلسلے میں کچھ ایسے سنسنی خیز حقائق سامنے آئے ہیں کہ جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سرکاری سٹوروں نے جدید فنِ تعمیر کے فروغ دینے میں کتنا اہم حصّہ ادا کیا ہے۔ ڈی، آئی، جی کشمیر کے بیان کے مطابق ابھی تک کئی لاکھ روپے کی مالیت کا سیمنٹ، لوہے کی سلاخیں اور ٹین کے تختے ضبط کئے گئے ہیں اور یہ ضبط شدہ مال سرکاری سٹوروں سے مولیوں کے بھاؤ خرید کر بازار میں گوشت کے بھاؤ بیچا جا رہا تھا۔ پولیس نے سٹور کیپروں کی فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق بہت سے شریف اور معزز شہریوں سے بھی پوچھ گچھ کی ہے اور کوتوالِ شہر سیّد ولی شاہ نے دعویٰ کیا ہے کہ تحقیقات کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ مقامی اخبارات میں انکشاف کیا گیا ہے کہ بہت سے بڑے آدمیوں کی نئی تعمیر شدہ رہائش گاہوں میں سیمنٹ، لوہا اور ٹین کے تختے ہی نہیں بلکہ خواب گاہوں کے پردے، غسلخانوں کے شیشے اور دیوان خانوں کے قمقمے بھی سرکاری سٹوروں کا ہی عطیہ ہیں۔ مسئلے کا یہی پہلو ہے کہ جس کی نسبت چراغ بیگ، ڈی، آئی جی کشمیر سے کچھ باتوں کی وضاحت چاہے گا!

چراغ بیگ یہ جاننا چاہے گا کہ ہماری پولیس کو یہ احساس اور الہام کب ہوا کہ

سرکاری سٹوروں کا مال بازار میں فروخت ہو رہا ہے ؟ وہ یہ بھی جاننے کا خواہشمند ہے کہ اس مالِ مسروقہ کی اولین نشاندہی کا سہرا کس پولیس افسر کے سر ہے ؟ اور وہ یہ بھی دریافت کرنے کی جسارت کرے گا کہ تحقیقات کو مکمل اور جامع بنانے کے لئے کون کون سے سرکاری افسروں سے پوچھ گچھ ہوئی ہے اور کتنے بڑے ٹھیکیدار گرفتار کئے گئے ہیں ؟ جہاں تک اس خاکسار کمترین ہیچمدان کی اطلاعات کا تعلق ہے۔ تحقیقات کا دائرہ ابھی تک کچھ اوبیروں اور دکانداروں تک ہی محدود ہے اور تادم تحریر کسی ایک بھی ایسی شخصیت سے استفسار نہیں کیا گیا ہے کہ جس کا جاہ و جلال اور جسکی عظمت و حشمت سرکاری سٹوروں سے چرائے ہوئے سیمنٹ اور لوہے کی مرہونِ منّت ہے۔ چراغ بیگ کا روئے سخن ان تاج محلوں میں رہنے والے شاہ جہانوں کی طرف ہے کہ جنہوں نے سرکاری سٹوروں کے سیمنٹ اور لوہے سے لالاج باغ، گوگجی باغ، نشاط باغ، سونہ وار، برزلہ، حیدرپورہ اور جواہر نگر میں اپنے ممتاز محلوں کے لئے قابلِ رشک راحت کدے تعمیر کئے ہیں۔ کیا پیر غلام حسن شاہ کو اس بات کا علم ہے کہ پچھلے پندرہ سولہ سالوں میں تعمیر ہونے والے تقریباً سبھی افسروں اور ٹھیکے داروں، وزیروں اور نائب وزیروں، سپیکروں اور ڈپٹی سپیکروں کی عالیشان کوٹھیوں میں سرکاری سٹوروں کا مال اور غریب عوام کا لہو صرف ہوا ہے ؟ کیا انہیں اس بات کا علم ہے کہ جموں کے گاندھی نگر میں پچھلے آٹھ دس سال میں تعمیر شدہ عالیشان عمارات کی ایک ایک اینٹ پر سرکاری سٹوروں کی مہر لگی ہوئی ہے ؟ کیا وہ اس بات سے واقف ہیں کہ پبلک ورکس اور اریگیشن، بجلی اور دیگر تعمیراتی محکموں کے بڑے بڑے افسروں کے عالیشان محلوں میں سرکاری سیمنٹ، لوہا اور اینٹیں ہی نہیں ڈورمیٹ سے لیکر خواب گاہوں میں سجی ہو مسہریاں اور مہمان خانوں میں بچھے ہوئے قالین بھی سرکاری سٹوروں سے آئے ہوئے ہیں ؟ یہ سب باتیں اگر ڈی۔ آئی۔ جی صاحب کو معلوم نہیں تو پھر انہیں ان کی سادگی اور معصومیت کے لئے قومی اعزاز دینا چاہیئے۔ اور اگر انہیں یہ سب کچھ معلوم ہے تو پھر ہم ان سے یہ پوچھنا چاہیں گے کہ انہوں نے سرکاری سیمنٹ اور لوہے کے

گول مال کی کھوج لگانے کے لئے، جو مہم شروع کی ہے کیا وہ اس کے دور رس نتائج اور خوفناک امکانات سے اچھی طرح واقف ہیں ؟ اگر وہ اس کھوج کو اپنے منطقی انجام تک پہنچانا چاہتے ہیں تو انہیں بہت بڑے بڑے افسروں کو بڑے گھر کی ہوا کھلانا پڑے گی ۔ یہی نہیں، انہیں بہت سے وزیروں کو ہتھکڑیاں پہنا کر عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کرنا ہوگا۔ بہت سے معزز، بارسوخ اور بااثر شہریوں کو چوری کا مال خریدنے کے الزام میں قانون کے حوالے کرنا پڑے گا۔ اقتدار اور اختیار کے مسندوں پر بیٹھے ہوئے بہت سے فرعونوں کو گلے سے پکڑ کر آہنی سلاخوں کے پیچھے کر دینا ہوگا۔ اور پھر ان مجرموں کے عالیشان محلات کو سرکاری جائیداد قرار دیکر انہیں نیلام کر دینا ہوگا تاکہ سرکاری سٹوروں سے چُرائے ہوئے سیمنٹ اور لوہے کی قیمت مع سود وصول ہو سکے اور ڈی۔ آئی۔ جی کشمیر بخوبی جانتے ہیں کہ وہ یہ سب کچھ نہیں کر سکتے انہیں صرف چند دن کی تحقیقات کے دوران ہی پتہ چل چکا ہوگا کہ انہوں نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالا ہے ۔ اور ان کے تازہ ترین بیان سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ وہ اپنے کئے پر نادم ہیں اور کسی طور پر اب معاملے کو رفع دفع کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ یہ بات اوورسیر اور سٹور کیپر سے چیف انجنیئر تک اور ٹھیکے دار سے وزیر تک پہنچ گئی ہے اور یہ وہ نازک مقام ہے کہ جہاں بڑے بڑے ڈی۔ آئی۔ جی بھی پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔

اس لئے چراغ بیگ کا مشورہ یہ ہے کہ یہ ناٹک اب بند کر دیجئے۔ فرض شناسی، دیانت داری اور اعلیٰ کارکردگی کا یہ سوانگ زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا۔ نہ آپ میں اسے اس کے نکتہ عروج تک پہنچانے کی ہمّت ہے اور نہ آپ کے آقاؤں میں یہ سب کچھ سہنے کا حوصلہ ہے۔ کیوں آپ بیچارے غریب اوورسیروں، سٹور کیپروں اور دکانداروں کو اپنی کارکردگی کا تختہ مشق بنا رہے ہیں۔ ان کے جرم میں تو پچھلے بارہ پندرہ سال سے حکومت کا سارا نظام اور پورا معاشرہ شریک رہا ہے۔ اور خطرہ یہ ہے کہ ان پر اٹھنے والی انگلی کہیں ان کی طرف بھی نہ اُٹھ جائے کہ جن کے زہد و تقویٰ پر ابھی تک آپ کا بھی اعتبار قائم ہے۔

(۲۶ فروری ۱۹۷۰ء)

ڈیڈی

ڈیڈی کی موت پر سارا جموں سوگوار تھا!

شیورام گپتا کو ان کے دوست احباب پیار سے ڈیڈی کہا کرتے تھے۔ اور ان کی دوستی کا حلقہ اتنا وسیع تھا کہ اس میں ان کے دشمن بھی شامل تھے۔ دراصل ان سے دشمنی کرنا بہت مشکل کام تھا، اور ان کی دلآویز شخصیت کی دھوپ سے بڑے بڑے جلّاد بھی پگھل جاتے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی سدا بہار مسکراہٹ اور ان کے چہرے پر بکھری ہوئی متانت اور سنجیدگی نے ڈیڈی کو بڑھاپے میں بھی جوانی کی آن بان قائم رکھنے میں مدد دی تھی۔ اور باوجود اس کے کہ وہ زندگی کی اٹھاسٹھویں منزل میں قدم رکھ چکے تھے۔ ان کے حلقۂ احباب میں زیادہ تر وہ نوجوان شامل تھے کہ جن سے وہ بے تکلف ہو کر ہنسی مذاق کر سکتے تھے۔ انہوں نے آخری دم تک بڑھاپے کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے انکار کیا۔ اور جو لوگ انہیں بہت قریب سے جانتے تھے وہی اس بات کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ ڈیڈی کتنے رنگیلے، سجیلے اور بانکے جوان تھے۔ اُن کی چال ڈھال، رفتار، لباس، گفتگو اور ان کا رکھ رکھاؤ اس پُرانی ڈوگرہ تہذیب کی نشانیاں تھیں کہ جو مرٹ جانے کے باوجود اپنے وجود کو زندہ رکھنے کے لئے ایک آخری لڑائی لڑنے پر آمادہ ہے۔ یہ ہر مٹتی ہوئی تہذیب کا خاصہ ہے اور ڈیڈی ایک مٹتی ہوئی تہذیب کی ایک خوبصورت علامت تھے!

وہ بڑے خوش پوش اور خوش خلق ڈوگرہ تھے اور انہیں اپنے حسب و نسب پر

فخر تھا۔ اِن کی پگڑی کے پیچ وخم سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ انہوں نے ابھی تک زمانے سے ہار نہیں مانی ہے۔ وہ بڑے خوش مذاق اور رنگین مزاج آدمی تھے اور اس عمر میں بھی سج دھج کے نکلا کرتے تھے۔ ان کے جسم سے ہر وقت بہترین عطر کی خوشبو آیا کرتی اور انکے کوٹ کی اوپر والی جیب میں ہمیشہ ایک عطر بیز رومال سجا ہوا نظر آتا تھا۔ جموّں کے اخبار نویسوں میں وہ سب سے زیادہ نفاست پسند اور وضع دار اخبار نویس تھے۔ ڈیڈی کا شمار ریاست کے ان صحافیوں میں ہوتا تھا کہ جو صحافت سے زیادہ صحافت کی تاریخ میں اہم مقام رکھتے تھے۔ انہوں نے "امر" کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کر کے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے کہ جموّں میں سیاسی بیداری کے آثار نظر آنے لگے تھے اور ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے نکتۂ نظر کی وضاحت اور صراحت کے لئے الگ الگ اخبار جاری کئے تھے۔ اُنہی دنوں "پاسبان" بھی شائع ہونے لگا تھا۔ جس کے مدیر ایک مسلم کانفرنسی رہنما معراج الدّین تھے۔ یہ اخبار مسلمانوں کی نمائندگی کرتا تھا اور "امر" کے ساتھ اس کے قلمی معرکے اکثر بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے لیکن "امر" اور "پاسبان" کی معاصرانہ چشمک کبھی معراج الدّین اور شیورام گپتا کے دوستانہ تعلقات میں حائل نہیں ہوئی۔ دونوں ایڈیٹر ایک دوسرے کو اپنے اخبار میں گالیاں دینے کے بعد ایک ساتھ اُٹھتے، بیٹھتے، کھاتے، پیتے اور رات گئے تک جموّں کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ شیورام گپتا اور معراج الدّین ایک دوسرے کے اخبار کی ترتیب و تدوین میں امداد باہمی کے اصول پر قائم تھے۔ آج کے دور میں یہ باتیں اتنی عجیب لگتی ہیں کہ ان پر اعتبار کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اُس دور میں اس قسم کی کئی مثالیں مل جاتی ہیں۔

صحافی کی حیثیت سے ڈیڈی کا کیا مرتبہ تھا؟ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جب میں ان سے ملا تو "امر" برائے نام جاری تھا۔ مجھے آج تک کبھی اس کا ایک شمارہ دیکھنے کا بھی اتفاق نہیں ہوا ہے، لیکن ڈیڈی بضد تھے کہ امر باقاعدگی سے نکلتا ہے اور ریاست کا سب سے پرانا اخبار ہے۔ دراصل ڈیڈی کو یہ پیشہ بہت عزیز تھا۔ اور وہ ایک

اخبار نویس ہی کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتے تھے۔ اور پھر عمر کی اس منزل میں اخبار کے اشتہارات ہی ان کی آمدن کا ایک ذریعہ تھے اور اس لئے بھی "امر" کے وجود کو زندہ رکھنا ضروری تھا۔ "ڈیڈی" کے لئے اب دوستی اور دشمنی کا معیار یہ رہ گیا تھا کہ "امر" کی اہمیت کو تسلیم کر کے کون اسے اشتہار دیتا ہے اور کون اسے نظر انداز کرتا ہے اور جب انہیں کسی افسر کے متعلق یہ اندازہ ہو جاتا کہ وہ "امر" کو وہ درجہ نہیں دیتا کہ جو ڈیڈی کی نظروں میں اسے حاصل تھا، تو وہ اس کے خلاف برسر پیکار ہو جاتے اور جب تک اس سے امر کے وجود کی اہمیت نہ منواتے اُسے کبھی معاف نہ کرتے !

ڈیڈی کو اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ اخبار نویس کی حیثیت سے انکی اہمیت اب رفتہ رفتہ کم ہوتی جارہی ہے لیکن وہ ہتھیار ڈالنے کے قائل نہیں تھے۔ اور آخری دم تک زمانے کی بے رُخی اور عدم توجہی کے خلاف لڑتے رہے اور یہی وجہ ہے کہ زمانے کی سرد مہری اور ہم عصروں کی سازشوں کے باوجود "امر" نے ان کی زندگی کے آخری سانس تک ان کا ساتھ دیا۔

"ڈیڈی" ایک ذات نہیں ایک انجمن تھے۔ میرے کانوں میں ابھی تک ان کے بھرپور قہقہوں کی گونج سُنائی دیتی ہے۔ وہ ہر محفل کے رنگ میں رنگ جاتے اور انہیں کبھی بیگانگی کا احساس نہیں ہوتا۔ ساٹھ سال کی عمر میں اکثر آدمی 'بور' بن جاتے ہیں۔ لیکن ڈیڈی کی سدا بہار شخصیت، ان کی زندہ دلی اور ان کی شوخیاں مردہ دلوں میں بھی زندگی کی روح بھر دیتیں۔ وہ آخری دنوں میں بہت پریشان اور پراگندہ رہا کرتے تھے۔ لیکن ان کی یہ پریشانیاں صرف ان کی ذات تک محدود تھیں اور انہوں نے کبھی اپنے بہترین دوستوں کے ساتھ بھی اپنا دکھ درد نہیں بانٹا۔ وہ جب بھی کسی سے ملتے اپنی شگفتگی اور خوش مذاقی سے یہ تاثر قائم کرتے کہ وہ بے حد خوش اور حد درجہ مطمئن ہیں۔

ڈیڈی کی موت سے جموں کی صحافتی زندگی ہی نہیں، سماجی زندگی میں بھی ایک بہت بڑا خلا پیدا ہوا ہے۔ اور ڈیڈی جیسے لوگ چونکہ اب پیدا نہیں ہوتے۔ اس لئے ان کی جگہ ہمیشہ خالی رہے گی۔

(۱۵ مارچ ۱۹۷۰ء)

ہم موجّد ہیں، مقلّد نہیں!

۱۲ر مارچ کو جب ریاستی اسمبلی کے کچھ ممبروں نے کوچۂ یار کو چھوڑ کر درِ اغیار پر اپنی جبیں جھکا لی تو کچھ لوگوں نے حیرت اور افسوس کے ملے جُلے تاثرات کا اظہار کیا۔ پارلیمنٹ کے ایک برگزیدہ ممبر نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ "اب کشمیر میں بھی آیا رام، گیا رام کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔" ایک اور ممبر نے طنزیہ لہجے میں کہا کہ "اب کشمیر ہندوستان کے قریب آگیا ہے۔" بعض ممتاز اخبارات نے "آیا رام، گیا رام" کے عنوان سے اداریئے لکھ کر کشمیر میں اس وبا کے پھیل جانے کو نہایت تشویشناک قرار دیا۔ ممبرانِ پارلیمنٹ اور اخبارات کے اس ردعمل سے چراغ بیگ کو سخت افسوس اور مایوسی ہوئی۔ کیونکہ اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ جو چیز خالص ہماری "ایجاد" ہے وہ دراصل ہم دوسروں سے مستعار لے رہے ہیں۔ ممبرانِ پارلیمنٹ کی 'جہالت' تو درگذر کی جاسکتی ہے لیکن صحیفہ نگاروں اور قلم کاروں کی خطا بخشی ممکن نہیں، انہیں قلم چلانے سے پہلے تاریخی واقعات کی صحت کا خیال رکھنا چاہیئے اور ان کی اطلاع کے لئے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ملک میں "آیا رام، گیا رام" کے سیاسی عمل کے موجّد ہم ہیں۔ اور جو کچھ وہ ملک کے دوسرے حصّوں میں پچھلے تین چار سال سے دیکھ رہے ہیں وہ ہم نے آج سے ٹھیک ۱۷ سال پہلے شروع کیا تھا۔ اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں چراغ بیگ مندرجہ ذیل تاریخی شہادتیں پیش کرتا ہے :

۱۹۵۱ء میں شیخ محمد عبداللہ نے ۷۵ "آیا راموں" پر مشتمل ایک آئین ساز اسمبلی

کو نامزد کیا۔ اور ٹھیک دو سال تک اس اسمبلی کے ۷۵ کے ۷۵ آیا رام 'اپنے 'خالق' کی قسمیں کھاتے رہے لیکن ۹ اگست ۱۹۵۳ء کو شیخ محمد عبداللہ گرفتار کر لئے گئے اور بخشی صاحب نے اس اسمبلی سے شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری کو جائز، بروقت، برمحل اور موزوں و مناسب قرار دلوایا۔ آئین ساز اسمبلی کے "آیا رام" راتوں رات "گیا رام" بن گئے اور شیخ محمد عبداللہ کی اس درخواست پر کسی نے کان نہیں دھرا کہ وہ اسمبلی میں پیش ہو کر ممبران اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہی لوگ جو شیخ صاحب کو اپنی محبت، عقیدت اور وفاداریوں کا مرکز مانتے تھے۔ اب ان کا نام لینے میں بھی جھجھک محسوس کرنے لگے اور اسطرح ہندوستانی سیاست میں 'آیا رام کے گیا رام' میں بدل جانے کا عمل شروع ہوا۔

پھر ۱۹۵۷ء آیا بخشی غلام محمد اور خواجہ غلام محمد صادق میں ٹھن گئی، صادق صاحب نے اپنے وفاداروں سمیت نیشنل کانفرنس سے استعفیٰ دیکر ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈال دی۔ اور ریاستی اسمبلی میں پہلی بار ایک حزب مخالف قائم ہوئی۔ اور اسی کے ساتھ آیا رام اور گیا رام کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ اگر چراغ بیگ کی یادداشت صحیح ہے تو ڈوڈہ کے غلام احمد دیوا اس دور کے پہلے 'آیا رام، گیا رام' تھے، وہ پہلے غلام محمد صادق کے ساتھ مل گئے پھر چند دن کے بعد بخشی صاحب کی شرن میں آگئے۔ پھر کہاں گئے؟ ابھی تک کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن راحت، غلام رسول رینزو، اور بالآخر خود صادق صاحب بھی آیا رام اور گیا رام کی صف میں شامل ہو گئے۔ یہ وہ دور ہے کہ ہندوستان بھر میں ابھی تک ممبران اسمبلی کی وفاداریاں بدلنے اور خریدنے کا سلسلہ نہیں شروع ہوا تھا لیکن کشمیر سے روشنی کی ایک کرن نظر آنے لگی تھی جس نے اب شعلہ بن کر پورے ملک کو اپنی گرفت میں لیا ہے۔ پھر ۱۹۶۴ء کا سال آیا۔ بخشی غلام محمد نے دن رات ایک کر کے تقریباً چالیس ممبرانِ اسمبلی کو ورغلایا اور عین اس وقت جبکہ وہ صادق حکومت کے خلاف عدمِ اعتماد کی تحریک پیش کرنے ہی والے تھے۔ انہیں اور ان کے بعض ساتھیوں کو گرفتار کر کے اسمبلی کا اجلاس غیر معین عرصے کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔ پھر کیا تھا جو "آیا رام" بخشی صاحب کے دام میں پھنس کر "گیا رام" بن گئے تھے۔ وہ صادق صاحب پر دوبارہ ایمان لا کر ایک

بار پھر "آیارام" بن گئے۔ یہ وہ دور ہے کہ جب عدم اعتماد کی تحریک سے بچنے کیلئے ہندوستان کی کسی دوسری ریاست میں کوئی وزیر اعلیٰ اسمبلی کو غیر معین عرصے کے لئے ملتوی کروانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

۱۹۶۷ء کے عام انتخابات کے بعد کانگریس نے اتنی بھاری "اکثریت" حاصل کی کہ بظاہر آیا راموں اور گیا راموں کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود بیر یحییٰ صدیقی اور اس کے بعد سردار سریندر سنگھ اور اختر نظامی نے نیشنل کانفرنس کا لبادہ اُتار کر کانگریس کا پاجامہ پہن لیا۔ سردار سریندر سنگھ نے اب ایک اور پینترا بدل کر آیا سنگھ اور گیا سنگھ کا نام روشن کر دیا ہے۔ اس لئے ۳۱ مارچ کو خواجہ غلام محمد صادق نے گورنر سے اسمبلی کو غیر معین عرصے کے لئے ملتوی کرانے کی سفارش کر کے کوئی نئی بات نہیں کی ہے بلکہ ایک پُرانی روایت کو زندہ کر دیا ہے۔ صادق صاحب کے مخالفوں کو اس بات کا شکرگذار ہونا چاہیئے کہ انہوں نے سید میر قاسم اور ان کے بعض سرکردہ ساتھیوں کو گرفتار نہ کر کے بہت حد تک روایت سے بغاوت کی ہے۔ کیونکہ شیخ محمد عبداللہ اور بخشی غلام محمد کی گرفتاری کے بعد آج سید میر قاسم کی گرفتاری یقیناً شاعرانہ انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتی!

اس مسئلے کا ایک اور پہلو ہے اور وہ یہ کہ جو ممبران اسمبلی دن میں چار چار بار اپنا ایمان بدل کر اس اعتماد کی تجارت کریں، جو لوگوں نے انہیں بخشا ہے۔ ان کے متعلق ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیئے؟ اس مسئلے پر اگلی اشاعت میں رائے زنی کروں گا۔

(۲۳ مارچ ۱۹۷۰ء)

اِمتحانات میں لبرلائزیشن

کون کہتا ہے کہ "کشمیر شاہ راہِ ترقی" پر گامزن نہیں ہے؟ پلوامہ تحصیل ایجوکیشن آفس پر مسلح ڈکیتی سے لے کر امتحانی مراکز پر نقل نویسی کے منظم تجربات" اس شاندار ترقی" کے عظیم الشان نمونے ہیں، وہ دن گئے کہ جب بزدل کشمیری پڑوسیوں کی مرغیاں چرا کر اپنے ذوقِ گناہ کی تسکین کیا کرتے تھے۔ اب وہ جنگلات سے لاکھوں روپے کی لکڑی، سرکاری سٹوروں سے ہزاروں من سیمنٹ، قومی خزانے سے کروڑوں روپے، کاغذاتِ نامزدگی میں سے حلف نامے اور بیلٹ بکسوں سے سینکڑوں ووٹ چرا کر بھی مطمئن نہیں۔ اور اسی لئے اب اس وادیٔ گلپوش میں مسلح ڈاکہ زنی کے تجربات بھی شروع ہو گئے ہیں۔ پلوامہ تحصیل ایجوکیشن آفس پر ڈاکہ ڈال کر ستر ہزار روپے کی حقیر رقم اُڑا لے جانا اس نئے تجربے کی ایک حقیر سی ابتدا رہے۔ اور چراغ بیگ کو امید ہے کہ برادرانِ وطن اس میدان میں بھی اپنا نام روشن کریں گے۔ بالکل اسی طرح، جسطرح ہمارے نوجوان آجکل امتحانی مراکز پر "نقل نویسی" میں دادِ شجاعت دے رہے ہیں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب چراغ بیگ جیسے نالائق اور ناقابل طالب علم امتحانی مراکز میں یوں داخل ہوتے تھے کہ جیسے کسی مندر یا مسجد میں قدم رکھ رہے ہوں کسی لڑکے کو نقل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا جاتا تو یوں محسوس ہوتا کہ وہ مسجد سے جوتے چرانے کے الزام میں پکڑا گیا ہو۔ اولاً کسی طالب علم کو نقل کرنے کی جرأت ہی نہیں ہوتی، اور جب کوئی مادر پدر آزاد قسم کا لڑکا اس جرم کا ارتکاب کرتے ہوئے پکڑا جاتا تو امتحانی

ہال میں بیٹھے ہوئے تمام طالب علموں کے پسینے چھوٹ جاتے اور مجرم طالب علم اتنا ذلیل اور خوار ہو جاتا کہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکتا۔ اور کل ملا کر ایسے طالب علموں کی تعداد ایک فیصدی سے زیادہ نہ تھی کہ جو امتحانی مراکز پر نقل نویسی کرنے کی کوشش میں پکڑے جاتے، لیکن یہ صرف دس سال پرانی بات ہوتے ہوئے بھی بہت پرانی بات معلوم ہوتی ہے۔ پچھلے دس سال کے دوران چونکہ کشمیر نے زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کی ہے اس لئے امتحانی مراکز پر نقل نویسی کے اطوار، انداز اور آداب بھی بہت بدل گئے ہیں۔ اب نقل کرنا طالب علم کا انفرادی فعل تصور نہیں ہوتا۔ ایک اجتماعی ضرورت بن کر رہ گیا ہے۔ اور جن لوگوں کو اس سال امتحانی مراکز پر نقل نویسی کے مظاہرے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ انہیں اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں امتحانات کے طریقِ کار میں ایک انقلاب رونما ہو گیا ہے۔ چراغ بیگ نے سُنا ہے کہ امریکہ میں امتحانات کا طریقہ یہ ہے کہ طالب علموں کو امتحان ہال میں کتابیں لے جانے کی اجازت ہے اور وہ کتابوں سے مدد لے کر سوالات حل کر سکتے ہیں۔ امریکہ میں ایسا ہوتا ہے یا نہیں لیکن کشمیر میں گذشتہ دو سال سے یہ تجربہ چالو کر دیا گیا ہے۔ اور اس سال ہر مرکز پر طالب علموں کو کتابیں مہیا کرنے کے لئے خاص انتظامات کئے گئے تھے۔ بالفاظ دیگر ہماری ریاست طریقہ تعلیم کو بدلے بغیر طریقہ امتحانات بدلنے میں کامیاب رہی ہے۔ اور اس طرح امتحانات کے شعبے میں ہم چاند پر جانے والے امریکیوں سے بھی کئی قدم آگے ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر کسی کو کشمیر کی بے پناہ ترقی میں شبہ ہے تو وہ یقیناً پاکستانی جاسوس ہے اور اُسے ملک بدر کر دینا چاہیئے۔

یہ امر باعثِ اطمینان ہے کہ ہمارے طالب علموں نے امتحانی مراکز میں "نقل نویسی" کو ایک فنِ لطیف کا درجہ دیا ہے۔ پرانے زمانے میں نقل کرنے والا طالب علم بہت ہراساں اور پریشان رہا کرتا تھا۔ اُسے نقل کے کاغذات چھپانے کے لئے بڑی زحمت اُٹھانا پڑتی لیکن آج کا طالب علم نہ خدا سے ڈرتا ہے اور نہ ممتحن سے۔ وہ کاغذات کو چھپانے کی بجائے خالص امریکن طرز پر انہیں اپنے امتحانی ڈیسک پر یوں سجاتا ہے کہ جیسے کوئی بازاری ڈاکٹر

مجمع لگانے سے پہلے اپنی ایجاد کردہ دوائیاں ترتیب سے لگا دیتا ہے۔ پہلے امتحان کی نگرانی کرنے والا استاد سی، آئی، ڈی کے افسر کی طرح طالب علم کی ہر حرکت کا بغور مطالعہ کرتا تاکہ کہیں وہ کوئی ناجائز طریقہ استعمال نہ کرے۔ اب ممتحن اس طرح چوری چھپے پھرتا رہتا ہے کہ کہیں نقل کرنے والے طالب علم کی اس پر نظر نہ پڑے۔ اور وہ اس کا بُرا نہ منائے۔ جن قدامت پسند، زائدالمیعاد اساتذہ نے اس نئے انقلاب کو روکنے کی سعیٔ ناتمام کی ان کے بارے میں نہ طالب علموں کی رائے اچھی ہے اور نہ ان کے والدین کی اور ہمارے "بہادر" طالب علموں نے اساتذہ کو خبردار کیا ہے کہ اگر وہ پُرانی روش کو ترک کر کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش نہ کریں تو ان کی ہڈی پسلی ایک کر کے ان کے ذہنوں کو نئے انقلاب سے روشناس کرا دیا جائے گا۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق ریاستی حکومت نے طریقۂ امتحانات میں نقل نویسی کو ایک انقلابی قدم قرار دیکر ان تمام طالب علموں کی حوصلہ افزائی کرنے کا فیصلہ کیا ہے کہ جنہوں نے اپنی خداداد قابلیت، ہمت اور جرأت سے امتحانات کے فرسودہ اور بوسیدہ نظام کو خالص امریکی طرز پر ڈھالنے کی ابتدا کی۔ وزارتِ تعلیم کے ایک ترجمان نے چراغ بیگ کو بتایا کہ امتحانات کے سلسلے میں نقل نویسی کی تمام سہولیات کے باوجود اگر کچھ طالب علم اس سال فیل ہو جائیں تو انہیں اگلے سال کسی اسکول یا کالج میں داخلہ نہیں دیا جائے گا۔ کیونکہ اس سے صرف یہ ظاہر ہوگا کہ ان نامرادوں کو نقل کرنے کا سلیقہ بھی نہیں۔ اور یہ فیل ہو کر دراصل یہ بات ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس ریاست میں تعلیم کا معیار پست ہے۔ ترجمان نے مزید کہا کہ نئے طریقۂ امتحانات کو وزیر تعلیم خواجہ غلام محمد صادق اور نائب وزیر تعلیم شری نور محمد کی آشیرواد حاصل ہے۔ اور یہ صادق سرکار کی لبرلائزیشن کی پالیسی کا ایک حصّہ ہے کہ جس کے نتیجے میں ریاستی عوام کو شہری آزادیاں اور سیاسی حقوق حاصل ہو گئے ہیں۔ اس اجتماعی تجربے کو نئی نسل کے "شاندار" مستقبل کی ایک "تابندہ" علامت سمجھتا ہوں۔ اور مجھے امید ہے کہ آیندہ ہمارے نوجوان طالب علم سال بھر کتابوں کے کیڑے بنے رہنے کی بجائے اپنا وقت "بہتر" کاموں میں صرف کریں گے۔ مجھے ان تمام "بیوقوفوں" کے

ساتھ ہمدردی ہے کہ جواب بھی امتحان پاس کرنے کے فرسودہ طریقوں پر رائج اعتبار کر کے اپنا قیمتی وقت کتابوں کے مطالعے میں صرف کرتے ہیں۔ میں اس بیان کو ایک لطیفے پر ختم کر کے قوم کے نئے "معماروں" کو سلام کرتا ہوں۔

سرینگر کے ایک امتحانی مرکز پر ایک طالب علم کو باہر سے نقل سپلائی ہو رہا تھا کہ نقل بھیجنے والے کے پاس کاغذ ختم ہو گیا۔ اس نے ایک چپراسی سے کاغذ مانگا تو چپراسی نے اپنی جیب سے ایک کاغذ کا ورقہ نکال کر اسے دیا۔ یہ چپراسی کی درخواست رخصت تھی کہ جس پر پرنسپل نے یہ حکم لکھا تھا کہ ایک ہفتے کی بجائے چار دن کی رخصت منظور کی جاتی ہے۔ نقل سپلائی کرنے والے نے جلدی میں اسی درخواست کی پشت پر نقل تحریر کر کے اندر بھیج دی۔ امتحان دینے والے طالب علم نے درخواست کی پشت پر درج تحریر کو نقل کرنے کے بعد چپراسی درخواست رخصت بھی امتحانی کاپی پر نقل کر لی۔ اور آخر میں پرنسپل کا وہ حکم نامہ بھی کہ جس میں ہفتے کی بجائے چار دن کی رخصت منظور کی گئی تھی۔ یہ لطیفہ بالکل سچا ہے اور اس سے اندازہ ہو گا کہ ہم کس طرح نقل نویسوں کی ایک پوری نسل تیار کرنے میں مصروف ہیں۔

ادھر ایک اطلاع کے مطابق طالب علموں نے نقل نویساں کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد ڈال دی ہے۔ اور اس انجمن کا مقصد نقل کرنے والے طالب علموں کے مفادات کی نگرانی کرنا ہے۔

(۱۵ ر اپریل ۱۹۷۰ء)

تجاہلِ عارفانہ؟ تغافلِ مجرمانہ؟

بہار میں سوکھا پڑجائے تو ڈنمارک کے لوگ چندہ جمع کر کے سوکھے سے متاثر لوگوں کو غذائی اجناس کے تحفے بھیجتے ہیں۔ راجستھان قحط کی زد میں آتا ہے تو انگلینڈ کے بچے اپنے جیب خرچ کی رقم بچا کر راجستھانی بچوں کے لئے دودھ کے ڈبے بھیجتے ہیں۔ بنگال پر افتاد پڑتی ہے تو امریکہ کے ڈاکٹروں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ اور وہ ہزاروں میل کا سفر طے کر کے سسکتی ہوئی انسانیت کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لئے چلے آتے ہیں۔ لیکن کبھی آپ نے یہ بھی سُنا ہے کہ بہار میں بنگال کے مصیبت زدوں کی امداد کے لئے کوئی تنظیم قائم ہوئی ہے؟ یا بنگال میں راجستھان کے بھوکے بچوں کا پیٹ بھرنے کے لئے کسی رئیس نے پھوٹی کوڑی بھی دی ہے؟ ہاں یہ خبریں چراغ بیگ نے اخباروں میں ضرور پڑھی ہیں کہ امریکہ ڈنمارک اور انگلینڈ سے مصیبت زدہ بچوں کے لئے آئے ہوئے دودھ کو چور بازار میں فروخت کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود امریکی اور برطانوی لوگ، لامذہب، بے دین اور گمراہ ٹھہرے اور ہم ہندوستانی پراچین سنسکرتی اور روحانیت کے سب سے بڑے علمبردار، ہمیں دعویٰ ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے مذہب بُدھ مت، اور ہندو دھرم اس سرزمین میں پیدا ہوئے۔ پھلے پھولے اور پھر دنیا میں پھیل گئے۔ ہمیں یہ بھی دعویٰ ہے کہ ایک اور عظیم مذہب اسلام کے سب سے زیادہ ماننے والے اسی ملک میں رہتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے ہمارا روحانی ورثہ عظیم الشان ہی نہیں بے نظیر بھی ہے! آئیے اس پس منظر میں اپنے کشمیر کی بات کریں کہ جو رشیوں، منیوں، صوفیوں اور عالموں کی آماجگاہ رہا ہے۔

جہاں آج اسلام کے ماننے والوں کی تعداد ۹۵% سے بھی زیادہ ہے۔ جہاں ایک نہیں درجنوں مذہبی اور سیاسی جماعتیں کام کر رہی ہیں۔ جہاں مسجدوں اور مندروں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور جہاں پچھلے آٹھ دس برسوں میں موٹر کاروں کی تعداد میں بھی خاصی ترقی ہوئی ہے۔ اسی کشمیر کے ایک علاقہ پلوامہ میں پچھلے دو تین ہفتوں میں پے در پے آگ کی کئی خوفناک وارداتیں رونما ہوئیں۔ سینکڑوں مکان جل کر راکھ ہو گئے لاکھوں روپے کی جائداد خاک میں مل گئی۔ ہزاروں من غذائی اجناس تباہ و برباد ہو گئے۔ مسجدیں اور مدرسے بھی آگ کی تباہ کاریوں سے محفوظ نہ رہ سکے اور ہزاروں لوگ اپنی زندگی کا سارا اثاثہ کھو کر بے خانماں ہو گئے، کریم آباد، ولیو، درمو ہر جگہ ناگہانی آگ نے ان دیہات کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے اور مصیبت زدوں کی حالت قابلِ رحم ہے۔ خاص طور پر کریم آباد کے تباہ حالوں کا دُکھ ناقابلِ برداشت ہے۔ یہ پورے کا پورا گاؤں اُجڑ کر خاک میں مل گیا ہے۔ میں نے پچھلے ہفتے جب اخباری نمائندوں کی ایک جماعت کے ساتھ اس گاؤں کو دیکھا تو اس وقت بھی کریم آباد جل رہا تھا اور کھنڈروں کے قریب مصیبت زدہ لوگ اپنے آنسوؤں سے اس سُلگتی ہوئی آگ کو بجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں پوچھتا ہوں کہ کریم آباد کی تباہ کاری سے متاثر شدہ لوگوں کی امداد کے لئے کس مذہبی، سیاسی یا سماجی ادارے نے امداد مہیّا یا منظم کرنے کی اپیل کی ہے؟ کس سیاسی لیڈر نے اپنے سب کام چھوڑ کر کریم آباد، ولیو یا درسو کے لوگوں کو بحال کرنے کے لئے کوئی امدادی فنڈ کھولنے کا اعلان کیا ہے؟ کس مذہبی رہنما نے اپنے منبر کی بلندی سے نیچے اُتر کر مصیبت زدہ لوگوں کے آنسو پوچھنے کی کوشش کی ہے؟

یہ ٹھیک ہے کہ محاذ رائے شماری کے صدر میرزا افضل بیگ اور عوامی ایکشن کمیٹی کے قائد میر واعظ فاروق نے کریم آباد اور ولیو دونوں جگہوں کا "دورہ" فرمایا ہے۔ لیکن بیگ صاحب اور فاروق صاحب کے "دوروں" سے آگ کی تباہ کاریوں کے نشان تو نہیں مٹ سکتے، ان میں کسی نے ان بدنصیب لوگوں کو دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا

ہونے کے قابل کرنے کے لئے کیا کچھ کیا ہے ؟ اور میں جب بیگ صاحب اور فاروق صاحب کی بات کرتا ہوں تو میرا تخاطب صرف ان دو لیڈروں سے ہی نہیں۔ ان تمام آسودہ حال، ذی شعور اور خوش قسمت لوگوں سے ہے کہ جو مصیبت کے مارے ہوؤں کی مدد کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ آخر ہم لوگوں میں اپنے مصیبت زدہ، بدنصیب اور تباہ حال بھائیوں کی مدد کرنے کی حس مردہ کیوں ہوگئی ہے ؟ ہم صرف حکومت سے مدد کا مطالبہ کرکے اپنے فرائض سے سبکدوش ہوجاتے ہیں۔ حالانکہ ہم چاہیں تو ان ناگہانی حادثات کا شکار ہونے والوں کیلئے انفرادی طور پر بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ ہم امدادی کمیٹیاں قائم کر سکتے ہیں، شہر اور قصبوں اور دیہات کے آسودہ حال لوگوں سے چندہ وصول کر سکتے ہیں۔ جن لوگوں کا سارا اثاثہ آگ کی نذر ہو گیا ہے انہیں فوری امداد کے طور پر ضروریاتِ زندگی بہم کر سکتے ہیں۔ تباہ حال بچوں کے لئے کتابیں اور کپڑے جمع کر سکتے ہیں لیکن ہم کچھ نہیں کرتے ہم مصیبت زدوں سے زبانی ہمدردی کرکے انہیں بھول جاتے ہیں۔ ہم مسجدوں کی تعمیر کے لئے چندہ دینے میں گریز نہیں کرتے، خانقاہ کے مجاوروں کی جیبیں بھرنے میں تغافل نہیں کرتے، دُعائیہ مجلسوں کے اہتمام میں اصراف کرنے میں پیش پیش ہیں اور شادی بیاہ کے علاوہ غمی کی تقریبات پر بھی ہزاروں روپیہ پھونک دیتے ہیں۔ لیکن کریم آباد کے مصیبت زدوں اور ولیو کے تباہ حالوں کی بحالی کے لئے ہم نہ خود پیسہ دے سکتے ہیں اور نہ کسی دوسرے کو اس کی تحریک یا ترغیب دے سکتے ہیں! افسوس اس بات کا ہے کہ لندن نیویارک اور یوروپ کے دوسرے بڑے شہروں میں کریم آباد کی تباہی کا احوال سُنانا ممکن نہیں۔ ورنہ مجھے یقین تھا کہ وہ کافر، ملحد لادین، گمراہ سامراجی کریم آباد کے مصیبت زدوں کی امداد کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کرتے، انہیں نہ خدا کا خوف ہے اور نہ جنت کا لالچ، وہ کافر ہوتے ہوئے بھی انسان ہیں، اور ہم مسلمان ہونے کے باوجود اپنے سینے میں انسان کا دل نہیں رکھتے ؟

(۲۳ر اپریل ۱۹۷۰ء)

شخصیت

(شری) نور محمدؐ

بعض لوگوں کا گٹ اپ اتنا خراب ہوتا ہے کہ انسان پہلی ہی نظر میں ان سے بدظن ہوجاتا ہے۔ نائب وزیر تعلیم و سیاحت نور محمد کا شمار بھی ان ہی لوگوں میں ہوتا ہے کہ جو پہلی ہی ملاقات میں ایک ناگوار تاثر چھوڑ جاتے ہیں، وہ دیکھنے میں بھلے آدمی نہیں لگتے اور ان کی گفتگو میں تصنع اور تحکم کا احساس غالب ہوتا ہے۔ وہ ایک ذہین، فہیم اور باشعور نوجوان ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ذہنی تہذیب اور شخصی تربیت کے وہ مواقع میسّر نہیں رہے ہیں جو ذہانت اور فطانت کو ایک سانچہ عطا کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں نور محمد کو بُری صحبت نے بہتر آدمی بننے سے روک دیا ہے۔

نور محمد کے دوست ان سے اس لئے ناراض ہیں کہ وہ منسٹر کیوں ہوگیا۔ میں نے اس کے اکثر دوستوں کو اُسے صرف اس لئے گالیاں دیتے سُنا ہے کہ "کل تک اُن کے ساتھ دربدر پھر رہا تھا آج منسٹر ہوگیا ہے"۔ اس کے دشمن اس سے اس لئے خفا ہیں "کہ اگر نور محمد منسٹر ہوسکتا ہے تو وہ کیوں نہیں ہوسکتے"۔ اس طرح بچارا نور محمد بیک وقت دوستوں اور دشمنوں کی گالیوں کا موضوع بن گیا ہے۔ ویسے بھی اس میں دوست کم دشمن زیادہ بنانے کی صلاحیت بدرجۂ اُتم موجود ہے۔

نور محمد کی پیدائش کا حادثہ سال ۱۹۲۹ء میں سری نگر کے ایک غریب گھرانے میں پیش آیا، اور اس کا بچپن ایک ایسے ماحول میں گذرا کہ جہاں زندہ رہنے کے لئے زندگی کو زہر سمجھ کر

پینا پڑتا ہے۔ نور محمد کی شخصیت کا کھردرا پن اور اس کے لہجے کی تلخی اس ماحول کی یادگار ہے۔ لیکن ان کے والد ایک باہمت اور دور اندیش انسان تھے۔ انہوں نے بہت سی مشکلات کے باوجود اپنے بیٹے کو کالج بھیجنے کا فیصلہ کیا اور کالج میں نور محمد کو ترقی پسندی اور کمیونزم کی ہوا لگ گئی۔ غریب باپ کا بیٹا امیر بننے کی کوشش کرنے کی بجائے، دنیا بھر کے امیروں کے خلاف ایک "متحدہ محاذ" میں شامل ہو گیا۔ کمیونسٹ لٹریچر کے مطالعے کے علاوہ نور محمد نے ہڑتالوں، ہنگاموں، مباحثوں اور مناظروں میں بھی حصّہ لینا شروع کیا اور ۱۹۴۶ء میں "کشمیر چھوڑو" تحریک کے دوران وہ پہلی بار جیل گیا۔ ۱۹۴۶ء کے بعد وہ نیشنل کانفرنس میں "ترقی پسند" گروہ کا ایک سرگرم رکن تھا۔ لیکن ابھی اسکی حیثیت کو باقاعدہ طور پر تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ ۱۹۵۳ء میں شیخ صاحب کی گرفتاری کے بعد ہر "ترقی پسند" کا بھاؤ بڑھ گیا اور نور محمد کو بھی آزمودہ، باشعور اور قابلِ اعتبار کارکنوں میں شمار کیا جانے لگا۔ لیکن بخشی صاحب اور ترقی پسندوں کا 'ہنی مون' زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔ اور ۱۹۵۵ء کے آغاز میں ہی بخشی غلام محمد اور خواجہ غلام محمد صادق (جن کو کشمیر کے ترقی پسندوں کے ذہنی پیغمبر کا درجہ حاصل تھا) کے درمیان اختلافات رونما ہونے شروع ہو گئے۔ جون ۱۹۵۷ء میں صادق صاحب اور ان کے ساتھیوں کی نیشنل کانفرنس اور حکومت سے علیحدگی کی صورت میں نمایاں ہو گئے، اس جنگ میں نور محمد نے خالص نظریاتی بنیاد پر صادق صاحب کا ساتھ دیا۔ اور ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کے ایک سرگرم لیڈر کی حیثیت سے اُنہوں نے بخشی غلام محمد کے خلاف بھرپور جدوجہد کی۔ نور محمد، موتی لعل مصری۔ اوتکار ناتھ ترسل اور بہت سے دوسرے کارکن ڈیموکریٹک کانفرنس کو ایک کمیونسٹ تحریک کے طور پر چلانے میں مصروف تھے، کہ درگا پرشاد در کے پاؤں شل ہو گئے۔ انہوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا اور وہ بخشی غلام محمد کے ساتھ سمجھوتہ بازی میں مصروف ہو گئے۔ ڈی۔ پی۔ در، خواجہ غلام محمد صادق اور سیّد میر قاسم کو بھی شیشے میں اُتارنے میں کامیاب ہو گئے اور ایک دن جبکہ نور محمد اور اس کے دوسرے ساتھی اشتراکی انقلاب کا خواب دیکھنے میں مصروف تھے۔ یہ خبر آئی کہ صادق، ڈی۔ پی اور قاسم نے اپنے گناہوں کی معافی مانگ

کر بخشی صاحب کی قیادت پر مکمل اعتماد اور اعتقاد کا اظہار کیا ہے۔ اس غیر متوقع خبر نے بہت سے لیڈروں اور کارکنوں کو اتنا زبردست صدمہ پہنچایا کہ موتی لعل مصری، رام پیارا صراف اور کشن دیو سیٹھی کچھ عرصے کے لئے پاگل ہو گئے۔ لیکن نور محمد فوراً ہی سنبھل گئے۔ انہوں نے انقلاب کے راستے کو خیرباد کہہ کر اقتدار کے آستان پر اپنی جبینِ نیاز خم کر دی۔ وہ ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس سے سیدھے بخشی عبدالرشید کے پاس گئے۔ اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس طرح لینن کا شیدائی، سب کچھ بھول کر بخشی عبدالرشید کا فدائی بن گیا!

یہ دور نور محمد کی سیاسی زندگی کا سب سے مشکل، صبر آزما اور کٹھن دور تھا۔ نور محمد کے خلوص اور اس کی وفاداری کا امتحان لینے کے لئے اُسے سخت سے سخت آزمائش میں ڈال دیا گیا۔ اُسے رشید صاحب کا حقہ اُٹھانے سے لے کر ان کے جوتوں کے تسمے باندھنے کی خدمت بھی سرانجام دینا پڑی۔ اور یہی نہیں بلکہ رشید صاحب کے ہر معتمد کا اعتبار حاصل کرنے کے لئے نور محمد کو فرداً فرداً سب کی خوشامد کرنا پڑی۔ دو سال تک اس تربیت گاہ اور امتحانی مرکز پر اپنی وفاداری کا امتحان دینے کے بعد نور محمد کو ۱۹۶۳ء میں رشید صاحب کے دربار سے سرٹیفکیٹ عطا ہو گیا۔ اور انہیں ایک ضمنی انتخاب میں امیدوار کھڑا کر کے اسمبلی کا ممبر منتخب کروا دیا گیا، لیکن نور محمد کی بدقسمتی یہ کہ ان کے ممبر منتخب ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد بخشی صاحب کے اقتدار کا سورج آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں کی جانب لڑھکنا شروع ہو گیا۔ بخشی صاحب نے کامراج پلان کے تحت استعفیٰ دیکر جو داؤ کھیلا تھا، وہ اُلٹا پڑ گیا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے ان کا استعفیٰ منظور کر کے بہت سے "نور محمدوں" کی دنیا ویران کر دی تھی۔ اور عین اس وقت جبکہ نور محمد کو اپنی قربانیوں اور وفاداریوں کا صلہ ملنے والا تھا۔ بخشی صاحب انہیں چھوڑ کر جا رہے تھے۔ لیکن ابھی ایک امید باقی تھی!

بخشی صاحب کے بعد جب نیشنل کانفرنس لیجسلیچر پارٹی کے لیڈر چننے کا سوال سامنے آیا، تو نور محمد اور اس کے دوسرے ساتھیوں نے صادق صاحب کے انتخاب کی

سخت مخالفت کی۔ لیجسلیچر پارٹی کے اندر اور باہر نور محمد، پیر غیاث الدین، محمد ایوب خان اور خواجہ شمس الدّین، صادق صاحب کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ نور محمد اور اس کے ساتھی، بخشی صاحب کے بھائی بخشی عبدالرشید کو ان کا جانشین بنانے کے حق میں تھے اور بخشی صاحب کی منت سماجت کے باوجود ان کی مخالفت اور مزاحمت کم نہ ہوئی۔ بالآخر قرعۂ فال خواجہ شمسُ الدین کے نام نکلا اور نور محمد نے شمس صاحب کو اپنا لیڈر مان لیا۔ شمس صاحب کی سہ ماہی وزارت کے بعد جب صادق صاحب برسرِ اقتدار لائے گئے۔ تو نور محمد کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور اپنی غلطی کی تصیح کے لئے اُنہوں نے ایک بار پھر صادق صاحب کو اپنے اعتماد کی دولت سونپ دی۔ اب نور محمد، بخشی غلام محمد اور بخشی عبدالرشید کی بُرائی کرنے میں پیش پیش تھے۔ اور صادق صاحب نے انہیں پارلیمنٹری سکریٹری بنا کر ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔ ۱۹۶۶ء میں نور محمد کو کیوبا مغربی یورپ اور سوویت روس کا دورہ کرنے کے لئے ہندوستانی وفد کا ایک ممبر نامزد کر دیا گیا اور وہ واپسی پر اپنے آپ کو دوسرے "ترقی پسندوں" کے مقابلے میں زیادہ ترقی پسند سمجھنے لگے۔

۱۹۶۷ء کے عام انتخابات میں وہ سری نگر کے حلقہ رٹنکی پورہ سے کانگریس کی ٹکٹ پر کامیاب ہوگئے اور صادق صاحب کی وزارت میں تعلیم اور ٹورزیم کے نائب وزیر مقرر ہوئے!

نائب وزیر کی حیثیت سے نور محمد اپنے دوسرے ساتھیوں کے مقابلے میں زیادہ متحرک، فعال اور سرگرم ثابت ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی سرگرمی سے تعلیم یا ٹورزیم کی صحت کو کوئی ٹھوس فائدہ نہیں پہنچ سکا ہے۔ ان کے دور میں استادوں کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کو معیوب سمجھنے کا احساس ختم ہوگیا، اور ہمارے تعلیمی اداروں میں نظم و نسق کا فقدان نظر آنے لگا۔ نور محمد نائب وزیر بننے کے باوجود ایک عام سیاسی کارکن کی سطح سے اُوپر نہیں اُبھرے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے دُرگا پرشاد در کو اپنا "آئیڈیل" منتخب کر لیا اور اسی لئے گفتار، کردار اور لب و لہجہ میں وہ اکثر ان ہی کی کاپی کرتے ہیں۔ اس طرح نور محمد کی شخصیت اور انفرادیت

اُبھرنے کی بجائے، وہ درگا پرشاد در کی کاربن کاپی معلوم ہوتے ہیں۔ صادق صاحب اور میر قاسم کی حالیہ کشمکش میں نور محمد یوں تو صادق صاحب کے وفاداروں میں شامل تھے اور قاسم گروپ کا ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ نور محمد کو وزارت سے برطرف کر دیا جائے۔ اب صادق صاحب اور قاسم صاحب میں صلح ہو گئی ہے۔ اور قاسم گروپ سے وابستہ لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کشمکش میں نور محمد ان ہی کے ساتھ تھا۔ یہ دعویٰ کہاں تک صحیح ہے، اس کا جواب نور محمد ہی دے سکتے ہیں۔

(۲۳ ، اپریل ۱۹۷۰ء)

واہگہ کی سرحد

پچھلے دنوں جب چراغ بیگ کسی کام سے امرتسر گیا تھا۔ تو ایک شام کو واہگہ دیکھنے کا خیال آیا۔ واہگہ امرتسر سے چالیس اور لاہور سے اٹھارہ میل کی دوری پر واقع ہے۔ اور یہ دونوں ملکوں کے درمیان "بین الاقوامی سرحد" کی نشان دہی کرتا ہے۔ ۱۹۶۵ء کی لڑائی سے پہلے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان آمد و رفت کا سب سے آسان، کم خرچ اور بالانشیں راستہ یہی تھا۔ امرتسر سے لاہور تک کا فاصلہ زیادہ سے زیادہ ایک سوا گھنٹے میں طے ہو جاتا تھا اور دونوں شہر ایک دوسرے کے ساتھ ریل کے ذریعے ملے ہوئے تھے۔ لیکن آج صرف پانچ سال بعد یہ سب باتیں خواب معلوم ہو رہی ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی لڑائی کے بعد سے واہگہ کی سرحد کو مقفل کر دیا گیا ہے، اور اب سمگلروں کے سوا کوئی شخص پاکستان سے ہندوستان میں اور ہندوستان سے پاکستان میں داخل نہیں ہو سکتا!

چراغ بیگ واہگہ پہنچا تو بارڈر سیکورٹی فورس کے ایک خوش اخلاق افسر نے اس کا استقبال کیا۔ دور کچھ فاصلے پر سڑک کے عین وسط میں دو بڑے بڑے پھاٹک نظر آئے۔ جن پر ہندوستان اور پاکستان کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ ہندوستان اور پاکستان کے سرحدی "چیک پوسٹ" ہیں جو صبح ۷ بجے سے لیکر شام ۷ بجکر دس منٹ تک رہتے ہیں۔ سات بجکر دس منٹ پر Retreat کی تقریب منعقد ہوتی ہے۔ اور میں دراصل یہی 'تقریب' دیکھنے کے لئے آیا تھا لیکن

ابھی سات بجنے میں بہت دیر باقی تھی۔ اس لئے میں بی، ایس، ایف کے خوش اخلاق افسر کے ساتھ "بین الاقوامی" سرحد پر ٹہلنے کے لئے نکل گیا۔ کچھ ہی دور جاکر مجھے اندازہ ہوا کہ ایک ملک کو مذہب اور سیاست کی بنیادوں پر تقسیم کرنے کا "سنجیدہ" کام کس درجہ مضحکہ خیز اور بے ہودہ نتائج کا حامل ہوسکتا ہے۔ ٹہلتے ٹہلتے کبھی میرے قدم پاکستان کی سرزمین پر پڑ جاتے اور میں یہ سوچنے لگتا کہ ہندوستان اور پاکستان ایک دوسرے کے کتنے قریب ہیں۔ کئی جگہ پاکستان کی زمین میں اُگنے والے پودے کچھ اس طرح ہندوستان کی سرزمین جھکے نظر آتے کہ ان کو جُدا کرنے والی سرحد کا وجود ہی نظر نہیں آتا۔ دونوں طرف کے کسان اپنے کھیتوں میں کام کرتے ہوئے اس طرح خوش گپی میں نظر آرہے تھے۔ کہ جیسے اُنہوں نے ابھی ملک کے تقسیم ہونے کی خبر ہی نہ سُنی ہو۔ دونوں طرف کی پگڈنڈیاں ایک دوسرے میں کچھ اس طرح اُلجھی ہوئی نظر آتی ہیں کہ بی، ایس، ایف کا افسر میرے ساتھ نہ ہوتا تو میں دو ڈھائی میل کے اس سفر میں کئی بار سرحد پار کرنے کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوچکا ہوتا۔ سرحد کے دونوں طرف کہیں کہیں پاکستانی رینجر اور ہندوستان کے سپاہی گشت کرتے ہوئے نظر آئے اور مجھے معلوم ہوا کہ ہندوستانی اور پاکستانی سرحدی پولیس کے افسروں اور سپاہیوں کے تعلقات انتہائی دوستانہ اور خوشگوار ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ چائے پیتے ہیں۔ کبھی کبھی ایک دوسرے کو کھانا بھی کھلاتے ہیں۔ اور اس طرح ایک دوسرے کے دُکھ درد میں بھی شریک رہتے ہیں۔ واہگہ سے پُل کنجری کی "مشاہدگاہ" کی طرف جاتے ہوئے ایک اور افسر سے ملاقات ہوئی اور اس نے بتایا کہ ہندوستان اور پاکستان کے سمگلروں کی دوستی اس لحاظ سے قابلِ تقلید ہے کہ یہ ۱۹۶۵ء کی لڑائی سے بھی متاثر نہیں ہوسکی۔ اور یہ پچھلے بائیس سال سے برابر ایک دوسرے کے کام آرہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سمگلنگ کا کام پولیس اور فوج کی بے پناہ مستعدی کے باوجود بڑے زور شور سے جاری ہے۔ اور دونوں طرف کے سمگلر اس درجہ ہوشیار اور چوکس ہیں کہ وہ سرحدی محافظوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنے کاروبار میں مصروف ہیں۔ بی، ایس، ایف کے افسر نے سرحدی لکیر

کے مصنوعی پن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ آپ ہی بتائیے، کہ جب دونوں ملکوں کی سرحدیں ایک دوسرے سے اس طرح لپٹی ہوئی ہوں۔ کہ دو ملکوں کے کسان اپنے اپنے کھیتوں میں کام کرتے ہوئے ایک دوسرے کی خیر خیریت بھی پوچھتے جا رہے ہوں، تو بیچاری سرحدی پولیس کیا کرے گی؟ اور پھر دونوں طرف کے لوگ زبان، معاشرت، تہذیب اور تمدن کے اعتبار سے اتنے مشابہ ہیں کہ ان میں فرق کرنا ناممکن ہے۔ اسی صورتحال کا فائدہ اٹھا کر ہندو اور مسلمان سمگلر بیک وقت مارکس اور گاندھی کو صحیح ثابت کر رہے ہیں۔ مارکس کا دعویٰ ہے کہ انسانی تعلقات کی بنیاد اقتصادیات ہے، سیاست یا مذہب نہیں۔ گاندھی جی کا فلسفہ یہ ہے کہ مذہب ہندو اور مسلمان کے درمیان نفرت اور بے اعتمادی کا باعث نہیں بننا چاہیئے بلکہ محبّت اور دوستی کا ذریعہ۔ ہندوستان اور پاکستان کے سمگلروں کے باہمی تعاون، اشتراکِ عمل اور بھائی چارے سے ہمارے سیاستدانوں کو سبق سیکھ لینا چاہیئے۔

ٹھیک سات بجے ہم واہگہ لوٹ آئے تو یہاں کا ماحول کچھ بدلا ہوا نظر آیا۔ دونوں طرف کے سپاہی جو ابھی ایک گھنٹہ پہلے اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ گھُلے ملے ہوئے تھے کہ ان میں فرق کرنا مشکل تھا۔ اب اپنی اپنی جگہ پر بڑی سنجیدگی سے کھڑے تھے۔ فضا میں ایک کھچاؤ کا سا احساس ہو رہا تھا اور مجھے ایسا لگا کہ کسی ناخوشگوار واقعے نے دونوں طرف کے سرحدی محافظوں کو ایک دوسرے سے بدظن کر دیا ہے اور اسی لئے یہ ایک دوسرے کو تیکھی نگاہوں سے گھور رہے ہیں، لیکن جلد ہی میرا یہ اندیشہ دور ہو گیا۔ یہ دراصل Retreat کی تیاری تھی اور بی، ایس، ایف کے خوش اخلاق افسر نے مجھے بتایا کہ ہر روز شام کے وقت یہ مصنوعی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ Retreat کا ہی ایک حصّہ ہے۔ ٹھیک سات بجکر دس منٹ پر ہندوستانی سرحد سے دو اور پاکستانی سرحد سے دو سپاہی لفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ کرتے ہوئے پھاٹکوں کے قریب پہنچ گئے۔ پھر دونوں اپنے اپنے جھنڈے کے تلے کھڑے ہو گئے اور بگل بجتے ہی دونوں نے اپنے جھنڈے اتارنے شروع کئے۔ جھنڈے جب

نیچے اُتر آئے تو دونوں طرف کے سپاہیوں نے کچھ اس طرح جھپٹ کر اپنے اپنے جھنڈے سنبھال لئے کہ جیسے انہیں اس بات کا خطرہ تھا کہ دوسرے ملک کے سپاہی اسے اُڑا نہ لے جائیں۔ جھنڈے لے کر سپاہی لوٹنے لگے تو پھاٹکوں پر متعین سپاہیوں نے اس تیزی سے پھاٹک بند کر دئے کہ جیسے انہیں اس بات کا اندیشہ تھا کہ اگر پھاٹک ایک لمحے کے لئے بھی کھُلا رہ جائے تو دونوں ملکوں کی عزت و آبرو لٹ جائے گی۔ پھاٹک بند ہوئے، دونوں طرف سے تالے ڈال دئے گئے اور بارہ گھنٹوں کے لئے واہگہ پر خاموشی چھا گئی۔ صرف کچھ پرندے گیٹ بند ہونے کے باوجود اس بے تکلفی سے سرحد پار کر رہے تھے کہ جیسے اُنہوں نے ملک کی تقسیم کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہو۔

واہگہ سے امرتسر لوٹتے ہوئے میں یہ سوچ رہا تھا کہ شاہراہِ عام پر لوہے کے دو بڑے پھاٹکوں نے کس طرح دو ملکوں کے درمیان ایک مصنوعی دیوار کھڑی کر دی ہے۔ کیا ان پھاٹکوں کو ہمیشہ کے لئے کھولا نہیں جا سکتا؟ کیا ان پر پہرے داروں کو کسی زیادہ بہتر، مفید اور مناسب کام پر نہیں لگایا جا سکتا؟ کیا سیاستدانوں کی لگائی ہوئی آگ کو کبھی نہیں بجھایا جا سکتا؟ کیا ہم پرندوں اور سمگلروں سے بھی کوئی سبق سیکھنے کے اہل نہیں ہیں؟

(۱۵ر مئی ۱۹۷۰ء)

پیشاب کرنے کے آداب

اردو کے مشہور طنز نگار رشید احمد صدیقی نے ایک دن ایک صاحب کو سڑک کے بیچ میں پیشاب کرتے ہوئے دیکھا، تو اُنہوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین سے مخاطب ہو کر کہا کہ جس قوم کو پیشاب تک کرنے کا سلیقہ نہ ہو، اُسے آزادی مانگنے کا کیا حق ہے۔ ذاکر صاحب نے فوراً جواب دیا 'جس قوم نے ہندوستان پر ایک سو سال حکومت کرنے کے بعد بھی یہاں کے لوگوں کو پیشاب کرنے کا سلیقہ نہیں سکھایا، اُسے اس ملک پر حکومت کرنے کا کیا حق ہے؟ رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کا یہ مکالمہ اس دور کی یادگار ہے کہ جب ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہونے کی جدوجہد کر رہا تھا، آج ہندوستان کو آزاد ہوئے پورے ۲۳ برس ہو گئے ہیں اور چراغ بیگ کو یہ کہتے ہوئے بڑی کوفت ہو رہی ہے کہ اِس قوم نے اِن ۲۳ برسوں میں پیشاب کرنے کا سلیقہ نہیں سیکھا ہے، بلکہ آزادی کے بعد سے ہندوستان کے لوگ پیشاب کرنے کے معاملے میں ہر قید و بند، ضابطے اور پابندی سے مکمل طور پر آزاد ہو گئے ہیں۔ شاہراہ عام ہو یا تفریحی پارک، بس سٹینڈ ہو یا سینما گھر کی دیوار، سیر گاہ ہو یا کوئی متبرک مقام، مکان کی پشت ہو یا دُکان کی سیڑھی، ہم ہر جگہ کو پیشاب گاہ سمجھ کر اپنی بدتمیزی، بدسلیقگی اور بے ہودگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بہت سے غیر ملکی صحافیوں اور ادیبوں نے شاہراہوں اور سیر گاہوں کو پیشاب گاہوں میں تبدیل کرنے کی اس عادت کے متعلق بڑے دلچسپ مضامین اور کتابیں لکھی ہیں۔ وی، ایس، نیپال نے اپنی کتاب Area of Darkness میں بڑی تفصیل کے ساتھ

پیشاب کرنے کی آزادی اور اس کے نتائج پر بحث کی ہے۔ اس نے پورے ملک کو ایک "پیشاب گاہ" کے ساتھ مشابہت دیکر ایک ایسی گھناؤنی تصویر پیش کی ہے کہ اسے پڑھکر ہندوستان سے نفرت ہوجاتی ہے۔ اور بدقسمتی یہ ہے کہ نیپال کے ایک لفظ کو بھی غلط ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے جو کچھ ہندوستان کے دوسرے شہروں کے متعلق لکھا ہے وہ بعینہٖ کشمیر پر بھی صادق آتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں کے لوگ پیشاب کے معاملے میں نسبتاً زیادہ بدتمیز، بدسلیقہ اور بداطوار واقع ہوئے ہیں۔ اور خاص طور پر سری نگر کے لوگ، کہ جو شاہراہِ عام پر اس بے حیائی کے ساتھ پیشاب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ جیسے سگریٹ پی رہے ہوں۔ قطع نظر اس کے کہ سری نگر میں ہر سڑک، ہر گلی اور ہر کوچہ پیشاب گاہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ پیشاب کرنے کے معاملے میں ہم حد درجہ بے حجاب، بے شرم اور بے حیا ہوتے جارہے ہیں۔ ہمیں نہ اس بات کا احساس ہے کہ شاہراہِ عام کو پیشاب گاہ کے طور پر استعمال کرکے ہم شہر کی فضا کو گندہ کررہے ہیں اور نہ اس بات کا خیال کہ پیشاب کرتے ہوئے کسی قدر احتیاط اور حجاب سے کام لینا ضروری ہے۔ ہم اس احساس سے بھی قطعاً عاری ہیں کہ زمین، بازار، شاہراہ باغ اور دیوار کا ہر حصّہ پیشاب کرنے کے لئے موزوں اور مناسب نہیں ہوتا اور بعض جگہیں ایسی ہیں کہ جنہیں پیشاب کی گندگی سے ملوث کرنا حد درجہ بدتمیزی ہے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ جہاں اور جس مرحلے پر پیشاب کرنے کی ضرورت ہو، وہیں پیشاب کیا جانا چاہیئے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ جہاں اور جس جگہ بھی "پیشاب کرنا منع ہے" کا سائن بورڈ لگا ہوا ہے۔ ٹھیک اسی سائن بورڈ کے نیچے اکثر لوگ آکر پیشاب کرتے ہیں۔ سری نگر کی کوئی سڑک، کوئی عمارت یا کوئی دیوار "پیشابیوں" کی زد سے محفوظ نہیں اور نتیجہ یہ کہ سارا شہر غلاظت اور عفونت کا ایک "مثالی نمونہ" بنا ہوا ہے اور اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے مجھے ذاکر صاحب کا یہ قول یاد آرہا ہے کہ "جو حکومت لوگوں کو پیشاب کرنے کا سلیقہ سکھانے میں ناکام رہے اُسے حکومت کرنے کا کیا حق حاصل ہے۔" ذاکر صاحب کا یہ قول ریاستی حکومت پر حرف بحرف صادق آتا ہے۔ اور اگر صرف اسی

معیار کو سامنے رکھا جائے تو موجودہ حکومت کو ایک لمحہ ضائع کئے بغیر مستعفیٰ ہو جانا چاہیئے کیونکہ میرے نزدیک سرینگر کو پیشاب گاہ بنانے کا سہرا صرف موجودہ حکومت کے سر ہے۔

سری نگر کی چار لاکھ آبادی کے لئے یہاں کی میونسپلٹی نے چار پیشاب گاہیں تعمیر کی ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ ایک لاکھ کی آبادی کے لئے ایک پیشاب گاہ۔ ظاہر ہے کہ ایک پیشاب گاہ ایک لاکھ کی آبادی کے لئے ناکافی ہے۔ اور خاص طور پر ٹورسٹ سیزن کے دوران کہ جب اس آبادی میں بیرونِ ریاست کے ایک لاکھ لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ اور اسی لئے لوگ پورے شہر کو پیشاب گاہ کے طور پر استعمال کرنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ چراغ بیگ ایک ایسے علاقے میں رہ رہا ہے کہ جہاں گرد و پیش میں کئی سرکاری دفاتر واقع ہیں۔ لیکن اس پورے علاقے میں ایک بھی پبلک Urinal نہیں ہے۔ اور اس لئے دفتروں میں کام کرنے والے اور آنے جانے والے سبھی لوگ اس محلّے کے مکانات کی دیواروں کو استعمال میں لاتے ہیں اور نتیجہ یہ کہ یہ پورا علاقہ دن کے آٹھ گھنٹوں کے لئے ایک پبلک یورینل میں تبدیل ہو جاتا ہے اور محلّے والے بارہ گھنٹے اس اندیشے میں مبتلا رہتے ہیں کہ کہیں سیلاب نہ آجائے۔ بہت دن تک میں ان بدتمیز لوگوں کو کوستا رہا کہ جنہیں یہ معلوم نہیں کہ پیشاب کہاں اور کس جگہ کرنا چاہیئے۔ لیکن اب یہ سوچتا ہوں کہ لوگ بچارے بھی کیا کریں۔ جب اس سارے علاقے میں کہیں پیشاب کرنے کی جگہ ہی نہیں تو یہ جائیں گے کہاں۔ جی چاہتا ہے کہ شہر کے لوگوں کو اس بات کی ترغیب دوں کہ جب انہیں پیشاب کرنے کی ضرورت محسوس ہو، تو وہ ٹانگے، ٹیکسی یا سائیکل پر سوار ہو کر سیدھے سرینگر کی میونسپلٹی کے دفتر پہنچ جائیں اور وہیں پیشاب سے فراغت حاصل کریں۔ پھر ایک دن ایسا آئے گا کہ سرینگر میونسپلٹی اس سیلاب میں غرق ہو کر نیست و نابود ہو جائے گی اور شہر کے لوگ شہر کے انتظام کو چلانے کے لئے کسی بہتر ادارے کو منظم کریں گے۔ کیونکہ جو ادارہ لوگوں کو پیشاب کرنے کی سہولت بھی بہم نہ پہنچا سکے اس کا غرق ہونا بہتر ہے۔

پیشاب کے اس مکروہ موضوع کو ایک بین الاقوامی لطیفے پر ختم کرتا ہوں!

کہتے ہیں کہ چند سال قبل جب روسی وزیراعظم مسٹر کوسی گن ہندوستان کے دورے پر تشریف لائے تو ایک دن انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ صبح سویرے سیر کو جائیں گے۔ دوسرے دن علی الصبح شریمتی گاندھی کے ساتھ دلی کے ایک طرف نکل گئے۔ وہ جہاں جہاں سے گذرے لوگ کھلی فضا میں "رفع حاجات ضروری" سے فارغ ہو رہے تھے۔ مسٹر کوسی گن نے شریمتی گاندھی سے کہا کہ یہاں کے لوگ بڑے غیر مہذب ہیں۔ شریمتی گاندھی کو بڑی شرمندگی ہوئی۔ اور وہ خاموش رہیں۔ پھر دوسرے سال شریمتی گاندھی رُوس گئیں تو اُنھوں نے علی الصبح سیر کو جانے کی خواہش ظاہر کی۔ دوسرے دن وہ مسٹر کوسی گن کے ساتھ سیر کو نکلیں تو اُنھوں نے سڑک کے کنارے ایک آدمی کو "رفع حاجات ضروری" سے فارغ ہوتے دیکھا، وہ خوش ہو گئیں کہ مسٹر کوسی گن پر جوابی حملہ کرنے کا موقع ہاتھ آگیا۔ اُنھوں نے مسٹر کوسی گن سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا، "آپ کے ملک کے لوگ کتنے غیر مہذّب ہیں۔" وہ آدمی کس طرح سڑک کو بیت الخلا کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔"

"اور آپ جانتی ہیں کہ وہ کون ہے ؟" مسٹر کوسی گن نے بڑے اطمینان سے دریافت کیا۔

"نہیں تو" شریمتی اندرا گاندھی نے جواب دیا۔

"وہ ماسکو میں مقیم ہندوستانی سفیر ہے۔" مسٹر کوسی گن نے شریمتی اندرا گاندھی کی معلومات میں اضافہ کیا۔

اور چراغ بیگ آپ کی معلومات میں یہ اضافہ کرنا چاہتا ہے کہ ماسکو میں ہندوستان کا سفیر ایک کشمیری ہے !

(۱۵ر مئی ۱۹۷۰ء)

سرکاری غنڈہ گردی

کوئی نوجوان کسی راہ چلتی لڑکی پر کوئی فقرہ کسے، تو اُسے چھیڑ خانی کے الزام میں دھر لیا جاتا ہے۔ کوئی شخص اپنے پڑوسی کی آدھ انچ زمین پر قبضہ کر بیٹھے تو مداخلتِ بے جا میں اس کا چالان کر دیا جاتا ہے۔ کوئی شہری باقاعدہ اجازت حاصل کئے بغیر اپنے اپنے ہی مکان میں ایک کھڑکی بھی کھول دے، تو اس خلاف ورزی کے لئے اُسے جرمانے کی سزا دی جاتی ہے۔ کوئی مرد کسی عورت کی عزت پر ہاتھ اُٹھائے تو پولیس اُسکی عزت پر ہاتھ ڈال کر اُسے غنڈہ گردی کے الزام میں گرفتار کر لیتی ہے۔ غرض دراز دستی، غنڈہ گردی چھیڑ خانی اور مداخلتِ بے جا کے ہر جرم پر قانون حرکت میں آکر مظلوم کا ساتھ دیتا ہے یا کم از کم اُس سے مظلوم کا ساتھ دینے کی توقع رکھی جاتی ہے۔ لیکن یہ اُسی صورت میں ممکن ہے کہ جب جرم کا ارتکاب کرنے والا کوئی عام شہری ہو۔ بعض اوقات حکومت خود دراز دستی اور غنڈہ گردی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اور ایسے مواقع پر قانون، افراد کے حقوق کا تحفظ کرنے کی بجائے، ظلم اور تشدّد کا ہتھیار بن جاتا ہے۔ سری نگر کے دو روزناموں کی اشاعت پر پابندی اسی سرکاری غنڈہ گردی اور دہشت پسندی کی ایک کلاسیکی مثال ہے۔ روزنامہ "سری نگر ٹائمز" اور "جہانِ نو" پچھلے چند ماہ سے ریاستی حکومت، اربابِ اقتدار اور کچھ سرکاری افسروں پر کڑی نکتہ چینی کر رہے تھے۔ جہاں اول الذکر اخبار نے اپنی تیکھی، نوکدار اور شوخ تحریروں سے ایک مقبولِ عام روزنامے کا درجہ حاصل کیا تھا، وہاں موخرالذکر روزنامہ راجپوری صاحب کے ذاتی گزٹ کی حیثیت سے ان کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتا تھا۔

دونوں ہی معاصر چونکہ حکومت اور اربابِ حکومت کے خلاف صف آرا تھے۔ اس لئے کبھی بات کا بتنگڑ بھی بنایا کرتے تھے۔ اور ایسا کرنا چونکہ صحافت کی شریعت میں کوئی جرم نہیں، اسلئے ان کے خلاف کسی قسم کی تادیبی کاروائی کا خیال بھی ذہن میں نہیں آسکتا تھا۔ لیکن اربابِ اقتدار کی نازک مزاجی کا کیا کہیئے کہ اُنہوں نے سیکورٹی ایکٹ کا سہارا لے کر دونوں اخبارات پر دو ماہ کے لئے پابندی عائد کردی۔ اور اپنی اس " غنڈہ گردی " کے جواز میں یہ دلیل دی کہ یہ دونوں اخبارات ایسی جھوٹی افواہیں پھیلا رہے تھے کہ جن سے ریاست کی سالمیت' سلامتی اور تحفّظ کو خطرہ لاحق تھا۔

چراغ بیگ "سری نگر ٹائمز"، اور "جہانِ نو" دونوں ہی اخبارات کی پالیسیوں سے متفق نہیں۔ وہ تنقید اور تضحیک کی اس روش کو بھی نہیں سراہتا کہ جو دونوں اخبارات نے ایک عرصے سے اختیار کر رکھی ہے۔ وہ مبالغہ آمیزی اور سنسنی خیزی کے اس رجحان کو بھی ناپسند کرتا ہے کہ جو ان دونوں اخبارات میں نمایاں نظر آتا تھا، لیکن اس کے باوجود ان اخبارات کی اشاعت پر پابندی کو ریاست کی تحریر و تقریر کی آزادی پر ایک غاصبانہ حملے سے تعبیر کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے خیال میں ان اخبارات پر پابندی حاکمانِ وقت کی انتقام گیری اور تنگ ظرفی کی ایک بدترین مثال ہے۔ یہ اخبارات اس لئے بند نہیں کئے گئے ہیں کہ یہ غلط خبریں شائع کرتے تھے۔ یا انہوں سے مبالغہ آمیزی سے کام لیا ہے۔ ان کی اشاعت پر پابندی اس لئے عائد کی گئی ہے کہ یہ حکومت اور اربابِ حکومت کو آڑے ہاتھوں لیتے تھے۔ ان کی تنقید بڑی بے رحمانہ اور ان کی تحریر بڑی ظالمانہ ہوا کرتی تھی۔ ان کا جرم یہ تھا کہ یہ سرکاری اشتہارات کی پرواہ کئے بغیر سرکار کے خلاف بے تکان لکھتے جا رہے تھے۔ ان کا قصور یہ تھا کہ یہ سرکاری افسروں کی شان میں قصیدے نہیں لکھا کرتے تھے۔ ان کا گناہ یہ تھا کہ یہ سرکاری پریس نوٹوں کی بجائے وہ خبریں شائع کرتے تھے جو غیر سرکاری ذرائع سے موصول ہوتی تھیں اور چونکہ کوئی حکومت اس قسم کے اخبارات کو پسند نہیں کرتی، اسلئے یہ دونوں اخبارات حکومت کی نظروں میں خار بن کر کھٹکتے تھے اور اسی لئے ان کو سیکورٹی ایکٹ کی کلہاڑی سے ذبح کر دیا گیا ہے۔ میں ان اخبارات

کی وکالت نہیں کر رہا ہوں۔ میں اِس بنیادی حق، اصول کی حمایت کر رہا ہوں کہ جس کی رُو سے ہندوستان کے ہر شہری کو تحریر و تقریر کی مکمل آزادی حاصل ہے اور اگر کوئی شخص اس آزادی کا صحیح استعمال نہیں کرتا تو ایسے قوانین موجود ہیں کہ جن کے تحت اس کے خلاف کاروائی کی جاسکتی ہے۔ اگر معاصر "سرینگر ٹائمز" اور "جہانِ نو" نے واقعی کسی صحافتی ضابطے یا قانون کی خلاف ورزی کی ہے۔ تو ان اخبارات کی اشاعت پر پابندی عائد کرنے کی بجائے ان کے خلاف کسی عدالت میں قانونی چارہ جوئی کی جانی چاہیئے تھی تاکہ ان کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی عبرت ہوتی، لیکن ریاستی حکومت کے فرعونوں نے جذبۂ انتقام کو ہی قانون کا درجہ دے کر "انصاف" کے تقاضے پورے کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور میں اس قسم کے رجحان کو فسطائیت اور غنڈہ گردی کے علاوہ کوئی دوسرا نام نہیں دے سکتا۔

معاصر "سرینگر ٹائمز" اور "جہانِ نو" کی اشاعت پر پابندی کا مقصد دراصل ریاست کے سبھی اخبارات کو یاد دلانا ہے کہ اگر کسی اخبار نے حکومت اور اس کے سربراہوں کی شان میں کوئی گستاخی کی تو حکومت اپنے خصوصی اختیارات کا استعمال کرکے اس کا گلا گھونٹ سکتی ہے۔ اور افسوس اس بات کا ہے کہ اِس قسم کی غنڈہ گردی اور دراز دستی کا مظاہرہ اس دور میں ہو رہا ہے کہ جسے شہری آزادیوں اور نرم روی کا دور کہا جاتا ہے۔ ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ صادق صاحب نے اپنے ساتھیوں کی بے چینی اور اپنے مخالفوں کی نکتہ چینی سے گھبرا کر "پالیسی آف لبرلائزیشن" پر نظرِ ثانی کی ہے اور اب ان کو ہر وہ تقریر اور تحریر ناگوار گذرتی ہے کہ جو ان کی ذات اور جماعت کے حق میں دُعائے خیر کا درجہ نہ رکھتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ فرقہ وارانہ پروپاگنڈا کرنے والے جرائد، نوجوانوں کے اخلاق بگاڑنے والے رسائل اور سستے جذبات اُبھارنے والے اخبارات کو تو کھُلی چھُٹی دی گئی ہے۔ لیکن حکومت کی شان میں گستاخیاں کرنے والے اخبارات کا گلا گھونٹا جا رہا ہے۔ چراغ بیگ، صادق صاحب کو یہ یاد دلانا چاہتا ہے کہ ابھی دو ہفتے قبل مدیر "آئینہ" نے ان کے دورِ اقتدار کو اس لئے بخشی غلام محمد کے دورِ حکومت

پر ترجیح دی تھی کہ "صادق صاحب نے اپنے چھ سالہ دورِ اقتدار میں ہمیں اور کچھ دیا ہو یا نہیں، اُنہوں نے ہمیں اپنا قلم اور اپنی زبان واپس دی ہے ۔۔۔۔۔۔ آج حکومت اور اربابِ حکومت پر تنقید کرنے کے لئے سرگوشیوں کی ضرورت نہیں، آپ جو کچھ کہنا چاہیں، اور جس کے خلاف کہنا چاہیں، بآوازِ بلند کہہ سکتے ہیں۔ آج ہمارے قلم اور ہماری زبان کی نوک سے کوئی محفوظ نہیں ۔۔۔۔۔۔ خواجہ غلام محمد صادق کی ذات کے خلاف جو کچھ ہم نے لکھا ہے اور آجکل دوسرے صحیفہ نگار لکھ رہے ہیں، وبخشی صاحب کے دور میں بخشی صاحب کے کسی چہیتے افسر کے متعلق بھی نہیں لکھا جاسکتا تھا۔۔"

(آئینہ، ۲۳ر اپریل ۱۹۷۰ء)

ابھی اس تحریر کی سیاہی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ صادق صاحب نے "سرینگر ٹائمز" اور "جہانِ نو" پر پابندی عائد کر کے "مدیرِ آئینہ" کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ میں صادق صاحب سے گذارش کروں گا کہ وہ دونوں اخبارات پر عائد شدہ پابندی کو غیر مشروط طور پر ختم کر کے تحریر و تقریر کی آزادی کو بحال کر دیں۔ ورنہ بہت سے اخبارات اپنے انجام کے خوف سے سرکاری گزٹ بن کر رہ جائیں گے۔

(۳۰ر مئی ۱۹۷۰ء)

حقیقت خرافات میں کھو گئی

پُراسرار آگ کا معمہ روز بروز پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور اب آگ کے شعلے ضلع اننت ناگ کی سرحدوں کو پار کر کے سرینگر اور بارہ مولہ کی جانب بڑھنے لگے ہیں۔ ڈیڑھ سو سے زائد وارداتوں میں ابھی تک ڈیڑھ ہزار سے زائد مکانات اور دُکانات خاکستر ہو چکے ہیں۔ اور ایک حقیر اندازے کے مطابق ایک لاکھ کے قریب لوگ ابھی تک بے خانماں ہو گئے ہیں۔ یہ سلسلہ کب ختم ہو گا؟ حکومت، عوام، مخالف سیاسی جماعتیں اور چراغ بیگ، کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آثار و قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل قریب میں اس پُراسرار آگ پر قابو پانے کا کوئی اندیشہ نہیں، کیونکہ ابھی تک یہ بات طے نہیں ہوئی ہے کہ آگ اتفاقیہ طور لگ جاتی ہے یا لگا دی جاتی ہے اور اگر لگا دی جاتی ہے تو لگانے والے کا نام، ولدیت، تاریخ پیدائش، جغرافیہ، تاریخ اور پولیٹیکل سائنس کیا ہے؟

ریاستی حکومت اور اس کے ترجمان اس بات پر بضد ہیں کہ آگ کی تقریباً نوے فیصد وارداتیں "اتفاقیہ ہیں" اور باقی دس فیصد ذاتی عداوت اور کدورت کا نتیجہ ہیں۔ انسپکٹر جنرل پولیس کا خیال ہے کہ اس سال موسم کی غیر معمولی خشکی کے سبب آگ کی "اتفاقیہ" وارداتوں میں قابل ذکر اضافہ ہوا ہے۔ اور آتشزدگی کی پے در پے وارداتیں کسی سیاسی سازش کی بجائے موسم کی سازش کا نتیجہ ہیں۔ آئی، جی، پی صاحب کی اس وضاحت کے متعلق شیخ محمد عبداللہ نے ایک دلچسپ اور اہم سوال پوچھا تھا۔ انہوں نے

دریافت کیا تھا "موسم کی یہ خشکی صرف ضلع انت ناگ ہی تک محدود ہے؟ کیونکہ آگ کی تقریباً ۹۷ فیصد وارداتیں اسی ضلع میں رونما ہو رہی ہیں؟"

انسپکٹر جنرل پولیس نے ابھی تک اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا ہے لیکن سرینگر میں پچھلے چند دنوں سے آتش زنی کے جو حادثات رونما ہو رہے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سری نگر کے موسم میں بھی خشکی پیدا ہو رہی ہے۔ صرف دو ماہ کے اندر اندر ایک مخصوص علاقے میں آگ کی ڈیڑھ سو وارداتوں کا رونما ہونا حیران کُن ضرور ہے، لیکن ان وارداتوں کو "اتفاقیہ" قرار دینا ستم ظریفی کی انتہا ہے اور چراغ بیگ کو حیرت ہے کہ ریاستی حکومت اپنی ناکام کا اعتراف کرنے کی بجائے اپنی نا اہلیت کے بھونڈے اور مضحکہ خیز جواز کیوں تلاش رہی ہے؟

یہ آگ اگر "اتفاقیہ" نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟ کیوں ہے؟ اس سے کس کا فائدہ اور کس کا نقصان ہے؟ آگ لگانے والے مقامی ہیں یا بیرونی؟ ان کا مقصد کیا ہے؟ انہیں ابھی تک پکڑا کیوں نہیں گیا؟ آگ کیسے لگائی جاتی ہے؟ دن میں آگ کیونکر لگ جاتی ہے؟ رات بھر کڑے پہرے کے باوجود آگ کیوں نمودار ہو جاتی ہے؟ یہ اور اسی طرح کے بہت سے سوالات ذہنوں میں اُبھر رہے ہیں۔ اور ہر شخص اپنی ذہنی استعداد، قوتِ تخیّل اور قوتِ پرواز کے مطابق ان سوالات کو حل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اسطرح پچھلے دو ایک ماہ کے دوران افواہوں، اندازوں اور اندیشوں کے انبار لگ گئے ہیں۔ اور حقیقت کچھ اس طرح خرافات میں کھو گئی ہے کہ ان کو ایک دوسرے سے علیٰحدہ کرنا ناممکن بن گیا ہے۔ ہر شخص اپنی تھیوری لئے گھوم رہا ہے۔ اور اپنی تھیوری کو صحیح ثابت کرنے کے لئے "چشم دید" گواہی پیش کر رہا ہے۔ اور اب تک جتنے مفروضے پیش کئے گئے ہیں اُن کی رُو سے آگ کی اس سازش میں بیک وقت نکسلائٹس، جن سنگھی، پاکستان، بخشی غلام محمد، مرکزی حکومت اور ریاستی حکومت شامل ہیں۔ ایک تازہ ترین تھیوری جو پچھلے ڈیڑھ ہفتے سے شہر کا چکر لگا رہی ہے یہ ہے کہ لوگ خود

اپنے گھروں میں آگ لگا رہے ہیں۔ غرض قیاس کے گھوڑے اب دوڑتے دوڑتے اتنے بے دم ہو گئے ہیں کہ اب ان کے لئے ایک قدم اُٹھانا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ ادھر توہمات نے اب رفتہ رفتہ حقیقت کا روپ اختیار کر لیا ہے۔ اور ہر شخص کو اپنے صحن میں دو تین پُراسرار آدمی نظر آنے لگتے ہیں۔ ہر دیوار پر مٹی کا تیل اور پیٹرول چھڑکا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اور ہر گاؤں میں رات کو شدید اور کڑے پہرے کے باوجود کچھ اجنبی گھس آتے ہیں۔ آتشزدگی کے زیادہ تر حادثات دن میں رونما ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ بات طے ہے کہ آگ لگانے والے مقامی لوگ ہیں، لیکن کون ہیں؟ کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا، اور چونکہ کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا، اس لئے جو جس کے جی میں آئے کہہ دیتا ہے۔ اور اب یہ حالت ہے کہ ہر آدمی کو دوسرے پر شک ہے، کہ ہو نہ ہو یہی آگ لگانے والا ہو، بعض لوگ آگ لگانے والے کا حلیہ اس تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ ان کی قوتِ مشاہدہ پر حیرت ہوتی ہے، لیکن جب اُن سے یہ پوچھتے ہیں کہ آپ نے اُسے پکڑا کیوں نہیں، تو جواب ملتا ہے کہ مجھے دیکھتے ہی بھاگ گیا۔ چراغ بیگ کو ایک نہیں، سینکڑوں آدمیوں نے یہ بتایا کہ اُنھوں نے سفید قمیص اور نیکر پہنے ہوئے چار آدمی رات کو فلاں مکان کے عقب میں ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیکھے، لیکن ہر بار یہ چار آدمی بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اور باوجود اس کے کہ ہزاروں لوگ رات بھر پہرہ دیتے ہیں۔ ابھی تک اِن نیکر پوش آدمیوں میں سے ایک کو بھی پکڑا نہیں گیا ہے۔ ہر روز درجنوں افسانے اور کہانیاں تخلیق کی جاتی ہیں اور "چشم دید گواہی" کے ذریعے اِن افسانوں میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن ابھی تک ایک بھی کوشش کامیاب نہیں ہوئی ہے۔ اور اب رفتہ رفتہ چراغ بیگ کو یہ یقین ہو گیا ہے کہ سفید قمیص اور نیکر، دراصل توہم اور اندیشوں کا لباس ہے۔ کسی آدمی کا نہیں، کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ کوئی اجنبی سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں اس صفائی کے ساتھ بچ نکلے کہ اس کی لنگوٹی بھی ہاتھ نہ آئے۔

دراصل خوف ، وہم اور وحشت نے ہمارے حواس معطل کر دیئے ہیں اور ہمیں وہ سب کچھ نظر آتا ہے کہ جس کا کوئی وجود نہیں۔ چراغ بیگ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم غلط آدمی کا پیچھا کر رہے ہیں۔ آگ لگانے والا شاید ہمارے ہی درمیان موجود ہے۔ وہ ہمارے ہی ساتھ پہرہ بھی دیتا ہے اور پھر آگ لگا کر "چور چور" کی آواز بھی بلند کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ چراغ بیگ کی تصویری بھی غلط ہو، لیکن یہ غلط ہوسکتی ہے، گمراہ کن نہیں ہوسکتی۔ اس لئے اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

(۷ جون ۱۹۷۰ء)

مجھے نفرت ہے

مشہور ہندوستانی دانشور نرادسی چودھری نے چند ماہ قبل بمبئی سے شائع ہونے والے انگریزی ہفت روزہ "السٹریٹڈ ویکلی" میں ایک سلسلہ مضامین شروع کر دیا تھا، جس کا عنوان تھا کہ "مجھے ہندوستانیوں سے کیوں نفرت ہے ؟"۔ اس عنوان کے تحت مسٹر چودھری نے ہندوستانیوں کی بددیانتی، ریاکاری، ان کے دوغلے پن اور ان کی بزدلی پر بڑی بے رحمانہ تنقید کر کے اپنی دل کی بھڑاس نکالی تھی۔ ان مضامین کے مطالعہ کے فوراً بعد چراغ بیگ کے دل میں بھی یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ وہ "مجھے کشمیریوں سے کیوں نفرت ہے ؟" کے نام سے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کر دے کہ جسمیں اہلِ کشمیر کی جہالت، کثافت، بزدلی، بے غیرتی، ریاکاری، دروغ گوئی اور توہم پرستی کو بے نقاب کر کے انہیں اپنی ذلّت اور رُسوائی کے اسباب سے آگاہ کر دیا جائے۔ لیکن اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے میں ایک امر مانع رہا، اور وہ یہ کہ جہالت، بے غیرتی، بزدلی اور دروغ گوئی پر صرف اہلِ کشمیر ہی کی اجارہ داری نہیں، یہ پورے ملک کا "قومی سرمایہ" ہے اور اس لئے اس سرمائے کو صرف اہلِ کشمیر سے منسوب کرنا علاقائی تعصّب سے تعبیر کیا جائے گا۔ لیکن ایک خصوصیت ایسی ہے، جو اہلِ کشمیر کو ہندوستانیوں سے ہی نہیں، دنیا بھر کے لوگوں سے مختلف اور ممتاز بنا دیتی ہے۔ اور وہ ہے وقت کا تصوّر، اور وقت کے اسی تصوّر کی بناء پر مجھے اہلِ کشمیر سے سخت نفرت ہے۔ کشمیریوں کے خیال میں وقت کی پابندی، وقت کی قیمت، وقت کی اہمیّت اور وقت کا صحیح

استعمال، یہ سب بے معنی اصطلاحیں ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے، کہ وقت گذرتا نہیں ہے، بلکہ ایک جگہ جمع ہوتا رہتا ہے۔ اور اس لئے وہ "گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں، جیسے "بے ہودہ" مقولوں اور مفروضوں کو خاطر میں نہیں لاتے، وقت کی پابندی ہمارے ہاں، اخلاق اور شرافت کی بجائے چھچھورے پن کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ اور جو لوگ وقتِ مقررہ پر کوئی کام کرنے کے عادی ہوں۔ انہیں اکثر شرمندگی اور ندامت اُٹھانا پڑتی ہے۔ آپ کو کسی جلسے میں تقریر کرنے کے لئے ٹھیک پانچ بجے مدعو کیا گیا ہے اور اگر آپ وقت کی پابندی کے خیال سے ٹھیک پانچ بجے "جائے مقررہ" پر پہنچ گئے، تو آپ کو بڑی پشیمانی ہوگی۔ کیونکہ سامعین کی تو بات ہی نہیں، پانچ بجے تو منتظمینِ جلسہ بھی کہیں نہیں دکھائی دیں گے۔ آپ کو اگر کسی صاحب نے آٹھ بجے اپنے ہاں کھانے پر بُلایا ہے۔ اور آپ ٹھیک آٹھ بجے وہاں پہنچ گئے، تو سمجھ لیجئے کہ اس صاحب کے یہاں یہ آپ کی پہلی اور آخری دعوت ہے۔ کیونکہ آپ نے وقت کی پابندی سے صرف یہ بات ثابت کردی ہے کہ آپ بڑے چھچھورے ہیں، وقت کے تئیں ہمارا یہ حقارت آمیز رویہ ہمارے قومی کردار کی ایک ایسی نمایاں خصوصیت ہے کہ اسے ہماری زندگی میں شرافت اور نجابت کا درجہ حاصل ہوگیا ہے۔ بڑے آدمی کی پہچان یہ ہے کہ وہ وقت مقررہ کے کتنی دیر بعد آتا ہے اور جو جتنا بڑا آدمی ہوگا، وہ اتنی ہی دیر سے آئے گا۔ کسی دعوت یا تقریب کے وقتِ مقررہ پر شروع ہونے کا صرف یہ مطلب ہے کہ اس تقریب میں صرف نچلے درجے کے لوگ مدعو ہیں۔ چراغ بیگ کو ایک بھی ایسی مثال یاد نہیں، کہ جہاں کبھی کوئی جلسہ، کوئی تقریب، کوئی دعوت یا پروگرام مقررہ وقت پر شروع ہوا ہو، بلکہ دعوت دینے والوں اور مہمانوں میں اب اس بات پر مفاہمت ہوگئی ہے کہ وقتِ مقررہ کے معنی ہیں، وقتِ مقررہ سے دو ڈھائی گھنٹے بعد!

اگر آپ کو کسی نے چار بجے ملنے کا وقت دیا ہے تو اس کے معنی ہیں کہ آپ کو چھ ساڑھے چھ بجے ان کے پاس پہنچ جانا چاہیئے۔ اور اگر آپ نے کسی کو چار بجے

بُلایا ہے، تو چھ ساڑھے چھ بجے سے پہلے ان کے آنے کا کوئی اندیشہ نہیں، اس لئے کہ گھنٹے دو گھنٹے کی تاخیر بھی کوئی بات ہے؟ آخر زندگی کہیں بھاگی تو نہیں جارہی ہے۔!

ہمارے ہاں دفتر کھلنے کے اوقات مقررہ ہیں، لیکن کہیں آپ وقتِ مقررہ پر کسی دفتر میں تشریف لے گئے۔ تو بڑی ندامت اُٹھانی پڑے گی۔ افسر تو خیر، پابندئ وقت کا کیا التزام کریں گے۔ وہاں دفتر میں آپ کو وقتِ مقررہ پر چپراسی بھی نظر نہیں آئے گا۔ ہاں ایک بات ضرور ہے، کہ دفتر بند کرنے میں عام طور پر وقت کی پابندی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ زندگی کے کسی شعبے میں کسی بھی مرحلے پر وقت کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ سیاسی لیڈر ہوں، یا وزیر، سرکاری افسر ہوں یا دکاندار، اور امیر ہو یا غریب، سب لوگ وقت کی قید سے آزاد، دونوں ہاتھوں سے وقت کی دولت لُٹا رہے ہیں۔ وقت کو بے رحمی اور سفاکی سے ذبح کرنے کا یہ عمل شادی بیاہ کے موقع پر سب سے زیادہ اذیتناک روپ اختیار کرلیتا ہے۔ آپ کو استقبال برات کے لئے ساڑھے آٹھ بجے شام مدعو کیا جاتا ہے۔ آپ اگر میری طرح بیوقوف ہیں، تو ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے پہنچ جاتے ہیں۔ اور اگر دنیادار اور تجربہ کار ہیں تو نو ساڑھے نو بجے تشریف فرما ہوتے ہیں۔ اب برات کا انتظار شروع ہوتا ہے، دس، ساڑھے دس، گیارہ، ساڑھے گیارہ، بلکہ بارہ بج جاتے ہیں، لیکن برات کا کہیں دور دور تک پتہ نہیں۔ اس دوران میں آپ پر کیا گذرتی ہے، خدا ہی بہتر جانتا ہے، لیکن شرافت، اخلاق، انسانیت اور مروت کا تقاضا یہ ہے۔ کہ آپ غیر معین عرصہ تک برات کا انتظار کرتے رہیں۔ پھر اگر آپ خوش قسمت ہیں تو ساڑھے بارہ بجے کے قریب دولھا میاں براتیوں کو لے کر تشریف فرما ہوتے ہیں۔ ایک بجے کے قریب کھانا ہوگا۔ اور دو ڈھائی بجے آپ گھر لوٹیں گے۔ ساڑھے آٹھ بجے شام سے دو ڈھائی بجے تک صرف چھ گھنٹے کا وقفہ تو ہے۔ اس لیے کوئی مضائقہ نہیں، اور ظاہر ہے کہ وقت کی پابندی

کے خیال سے برات وقت مقررہ پر پہنچ جاتی، تو کیا دولھا میاں اور انکے خاندان کی ناک نہ کٹتی ؟

وقت کے ساتھ اس ناانصافی نے کشمیر میں زندگی کی رفتار اتنی مدھم اور سست کر دی ہے کہ یہاں کوئی چیز حرکت کرتی ہوئی نہیں دکھائی دیتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری قوم نے بھنگ پی رکھی ہو۔ اور اب اس پر مدہوشی کا عالم طاری ہے۔ کون کہتا ہے کہ کشمیری غریب اور مفلس ہے، وہ جس فیاضی بلکہ لاپرواہی سے وقت کی دولت لٹا رہا ہے۔ وہ دنیا کی متمول ترین قوموں کے مقدر میں بھی نہیں ہے۔ اور اس لحاظ سے ہمارا شمار دنیا کے امیر ترین لوگوں میں ہونا چاہیئے، لیکن وقت کی دولت کے اس بے جا استعمال کی وجہ سے مجھے کشمیریوں سے سخت نفرت ہے۔ میرا ایمان ہے کہ جو لوگ وقت کی قدر نہیں کرتے۔ ان میں کبھی پستیوں سے بلندیوں کی جانب اٹھنے کا حوصلہ پیدا نہیں ہوسکتا۔

(۱۶ر جون ۔ ۱۹۷۰ء)

۶ سال

موجودہ سیاسی نظام اور معاشی ڈھانچے میں "آئینہ" جیسے چھوٹے اخبار کا کسی سیاسی جماعت، سماجی ادارے یا سرکاری امداد کے بغیر زندہ رہنا ایک معجزے سے کم نہیں، لیکن عزم صمیم کے ساتھ خلوص نیت بھی شامل ہو جائے، تو آج بھی معجزے رونما ہو سکتے ہیں۔ "آئینہ" کا چھ سال تک زندہ رہنا ایک ایسا ہی معجزہ ہے۔ اور مجھے یہ کہتے ہوئے فخر اور غرور کا احساس ہو رہا ہے کہ "آئینہ" صرف خود زندہ نہیں رہا، اس نے بہت سے لوگوں کو زندگی کے آداب سکھا کر زندہ رہنے کا حوصلہ بھی دیا۔ روایتی صحافت کے بندھنوں کو توڑ کر "آئینہ" نے اردو صحافت میں کچھ نئی راہیں نکالی ہیں اور چھ سال کے مختصر سے عرصے میں اس کی شہرت ہندوستان کی سرحدوں کو پار کر کے پاکستان تک پہنچ گئی۔ پاکستانی حکومت کی طرف سے اخبارات اور رسائل کی آمدورفت پر پابندی عائد کرنے سے قبل اس اخبار کی پانچ سو سے زائد کاپیاں پاکستان جایا کرتی تھیں۔ اسی طرح ہندوستان کا کوئی بھی بڑا شہر ایسا نہ ہوگا کہ جہاں "آئینہ" کے پڑھنے والے موجود نہ ہوں۔ ایک چھوٹے سے اخبار کے لئے اتنی بڑی کامیابی میرے لئے باعث اطمینان اور موجب مسرت ہے۔ اور آج جبکہ "آئینہ" اپنی اشاعت کے ۶ سال مکمل کر کے اپنی زندگی کے ساتویں منزل میں قدم رکھ رہا ہے، میں ایک بار پھر اپنے اس عہد کو دہرانا چاہتا ہوں کہ "آئینہ"، صرف ایک بامقصد، باوقار اور آزاد اخبار ہی کی حیثیت سے زندہ رہے گا۔ اور اگر کوئی

وقت ایسا آیا کہ جب "آئینہ" کو زندہ رکھنے کے لئے اس کی آزادی، اس کی آواز اور اس کے وقار کو کسی سیاسی تنظیم یا سرکاری ادارے پاس گروی رکھنے کی نوبت آجائے تو میں ایک لمحے کے تامل کے بغیر اس کی اشاعت بند کردوں گا۔

اپنی اشاعت کے چھ سالوں میں "آئینہ" نے عتی الامکان اور حتی المقدور ظلم، ناانصافی، تعصّب، تنگ نظری، رجعت پسندی اور قدامت پرستی کے خلاف جہاد کرنے میں کو دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ اور میرے لئے یہ امر باعثِ اطمینان ہے کہ "آئینہ" کے ہزاروں پرستاروں نے اس اخبار کو ایک ذہنی تحریک کی علامت سمجھ کر اُس اندازِ فکر کو اپنایا ہے کہ جس کو عام کرنے کے لئے میں نے آج سے چھ سال قبل "آئینہ" اجرا کیا تھا۔

کچھ دوستوں کو شکایت ہے کہ اب "آئینہ" میں وہ حدّت اور شدّت باقی نہیں رہی ہے جو دلوں کو گرما کر جذبات میں ایک ہیجان بپا کرتی تھی۔ وہ آج بھی "آئینہ" کو ایک دہکتے ہوئے انگارے کی طرح چنگاریاں اُڑاتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان دوستوں سے میری یہ گذارش ہے کہ فرد کی شخصیت کی طرح اخبار کی شخصیت بھی ارتقار کے مراحل سے گذرتی ہے۔ اور بچپن کی شوخیاں اور شرارتیں، ایک خاص عمر تک ہی بھلی لگتی ہیں۔ آپ کا "آئینہ" اب رفتہ رفتہ جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھنے رکھنے لگا ہے۔ یہاں اب متانت، سنجیدگی، توازن اور ٹھہراؤ کی ضرورت ہے۔ اور مجھے خوشی ہے کہ گذشتہ دو برسوں کے دوران "آئینہ" کے اسلوب اور اپروچ دونوں ہی میں ایک صحت مند اور خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ چنگاریاں اُڑانے سے روشنی نہیں ہوتی، اندھیرے کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ اور "آئینہ" جذبات گرمانے کے ساتھ ساتھ فکر کی قندیلیں بھی روشن کرنا چاہتا ہے تاکہ ذہن کی روشنی اور جذبات کی آنچ، شخصیت کی تشکیل اور تعمیر میں ایک دوسرے کے مددگار ثابت ہوں!

"آئینہ" کے بہت سے مدّاح ایک عرصے سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ اسے ہفت روزہ کی بجائے روزنامہ بنا دیا جائے، اور کچھ عرصہ قبل میں نے اسے روزنامہ

بنانے کا فیصلہ کر بھی لیا تھا، لیکن مزید غور و فکر کے بعد میں نے یہ ارادہ بدل دیا۔
اور "آئینہ" روزنامہ بننے سے بال بال بچ گیا۔ اس ریاست میں خبروں کی تخلیق اور
تشہیر کے لئے بہت سے اخبارات ہیں۔ اور ان میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہے۔
لیکن نظر کی تہذیب اور نظریات کی تبلیغ کے لئے سلیقے اور حوصلے کی ضرورت ہے۔
اور یہ کام ہفت روزہ بہتر طریقے پر انجام دے سکتا ہے۔ اور اسی لئے میں نے
"آئینہ" کو روزنامہ بنانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔

"آئینہ" کا چھٹا سالنامہ پیشِ خدمت ہے۔ مجھے اس کے متعلق آپ کی رائے
کا انتظار رہے گا۔

(۱۵ر جولائی ۱۹۷۰)

در مدحِ چرس

خدا جانے حکومتوں کو اس ہوشربا چیز۔ چرس۔ سے کیوں چڑھ ہے؟ اور نیویارک سے لے کر سکہ ڈافر (سرینگر) تک پولیس اس شجرِ ممنوعہ کے "پرستاروں" کے پیچھے کیوں ہاتھ دھو کر پڑی ہے؟ بظاہر یہ چیز اتنی معصوم، بے ضرر اور لطیف معلوم ہوتی ہے کہ اس کی کاشت، درآمد، برآمد اور تجارت پر اتنی سخت پابندیاں عائد کرنا کم از کم چراغ بیگ کی سمجھ سے باہر ہے۔ اور مان لیجئے کہ اس کے استعمال سے انسان پر مدہوشی بلکہ بے ہوشی کا عالم طاری ہوتا ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ اس میں کیا بُرائی ہے؟ حکمرانوں کے ظلم و ستم، سیاسی لیڈروں کی دغابازیوں، سرمایہ داروں کی ہوس رانیوں اور زمانے کی سرد مہریوں سے گھبرا کر اگر کچھ ذی حس انسان چرس کے دھوئیں سے اپنا غم غلط کرتے ہیں، تو حکومت کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ غالبؔ نے اسی کیفیت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

معاف کیجئے، میں عوام الناس کو چرس پینے کی تلقین نہیں کر رہا ہوں، نہ انہیں چرس پینے کا مشورہ دے رہا ہوں۔ (کیونکہ میں نے خود یہ 'کافر' شے کبھی استعمال نہیں کی ہے) میں صرف ان لوگوں کی وکالت کر رہا ہوں کہ جنہیں عرفِ عام میں چرسی کہا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر شراب پینا منع نہیں ہے۔ تمباکو اور نسوار کا استعمال

جُرم نہیں، افیم کی ایک آدھ چُسکی بھی جائز ہے، تو اس بے چاری چرس نے کیا خطا کی ہے کہ اس کا استعمال ہی نہیں، نقل و حرکت، در آمد و بر آمد، بلکہ اس کا وجود بھی قابلِ تعزیر ٹھہرا ہے۔ اچھا میں مان لیتا ہوں کہ اس کے استعمال سے صحت پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ اور ہماری حکومت کو عوام کی صحت کی اس درجہ فکر ہے کہ وہ انہیں کوئی ایسی چیز استعمال کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی کہ جس سے ان کی صحت خراب ہونے کا اندیشہ ہو۔ (چار لاکھ شہریوں کو جھیل ڈل کا غلیظ پانی پلانے سے لوگوں کی صحت بہتر بنانے کے منصوبے پر اس وقت عملدرآمد ہو رہا ہے) تو کیا ممکن نہیں کہ اس کی بر آمدی تجارت پر سے پابندی اُٹھا دی جائے۔ پچھلے ایک ڈیڑھ سال کے دوران ہماری فرض شناس، مستعد اور متحرک پولیس نے کچھ نہیں تو چھ سات لاکھ روپے کی چرس ضبط کر لی ہے اور بہت ہی محترم اور معزز اشخاص کی عزت اور آمدنی پر ہاتھ ڈالا ہے۔

تازہ ترین حادثہ سرینگر کے اس حاجی صاحب کا ہے کہ جن کے درِ دولت سے صرف ۴۵ کلو چرس بر آمد ہوئی۔ اور میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ جس چیز کی تجارت کو ایک حاجی الحرمین جائز سمجھتا ہے، اُسے ڈی، آئی، جی پیر غلام حسن شاہ کیوں کر ناجائز اور حرام قرار دے سکتا ہے؟ چراغ بیگ کی نظر میں ریاستی پولیس کی یہ "دست اندازی" "مداخلت فی الدین" کے زمرے میں آتی ہے۔ اور علمائے دین کو اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ وضاحت کرنا ہی پڑے گی۔ اگر ریاستی پولیس کے "پالتو غنڈوں" نے اس طرح حاجیانِ کرام کے بستر ے کھول کھول کر ان میں سے "قابلِ اعتراض" اشیاء در آمد کرنا شروع کیں تو مجھے اندیشہ ہے کہ بہت سے لوگ حج بیت اللہ کے لئے جانے میں تامل کریں گے۔ کیونکہ چراغ بیگ کی اطلاع کے مطابق اکثر حاجی صاحبان حج کا ثواب حاصل کرنے سے زیادہ در آمدی، بر آمدی تجارت کا ثواب حاصل کرنے کی غرض سے یہ سفر اختیار کرتے ہیں۔ یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ میں کہہ رہا تھا کہ چرس کی بر آمدی تجارت کو تو جائز قرار دینا چاہیئے کیونکہ تجارتی اعتبار سے یہ نہایت ہی سود مند کاروبار ہے۔ اس ملک کو بیرونی زرِ مبادلہ کی جتنی ضرورت اور کمی ہے، شاید

ہی کسی دوسرے ملک کو ہو۔ اور اگر تاجرانِ چرس کو وہ تمام سہولیات بہم پہنچائی جائیں کہ جو تاجرانِ میوہ یا دوسرے تاجروں کو حاصل ہیں، تو مجھے یقین ہے کہ ملک کی اقتصادیات پر بہت اچھّا اثر پڑے گا۔ چرس کے ایک کلو کی قیمت سرینگر میں ایک ہزار، بمبئی میں دس، اور پندرہ ہزار روپے اور امریکہ میں تیس ہزار ڈالر سے کسی صورت میں کم نہیں۔ ان حالات میں چرس کو بیرونی زرِ مبادلہ کمانے کا بہترین ذریعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اور امریکہ میں چونکہ اس کی کھپت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے چرس فروشوں کو امریکہ کے چرسیوں کے ساتھ براہِ راست تعلقات قائم کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس کا ایک فوری فائدہ یہ ہوگا کہ امریکہ کے نوجوان ویٹ نام میں لڑائی لڑنے کی بجائے گھروں میں بیٹھے بیٹھے امنِ عالم کے قیام میں ممد و معاون ثابت ہوں گے۔

چرس کا استعمال اب سگریٹ کی طرح تہذیب اور تمدّن کی نشانی سمجھا جانے لگا ہے اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ بہت جلد سگریٹ اور پان کی طرح اب لوگ ایک دوسرے کو چرس پیش کیا کریں گے۔ امریکہ اور یورپ کے بہت سے ملکوں سے آئے ہوئے ہپّی صاحبان نے اس ملک میں نہ صرف اس شجرِ ممنوعہ کے دام کئی گنا بڑھا دئے ہیں بلکہ اسے "دانشوری" کی علامت بنا دیا ہے۔ بہت سے ہپّیوں سے بات کرتے ہوئے مجھے اِس بات کا اندازہ ہو گیا کہ ان میں سے اکثر بہت ذہین، فطین اور پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ اور چرس کا استعمال صرف "یک گونہ بے خودی" کے لئے کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ بے خودی کی ضرورت اسی آدمی کو محسوس ہو گی، کہ جو بے خود ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو، دوسرے الفاظ میں "کندۂ ناتراش" نہ ہو۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ سرینگر کی پولیس ان معصوم، بے ضرر اور دلچسپ "فقیروں" کے پیچھے بھی پڑ گئی ہے کہ جو تہذیب کی مردم آزاری سے گھبرا کر سکون اور اطمینان کی تلاش میں یہاں آئے ہوئے ہیں۔ اور جن کی عیّاشی و سرمستی کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے چرس! پچھلے ہفتے مقامی پولیس نے بیچارے ایک فرانسیسی طالب علم کے یہاں

سے آدھا کلو چرس برآمد کر کے اُسے "یک گونہ بیخودی" کا سارا سامان چھین لیا۔ میں نے جب اس فرانسیسی نوجوان کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ مجھ سے سب کچھ چھین لیجیئے لیکن میری آدھ کلو زندگی نہ چھینئے۔ قانون بڑا بے رحم ہوتا ہے۔ اس نے آدھ کلو چرس کے علاوہ اس سے کچھ نہیں چھینا۔ کم از کم غیر ملکی سیّاحوں کو تو چرس کے استعمال کی مکمل آزادی ہونا چاہیئے تھی!

پولیس کی مستعدی و مخبری کے باوجود ہمارے ہاں چرس کا کاروبار بڑے زور و شور سے جاری ہے۔ اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو سری نگر کے بہت سے رنگ محلوں کی تعمیر میں امریکہ کے نوجوانوں کا لہو صرف ہوا ہے۔ کچھ ایسے لوگوں کو جانتا ہوں کہ جن کے کاروبار کا دائرہ اور آمدنی کے ذرائع بہت محدود ہیں لیکن بڑی بڑی عالیشان کوٹھیوں اور کاروں کے مالک بنے پھرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ خدا کی دین کے پیچھے چرس کا جادو ہے کہ جس نے دیکھتے ہی دیکھتے کٹیا کو محل اور سائیکل کو موٹر بنا دیا۔ یوم شہدا پر تقریر کرتے ہوئے ریاستی کانگریس کی صدر بیگم زینب نے یہ انکشاف کیا کہ بخشی صاحب کے دور میں کچھ وزیر لوگ بھی اس کاروبار میں ملوّث بلکہ مصروف تھے۔ اور عام طور پر سرکاری گاڑیوں میں اس کی نقل و حرکت ہوتی تھی۔ معلوم نہیں کہ بیگم صاحبہ نے اس بات کا اطمینان کر لیا یا نہیں کہ آج کل کے وزیر اس "قباحت" میں مبتلا نہیں ہیں۔ اور یہ کہ سرکاری گاڑیوں میں صرف وزیروں کے "کتے" سفر کرتے ہیں۔ چرس کے تاجر نہیں۔ بہر کیف یہ بات طے ہے کہ اس کاروبار میں امیر، غریب، فقیر، وزیر، لیڈر، پلیڈر سبھی طبقوں کے لوگ مصروف ہیں۔ اور پولیس کی سخت چوکسی کے باوجود یہ روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ پولیس نے ۴۵ کلو چرس ضبط کر کے اتنا ہنگامہ کیا کہ جیسے ہمیشہ کے لئے اس تجارت کی بیخ کنی کر دی ہو۔ ادرچراغ بیگ یہ سوچ رہا ہے کہ جو ۱۴۵ کلو چرس پولیس کی نظروں سے بچ کر بمبئی پہنچ گئی اس کا کسی نے ذکر کیوں نہیں کیا۔ مطلب کہنے کا یہ ہے کہ ایک حاجی صاحب کا بستره تو کھول دیا لیکن اس شہر میں جو سینکڑوں دوسرے "پاجی" اس کاروبار میں مصروف

ہیں، ان کا بستر کیوں نہیں کھولا جاتا ! گاؤ کدل کے حاجی صاحب بچارے مفت میں بدنام ہوئے، چار بیویوں کا شوہر، تین لڑکوں کا مالک، اور دو کوٹھیوں کا خالق، اگر اپنے بسترے میں تیس چالیس کلو سمو دیتا ہے تو کونسی بڑی بات ہے۔ اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ حاجی صاحب نے خود کبھی اس کافر شے کو منہ نہیں لگایا ہے۔ وہ تو اپنی چار بیویوں کے لئے بیرونی زرِ مبادلہ کما رہے تھے۔ اور میری اطلاع ہے کہ اس سال ان کے دوبارہ حج بیت اللہ پر جانے کا پروگرام تھا۔ اسے کہتے ہیں خدا کی رحمت پر بے پناہ اعتماد !

چرس کے معاملے میں عام لوگ کچھ عجیب عجیب سے سوالات کر رہے ہیں مثلاً یہ کہ پولیس جو چرس ضبط کرتی ہے۔ وہ کہاں جاتی ہے ؟ پچھلے ایک ڈیڑھ سال کے دوران کشمیر پولیس نے کُل ملا کر ۷۰، ۸۰ کلو چرس ضبط کی ہوگی۔ لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ چرس اس وقت کہاں ہے ؟ اس میں سے کتنی استعمال ہوئی ہے ؟ اور کتنی موجود ہے ؟ یہ کس کی تحویل میں رہتی ہے ؟ اس کے وزن میں یقیناً کمی ہوتی ہوگی۔ اس کا اندازہ کون کرتا ہے ؟ یہ سوال اس لئے بھی اہم ہے کہ جب سے پولیس نے چرس کی اتنی بڑی مقدار ضبط کی ہے پولیس کے کچھ افسر بڑی بے خودی کے عالم میں نظر آتے ہیں۔ اور غالباً اسی لئے ابھی تک بلوا مہ ڈکیتی کا کوئی سُراغ نہیں مل سکا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ کچھ وزیر صاحبان، کچھ حلقہ پریذیڈنٹ اور بعض اہم عہدوں پر فائز افسر اس چیز سے شوق فرماتے ہیں۔ لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کہیں پولیس کی ضبط شدہ یہ چرس ---------

چرس کے اس ذکر کو ایک لطیفے پر ختم کرتا ہوں : پچھلے دنوں انسپکٹر جنرل پولیس شری سریندر ناتھ اخبار نویسوں کو ایک فرانسیسی سیاح سے ضبط شدہ چرس دکھا رہے تھے کہ جو اس نے جوتے کے تلوے میں چھپا رکھی تھی۔ مسٹر سریندر ناتھ نے اخبار والوں کو بتایا کہ یہ چرس وہ چترال پاکستان سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ تو اس پر ایک اخبار نویس نے کہا کہ پھر پولیس کو اسے اپنے پاس رکھنے کا کوئی ادھیکار نہیں، یہ عوامی ایکشن کمیٹی اور پولیٹیکل کانفرنس کے سپرد ہونا چاہیئے۔ کیونکہ مقدس سرزمین کا یہ تحفہ اس سرزمین کے پرستاروں کے پاس رہنا چاہیئے۔ اور وہی اس کی قدر کر سکتے ہیں۔

(۲۶ جولائی ۱۹۷۰ء)

اعلانِ جنگ

چراغ بیگ اعلانِ جنگ کرتا ہے ان بد طینت، بد کردار، بد اخلاق، بد ذات بد اطوار، بد قماش اور بد معاش سرمایہ داروں کے خلاف کہ جو بے ایمانی اور بد دیانتی سے کمائی ہوئی دولت کو بڑی بے شرمی، بے حیائی اور بے دردی کے ساتھ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادی پر صرف کرتے ہیں۔ چراغ بیگ اعلانِ جنگ کرتا ہے ان غریبوں، مفلسوں، ناداروں، بے کاروں، بے روزگاروں اور فاقہ کشوں کے خلاف کہ جو ان سرمایہ داروں کی دیکھا دیکھی اپنا اور اپنی بیوی کا پیٹ کاٹ کر، اپنے بچّوں کا مستقبل گروی رکھ کر، اپنی زندگی کی ساری خوشیاں بیچ کر، دھوم دھام سے اپنی بٹیا کی شادی رچاتے ہیں۔ چراغ بیگ اعلانِ جنگ کرتا ہے، ان تمام بزرگوں، رہنماؤں اور کرم فرماؤں کے خلاف کہ جن کی حوصلہ افزائی، اخلاقی مدد اور عملی اعانت سے سرمایہ داروں کو اپنی دولت کی نمائش اور ناداروں کو اپنے افلاس کا 'رقص' منظم کرنے کی تحریک اور ترغیب ملتی ہے۔

شادی بیاہ کے مواقع پر اپنی امارت، شان و شوکت اور 'خاندانیت' کا مظاہرہ کرنے کا رجحان بہت پرانا ہے۔ اور خاص طور پر اہلِ کشمیر کی وضع داری اس معاملے میں بہت مشہور ہے، لیکن آزادی سے قبل نام و نمود، نمائش اور اصراف کی یہ 'عیاشی'، صرف کچھ خاندانوں تک محدود تھی۔ اور عام طور پر شادی بیاہ کی تقریبات میں غیر ضروری 'دکھاوا'، معیوب سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں جب

پاکستانی قبائلوں نے ریاست کو مہاراجہ ہری سنگھ کی غلامی سے آزاد کرایا، تو کشمیر میں ٹھیکے داروں، کوٹھداروں اور سیاسی جاگیرداروں کا ایک نیا طبقہ وجود میں آیا۔ یہ لوگ قبائلی حملے سے پہلے سرسوں کا تیل، مرغیوں کے انڈے اور پھٹے پرانے کپڑے بیچتے تھے، لیکن قبائلی حملے کی برکت اور ہندوستان سے الحاق کی بدولت تیل بیچنے والا بیٹروں کا ٹھیکدار، انڈے بیچنے والا کوٹھدار اور پھٹے پرانے کپڑے بیچنے والا سیاسی لیڈر یا وزیر بن گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ 'بھکاری' پہلے ہزار پتی اور پھر لکھ پتی بن گئے۔ جوں جوں آزادی کی "برکتیں" عام ہوتی گئیں۔ نئے لکھ پتیوں کا دائرہ بھی وسیع ہونے لگا۔ اور صرف چند سالوں میں ہی جھونپڑیوں کی جگہ محل، اور ٹوٹی پھوٹی سائیکلوں کی جگہ چمکیلی کاریں نظر آنے لگیں، لیکن آزادی کا یہ نور چالیس لاکھ آبادی میں صرف تیس چالیس انسانوں کو ہی سیراب کر سکا۔ اور ہر محل کی آغوش میں سینکڑوں جھونپڑیاں اور ہر کار کے تعاقب میں ہزاروں سائیکلیں معاشی نابرابری، اقتصادی ناہمواری اور طبقاتی کشمکش کا اعلان کرتی رہیں۔ بغیر محنت کے کمائی ہوئی اس دولت نے ایک نئی اخلاقیات کو جنم دیا اور اس کی رُو سے شرافت، نجابت، خاندان، عزّت، عظمت اور شہرت کے نئے پیمانے مقرر ہوئے اور نئے لکھ پتیوں نے اپنے ماضی سے نجات پانے کے لئے خاندانی رئیسوں اور شرفا کے طور واطوار اپنانا شروع کئے اور اس کوشش میں وہ اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ پُرانے بادہ خوار ان کے مقابلے میں گنوار نظر آنے لگے!

آسمان سے اُتری ہوئی اس دولت کی نمائش کے لئے شادی بیاہ سے بہتر موقع ہاتھ نہ آسکتا تھا، اس لئے نو دولتیوں نے اپنے احساس کمتری کو مٹانے کے لئے بے تحاشا دولت پھونکنا شروع کردی۔ شادی کی بات چیت سے لیکر طلاق تک۔ (ایسی شادیوں کا انجام عام طور پر طلاق ہوتا ہے) ہزروں روپیہ رسوم ورواج کی پابندی پر صرف کیا جانے لگا۔ اور ایسے ایسے رواج دوبارہ زندہ کر دئے گئے کہ جو اپنی موت آپ مر چکے تھے۔ جہیز کی منحوس اور خبیث رسم کو عزت اور وقار کا ایک ایسا مسئلہ بنا

دیا گیا کہ بہت سے خاندان اس رسم کو نبھاتے نبھاتے مٹی میں رل گئے۔ پہلے لوگ اپنی لڑکیوں کو قرآن شریف، سیرت النبیؐ اور مسدّسِ حالی بطور جہیز کے دیا کرتے تھے، اب موٹر، مکان اور سکوٹر دیئے جانے لگے۔ پہلے لڑکی کی صورت، سیرت اور اس کے کردار کی قدر و منزلت ہوا کرتی تھی۔ اب اس کے باپ کی دولت، ثروت اور اس کی نیت پر نگاہ رکھی جاتی ہے۔ ماں باپ بالکل تاجروں کی طرح اپنے بچّوں کا سودا کرتے ہیں۔ بچّے نہ ہوئے منڈیوں میں بکنے والے بھیڑ بکری ہوئے۔ لیکن اس 'سودا بازی' پر نئے زمانے نے شرافت اور خاندانیت کی مہر ثبت کردی ہے۔ اور اسی لئے جب کوئی ماں یہ کہتی ہے کہ میرا بیٹا تو پچاس ہزار سے کم میں نہ ملے گا۔ تو سننے والوں کی آنکھوں میں حیرت و استعجاب کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ اسی طرح جب کوئی باپ یہ کہتا ہے کہ لڑکی کی شادی پر تیس چالیس ہزار روپے خرچ ہوگا، تو اس کے یہ معنی ہیں کہ یہ تیس چالیس ہزار روپے اپنے سر سے لڑکی کا بوجھ اُتارنے میں خرچ ہوگا! گویا اس میں کوئی قباحت، کوئی بُرائی نہیں ہے۔ اور زمانے نے رسم و رواج کی پابندی کے نام پر ٹھیکداروں، گوداموں اور چور بازاریوں کا ضابطۂ حیات بغیر کسی چون و چرا کے قبول کر لیا ہے۔ چرس کے اسمگلر، جنگلات کے چور، سرکاری سیمنٹ میں ہیرا پھیری کرنے والے، بیرونی سکّے کی ناجائز تجارت کرنے والے، اکسائز میں لاکھوں روپیہ کا غبن کرنے والے افسر، ٹرانسپورٹ کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے والے، خوراک میں ملاوٹ کر کے انسانی زندگیوں کا بیوپار کرنے والے، ماتحت افسروں سے نذرانہ وصول کرنے والے، تارکانِ وطن کے جائدادوں کو غصب کرنے والے، دودھ میں پانی ملانے والے اور ادویات کی بلیک مارکیٹنگ کرنے والے یہ "شریف" لوگ جب اپنی بیٹیوں کی شادی میں رہنمایانِ قوم، وزراء مملکت، معززینِ شہر، اور واعظانِ شہر کو مدعو کر کے ان کی خدمت میں انواع و اقسام کی بہتر ضیافتیں پیش کرتے ہیں تو اُن کے غریب اور قلّاش پڑوسی اُن کی شرافت، عظمت اور نجابت پر ایمان لاتے ہیں، یہی نہیں وہ اپنی بیٹیوں کی

شادی پر بہتر نہ سہی، پچاس قسم کی ضیافتیں تیار کروانے کے لئے اپنی بیوی کا زیور اور اپنا آبائی مکان سب کچھ بیچ دیتے ہیں۔ تاکہ وہ شرافت اور نجابت کے اس نئے معیار پر پورا اُتر سکیں کہ جسے ان کے دولت مند پڑوسی نے قائم کیا ہے۔ اس طرح غربت کے تنزل، اس کی تباہی اور تذلیل کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے کہ جو اُسے اُس کے بچوں اور اس کی آئندہ نسلوں کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ تباہی کے اسی خوفناک عمل کو روکنے کے لئے سرینگر کے کچھ حسّاس، باعزّت اور جرأت مند نوجوانوں نے سماجی اصلاح کا بیڑہ اُٹھایا ہے۔ ان کا مقصد شادی بیاہ کے مواقع پر بے جا اصراف، غیر ضروری رسوم و رواج اور فرسودہ روایات سے نجات حاصل کرنا ہے۔ ناجائز طور پر کمائی ہوئی دولت کی پھیلائی ہوئی غلاظت سے معاشرے کو پاک و صاف کرنا ہے سمگلروں اور چور بازاریوں کے مرتب کردہ سماجی ضابطوں کو توڑ کر قناعت اور سادگی کا وہ معیار اپنانا ہے کہ جسے ہادئ برحق حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہرا[ؓ] کی شادی پر قائم کیا تھا۔ شادی کے موقع پر پر تکلف ضیافتوں کا رواج ختم کرنا ہے کہ اس میں ہزاروں روپیہ برباد ہو جاتا ہے۔ یہ بظاہر بڑے معصوم اور بے ضرر مقاصد ہیں۔ لیکن سماجی بدعتوں اور فرسودہ رسم و رواج کی جڑیں بہت مضبوط ہوتی ہیں۔ اس لئے ان کو جڑ سے اکھیڑنا اتنا آسان نہیں، جتنا نظر آتا ہے۔ اسمیں سب سے زیادہ مزاحمت وہ لوگ کریں گے کہ جن کی شرافت اور خاندانیت کی ساری عمارت دولت کی نمائش اور ثروت کے اظہار پر کھڑی ہے۔ اس کے بعد وہ لوگ کہ جن کے پاس ناجائز ذرائع سے پیدا کی ہوئی اتنی دولت ہے کہ وہ نہیں جانتے کہ اتنی ساری دولت کا کیا کیا جائے۔ ان کے لئے اصراف اور فضول خرچی ناگزیر ضرورت ہے، اور آخر میں وہ لوگ کہ جو جھوٹے وقار، جھوٹی عزّت اور اپنی ٹوٹی ہوئی ناک کو بچانے کے لئے اپنا سب کچھ بیچ کر ایسے مواقع پر ایک تماشا کرنے کے عادی بن چکے ہیں۔ سماجی اصلاح کا بیڑا اُٹھانے والوں کو ان سب قوتوں سے لڑنا ہوگا۔ اور اس کے علاوہ اس مفادِ خصوصی سے کہ جن کے لئے رئیسوں کی قباحتیں اور غریبوں کی

حماقتیں آمدنی اور منافع کا ایک ذریعہ ہیں۔ یہ وہ گدھ ہیں کہ جو لاشوں سے گوشت نوچ نوچ کر اپنی غذا مہیّا کرتے ہیں۔ ان کے لئے اصراف اور فضول خرچی، روایات، تمدن، تہذیب اور مذہب کا دوسرا نام ہے۔ اندیشہ یہ ہے کہ یہ لوگ سماجی اصلاح کی تحریک کے خلاف مذہبی کتابوں اور صحیفوں سے دلائل و براہین کے تیر و تفنگ لے کر سامنے آجائیں۔ لیکن یہ تحریک اتنی صالح، صحت مند، مقدّس اور ضروری ہے کہ اس کے علمبرداروں کو مخالفت، مزاحمت اور مخاصمت کے ہر معرکے کے لئے تیار رہنا ہوگا۔ اور ہر اُس لیڈر اور سوداگر کی مخالفت میں ڈٹ جانا چاہیئے کہ جو غریبوں کے افلاس اور ان کی بہو بیٹیوں کی عصمت کو نیلام کر کے معاشرے میں ایسی بدعتوں کو روا رکھنا چاہتا ہے کہ جن کی اجازت نہ مذہب دیتا ہے اور نہ بدلتے ہوئے وقت کے تقاضے۔

اصل میں یہ مسئلہ ان نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا ہے کہ جن کے جسم و جان کو بھیڑ بکریوں کی طرح نیلام پر چڑھا کر ان کے مستقبل کا سودا کیا جاتا ہے، کہ جنہیں شادی کے پوتر بندھن میں باندھنے کی بجائے رسم و رواج کی بدعتوں میں جکڑ لیا جاتا ہے کہ جن کے خوابوں کو سونے اور چاندی کے مول بیچ کر ان کے والدین اپنی بیمار حسرتوں اور دم توڑتی ہوئی آرزوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نوجوانوں کو اس فرسودہ، بیمار اور اندھے نظام کے خلاف ایک فیصلہ کن بغاوت کرنا ہوگی۔ ہمارے نوجوانوں نے سرکاری عمارتوں اور بسوں پر پتھراؤ کرنے میں بہت وقت ضائع کیا ہے۔ اس مریض اور سسکتے ہوئے سماج پر پتھراؤ کرنے کا وقت آگیا ہے کہ جو بے ایمان افسروں اور بدکردار تاجروں نے اپنی ہوس پوری کرنے کے لئے تعمیر کیا ہے۔ چراغ بیگ تشدّد کو ناپسند کرتا ہے لیکن وہ عدم تشدّد کو اپنے ایمان کا جز نہیں سمجھتا۔ اور جب کوئی گلا سڑا نظام عدمِ تشدد سے ختم نہیں ہوتا تو اسے تشدد کے ذریعہ ختم کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ میری خواہش ہے کہ ہمارے کالجوں اور سکولوں میں تعلیم پانے والے نوجوان اپنی قوت اور صلاحیت کا صحیح استعمال کرتے ہوئے سماجی اصلاح کی اس تحریک کے ہراول دستے میں شامل ہو کر چراغ بیگ کی طرح ان تمام امیروں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیں کہ جنہوں نے

اپنی دولت کے ناسور سے پورے سماج کو ملوث کر دیا ہے۔ دولت کے بے تحاشا استعمال اور اسراف کی بدعتوں کے خلاف مؤثر جنگ لڑنے کا ایک ہی طریقہ ہے، اور وہ یہ کہ ایسے دولتمندوں کے سر سے شرافت اور خاندانیت کا تاج اُتار پھینک دیا جائے۔ کہ جو اپنی بہو، بیٹیوں کو سونے میں تول کر غریب کی بیٹی کو اپنے باپ کے لئے ایک دہکتا ہوا جہنم بنا دیتے ہیں کہ جس کو اپنے سر سے اُتارنے کے لئے وہ اپنا ناموس بیچنے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس رئیس کا سر پھوڑ دینا چاہیئے کہ جو دولت کے سہارے اپنا سر اونچا رکھنا چاہتا ہے۔ اس مکان میں آگ لگا دینی چاہیئے کہ جہاں سے شادی بیاہ کے موقع پر 'وازوان' کا دھواں اُٹھتا دکھائی دے، کہ اس دھوئیں میں بہت سے غریب اور مفلوک الحال بیٹیوں کی عزّت و عصمت کا خون شامل ہوتا ہے۔ میں چاہوں گا کہ ہزاروں نوجوان اس گھر پر ٹوٹ پڑیں کہ جہاں شادی کے نام پر دولت۔ ناجائز دولت۔ کی نمائش سجی ہوئی ہو۔ اور صاحبِ خانہ سے یہ دریافت کیا جائے کہ "بتاؤ تمہارے پاس یہ دولت کہاں سے آئی؟" اور جب تک صاحبِ خانہ اس کا تسلّی بخش جواب نہیں دیتا اس کا گھیراؤ کیا جائے۔ چراغ بیگ اس نیک کام کے لئے تشدّد کو بھی جائز سمجھتا ہے اور مجھے امید ہے کہ نوجوان میرا اشارہ سمجھ جائیں گے!

آئیے ہم سب عہد کریں کہ ہمارے لئے کسی ایسی دعوت میں شریک ہونا حرام ہو گا کہ جہاں 'وازوان' اور اس قسم کے دوسرے اسراف کا شائبہ بھی نظر آئے۔

میں جناب شیخ صاحب، صادق صاحب، مولینا محمد فاروق اور دوسرے زعمائے گذارش کروں گا کہ وہ بھی چراغ بیگ کی طرح ایسی تمام دعوتوں میں شرکت سے انکار کر دیں کہ جہاں اسراف، فضول خرچی اور بے جا رسوم و رواج کا پرتو بھی نظر آئے۔ کیا میں اُمید رکھ سکتا ہوں کہ میری اس گذارش پر ہمدردانہ غور ہو گا۔

(۸ر اگست ۱۹۷۰ء)

۱۵ر اگست

فریبِ آزادی

آج پندرہ اگست ہے اور ۲۳ برس قبل آج ہی کے دن وہ شب گزیدہ سحر طلوع ہوئی تھی کہ جس کی پیشانی پر خونِ صد ہزار انجم کے داغ اور جس کے دامن پر صدیوں کی ظلمت اور تاریکی کے نشان موجود تھے۔ خاک و خون میں لتھڑی ہوئی آزادی کی یہ صبح ہمارے خوابوں کی تعبیر تو نہ تھی، لیکن انگریز کی غلامی سے آزاد ہونے کی مسرت میں ہم نے آزادی کے اس بھیانک روپ کو بھی گلے لگایا اور اپنی دھرتی سے انگریز کے ناپاک قدموں کے نشان مٹانے کے لئے ہم نے پورے برصغیر کو خون سے نہلا دیا۔ آزادی کا جشن منانے کے لئے ہم نے معصوم بچوں کو تلوار کی نوک پر اُٹھا کر ہوا میں اُچھال دیا۔ ننگی عورتوں کے جلوس نکالے، نوجوان لڑکیوں کی چھاتیاں کاٹ لیں، بڑے بوڑھوں کی آنکھیں نکال دیں، اور چراغاں کی خاطر ہزاروں مکانات میں آگ لگادی۔ انسانی تاریخ نے اتنا خوفناک جشن آج تک نہ دیکھا تھا۔

آزادی کا طلسم ٹوٹنے لگا تو کچھ تلخ حقائق نے دامن تھام لیا۔ اور ہمیں چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں بکھری ہوئی نظر آئیں، انسانی لاشیں، اصولوں اور آدرشوں کی لاشیں، آرزوؤں اور تمناؤں کی لاشیں اور خوابوں کی لاشیں۔ لاشوں کے اس ڈھیر میں مہاتما گاندھی اس ہندوستان کو تلاش کرنے لگ گئے کہ جسے انہوں نے بڑی اُمیدوں اور آرزوؤں کے ساتھ کروڑوں ہندوستانیوں کا خواب بنادیا تھا۔ آزادی

کی صبح نمودار ہونے کے ساتھ ہی یہ ہندوستان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا تھا۔ اور گاندھی جی ہی کی طرح کروڑوں ہندوؤں اور مسلمانوں کا خواب بھی ٹوٹ گیا تھا۔ ناکامی، مایوسی اور محرومی کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی گاندھی جی نے امید کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا اور وہ ٹوٹے ہوئے خوابوں کو ایک بار پھر جوڑنے کے لئے کمربستہ ہو گئے۔ آج کا ہندوستان ان کی اسی کوشش ناتمام کا عنوان ہے۔ قاتل کی گولیوں نے ان کا سینہ چھلنی نہ کیا ہوتا تو اُس سینے میں آج بھی سارے جہاں کا درد سمایا ہوتا۔

آزادی کے ان ۲۳ برسوں میں ہم نے بہت ترقی کی ہے۔ تعمیر اور ترقی کے بڑے بڑے منصوبے مکمل ہوئے ہیں، اور بہت سے عظیم منصوبے ابھی زیرِ تکمیل ہیں۔ تعلیم، صنعت آبپاسی، رسل و رسائل، خوراک اور بجلی کی پیداوار میں، غرض زندگی کے ہر شعبے میں ہمارے ملک نے قابلِ ذکر ترقی کی ہے۔ ترقی کی یہ رفتار کبھی کبھی مدھم پڑ جاتی ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی ملک آگے بڑھ رہا ہے۔ اور صنعتی پیداوار میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ بظاہر یہ صورتِ حال تسلّی بخش ہے اور ملک کے مستقبل سے مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، لیکن اس کے باوجود ملک میں سخت بےچینی، اضطراب اور تشویش کے آثار نمایاں ہیں۔ مایوسی اور محرومی کا احساس روز بروز شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا ہے۔ اور عام لوگوں میں تشدد کا رُجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ بے کاری اور بے روزگاری کے ساتھ ساتھ ضروریاتِ زندگی کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافے نے نوجوانوں کو ایک شدید ذہنی کرب میں مبتلا کر دیا ہے اور انہیں اپنا مستقبل غیر یقینی نظر آتا ہے۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ ملک آگے بڑھ رہا ہے، لیکن ملک کدھر جا رہا ہے؟ یہ کسی کو اندازہ نہیں۔ جب تک منزل اور سمت کا تعین نہ ہو آگے بڑھنا بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ خطرے کے اسی احساس نے پوری قوم کو ایک ناقابلِ بیان اذیت میں مبتلا کر دیا ہے۔ اور اسی روحانی کرب اور نفسیاتی کشمکش کا فائدہ اُٹھا کر ہندوستان کی فرقہ پرست اور رجعت پسند قوتیں، فرقہ پرستی اور رجعت پرستی کا معجون بیچنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ۲۳ برس بعد بھی ملک میں یک جہتی، اتحاد، اتفاق اور بھائی چارے کا

احساس مفقود ہے۔ اور فرقہ وارانہ فسادات کی آگ، ہمارے ماضی اور مستقبل کو ہی خاکستر کر دینے کے لئے بے چین نظر آتی ہے۔ آزادی کے ان ۲۳ برسوں میں، ہم نے بجلی اور خوراک کی پیداوار میں اضافے کے ساتھ ساتھ باہمی نفرت اور عداوت کے بڑے بڑے پاور ہاؤس بھی تعمیر کئے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ معاشی اور اقتصادی ترقی محض ایک فریب اور دکھاوا معلوم ہوتی ہے اور ہندوستان کی زخمی روح فریاد کرتی ہوئی نظر آتی ہے، کہ ہر عظیم منصوبے کی آغوش میں نفرت، بے اطمینانی اور ناآسودگی کے پہاڑ پرورش پاتے ہیں۔ اور جب تک اس بات کا قطعی فیصلہ نہ ہو کہ اس ملک کی منزل اور تقدیر کیا ہے۔ بھاکڑہ ننگل، بھلائی اور سندری کی عبادت گاہیں، ان گناہوں پر پردہ نہیں ڈال سکتیں کہ جو رانچی، جبل پور، احمد آباد، چائباسہ اور بھیونڈی میں سرزد ہو جاتے ہیں۔ صرف آگے بڑھنا ہی کافی نہیں، صحیح سمت میں آگے بڑھنا ہی ملک کی صحت اور سلامتی کا ضامن ہو سکتا ہے۔

آج ۲۳ برس بعد بھی اگر ہم سوشلزم اور سیکولرزم کی تعریف معین نہیں کر سکتے ہیں، تو سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم نے آزادی کے بہت قیمتی لمحات ضائع کر دئے ہیں۔ ملک میں سرمایہ داری کے بڑھتے ہوئے رجحانات اور اجارہ داری کے بڑھتے ہوئے امکانات اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہم نے سوشلزم کے تصوّر سے غدّاری کی ہے۔ آئے دن کے خوفناک فرقہ وارانہ فسادات اس بات کے گواہ ہیں کہ ہم نے سیکولرزم کو اپنی زندگی اور سوچ کا ایک حصّہ بنانے کی بجائے اس ایک خوبصورت نعرے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ آج کچھ لوگ سنجیدگی سے اس بات کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ فرقہ واریت کی صحیح تعریف معین کرنے کیلئے ایک ٹریبونل قائم کر دیا جائے۔ یہ اس ذہنی انتشار اور فکری پراگندگی کا نتیجہ ہے کہ کیرالا کی مسلم لیگ، جنوبی ہندوستان کے محدود دائرے سے نکل کر شمالی ہندوستان کی وسعتوں میں پھیلنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اور جن سنگھ، کانگریس اور سوتنتر پارٹی کے ساتھ مل کر متحدہ محاذ بنانے کی فکر میں ہے۔ اس نظریاتی انتشار اور ان ناپاک گٹھ جوڑوں

کی تمام تر ذمہ داری ان کانگریسی رہنماؤں پر ہے کہ جو آج ۲۳ برس تک ملک کے سیاہ و سفید کے مالک ہونے کے باوجود ابھی تک سفر کی سمت اور منزل کا تعین کرنے میں ناکام رہے ہیں، کہ جو اپنے آپ کو کسی طور پر اقتدار سے وابستہ رکھنے کے لئے فرقہ پرست طاقتوں سے مصالحت اور مفاہمت کرنے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے، نکسلی انتہاپسندوں کی تحریک، ملک میں تشدد کا بڑھتا ہوا رجحان، نوجوانوں کی سرکشی اور عام لوگوں کے احتجاج کی بڑھتی ہوئی لے، حکمرانوں کی بے ضمیری، ابن الوقتی، جاہ پرستی اور بے اصولے پن کے خلاف ایک شدید ردعمل کا نتیجہ ہے۔ اور وہ وقت دور نہیں، کہ عافیت پسند سیاست اپنے اندرونی تضادات کے دباؤ کی تاب نہ لاکر غبارے کی طرح پھٹ جائے گی۔ اور سارا ملک انقلاب کی زد میں ہوگا، یہ انقلاب کس نوعیت کا ہوگا؟ اس کے متعلق ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ اس انقلاب کو اس مصلحت پسند سیاست اور بے اُصولے پن سے غذا مل رہی ہے، کہ جو اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے صرف کھوکھلے نعروں کا سہارا لے رہی ہے۔ بنگال سے اُٹھنے والا دھواں سارے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور اگر اس کے عناصرِ ترکیبی کا جائزہ لے کر اُس بے اطمینانی اور ناآسودگی کو دور کرنے کی کوشش نہ کی گئی، کہ جو اس دھوئیں کی پرورش کرتی ہے تو پھر یہ دھواں آگ بن کر موجودہ نظام کو جلا کر راکھ کر دیگا۔
اگر ہمارا آئین، ہمارے جمہوری ادارے اور اخلاق و شرافت کی موجودہ قدریں نئے مسائل اور نئے تقاضوں کا ساتھ دینے میں ناکام رہے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ آنے والے انقلاب کا سیلاب ان سب کو خس و خاشاک کی طرح بہالے گا۔

۲۳ برس کا سن عینِ شباب کا عالم ہوتا ہے، لیکن ہماری آزادی کے چہرے پر بڑھاپا نظر آنے لگا ہے۔ ہمارے مستقبل پر جھریوں کے نشان پڑ گئے ہیں۔ اور ہمارا ماضی، ہمارے گناہوں کے گرد و غبار سے اٹا پڑا ہے۔ ہم صرف

یہ دہرا رہے ہیں کہ ہمارا ماضی شاندار تھا، ہم یہ نہیں جانتے کہ ہمارا مستقبل کیا ہوگا ؟ اور آج ۱۵ر اگست کو جب لال قلعے پر ترنگا جھنڈا لہرایا جائے گا تو ہندوستان کے کروڑوں عوام کی جھکی ہوئی گردنیں، بجھی ہوئی آنکھیں اور بیمار نظریں یہ سوال کریں گی کہ کیا اسی دن کے لئے ہم نے صدیوں سے ریاض کیا تھا ؟ کیا یہی وہ آزادی ہے کہ جس کے لئے بھگت سنگھ سے مہاتما گاندھی تک ہزاروں ہندوستانیوں نے اپنا خون بہایا تھا ؟ کیا یہی وہ جھنڈا ہے کہ جس کی آبرو بچانے کے لئے ہمارے سینکڑوں بہادروں نے اپنا بلیدان دیا تھا ؟ یہ وہ سوال ہیں کہ جن کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں۔ اور آزادی کی ۲۳ ویں سالگرہ مناتے وقت ہمیں ان سوالات پر کم از کم غور تو کرنا چاہیئے۔

(۱۵ر اگست ۱۹۷۰ء)

لیلیٰ کا خط! مجنوں کے نام

پیارے مجنوں!

امید ہے کہ تم اپنے سکوٹر سمیت اچھی طرح سے ہو گے۔ میں خوش ہوں کہ تم باقاعدگی ہر ہفتے اپنی بے پناہ محبّت کا اظہار کرنے کے لئے اتنی دور سے چلے آتے ہو۔ تم کوشش کر کے اپنا تبادلہ شہر کیوں نہیں کرواتے تاکہ ہر ہفتے کی بجائے ہر روز ملاقات ہو سکے۔ میں جانتی ہوں کہ تم کیا کہو گے! یہی نا کہ اپنے ابا سے کہہ کر میرا تبادلہ کروا کیوں نہیں لیتی؟ مگر میرے پیارے مجنوں! مجھے شادی سے پہلے ابا سے تمہارا ذکر کرتے ہوئے کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔ وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔ اس ہجر فرقت، اور انتظار کی آگ سے نجات کی صرف ایک صورت نظر آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ ہماری شادی جلدی جلدی انجام پائے اور میں تمہیں آج یہ خوشخبری سُنانا چاہتی ہوں کہ کل تمہارے والد میرے والد سے اس بارے میں بات چیت کرنے کے لئے ہمارے گھر تشریف لائے تھے۔ میں نے تمہارے والد صاحب کو کل پہلی مرتبہ دیکھا اور مجھے معاف کرنا کہ وہ شکل وصورت سے بالکل قصائی دکھائی دیتے ہیں۔ اتنا بڑا سا پیٹ، میلی کچیلی پگڑی اور من بھر جوتے، مجھے تو ان کو دیکھ کر گھن آنے لگی، معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے ۱۵ اگست ۴۷ء کے بعد سے کبھی اپنے دانت صاف نہیں کئے ہیں۔ مگر اس کی ضرورت بھی کیا تھی؟ ہاں تو میں تم سے کہہ رہی تھی کہ وہ کل میرے ابّا سے تمہاری شادی کی تاریخ طے کرنے کے لئے آئے تھے، اور تم اندازہ کر سکتے ہو کہ ان کا

استقبال کرتے ہوئے مجھے کتنی خوشی ہوئی ہوگی !

مجنوں صاحب ! آپ نے اپنی محبّت اور شرافت کا یقین دلانے کے لئے میرے نام پچھلے دو برسوں میں جو اڑھائی سو خطوط لکھے ہیں۔ وہ سب کے سب میرے پاس محفوظ ہیں ۔ ان خطوط میں جس والہانہ محبت اور عاشقانہ بے صبری کا اظہار کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی زندگی میرے بغیر نامکمل ہے ۔ اور میری جُدائی میں آپ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیامت سے کم نہیں ۔ اِنہی خطوط میں سکوٹر کے لئے بھی شکریہ ادا کیا گیا ہے کہ جو پچھلے سال عید الفطر کے موقع پر میرے ابّا نے آپ کو بطورِ تحفہ بھیجا تھا ۔ یہ تحفہ وصول ہونے پر آپ نے میرے نام ایک بہت ہی جذباتی خط لکھا تھا کہ جس کا ایک فقرہ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔ " بھلا اس کی کیا ضرورت تھی ، آپ کے والد نے بے جا تکلف سے کام لیا ہے۔ لیکن میں ان کی محبّت اور شفقت کو ٹھکرا نہیں سکتا ۔"

کل آپ کے والد صاحب ، جب میرے ابّا کے ساتھ ڈرائنگ روم میں باتیں کر رہے تھے ، تو میں باتھ روم کے ساتھ والی کھڑکی کے قریب کان لگا کر سُن رہی تھی ۔ مجھے اس گستاخی کے لئے معاف کرنا ، کہ میں یہ جاننے کے لئے بے قرار تھی کہ مجھے ڈولی میں بیٹھ کر اپنے خوابوں کے شہزادے کے ہاں کب جانا ہوگا ، لیکن آپ کے والد صاحب ، معاف کیجئے صورت سے ہی نہیں ، سیرت سے بھی قصائی نکلے ، اور ان کی گفتگو سُن کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ انہیں بہو کی نہیں ، دولت اور جائداد کی ضرورت ہے ۔ اور وہ آپ کو نیلام کر کے اپنی ضروریات پورا کرنے کے لئے بے چین ہیں ۔ آپ جاننا چاہیں گے کہ کل شام ڈرائنگ روم میں آپ کے والد کیا کہہ رہے تھے ؟ سُن لیجئے ۔

" میں نے اپنے بیٹے پر ۲۵ ہزار روپے خرچ کر کے اُسے انجینئر (اسسٹنٹ انجینئر) بنایا ہے ۔ وہ تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوا تھا ، اس لئے سیٹ حاصل کرنے کیلئے پانچ ہزار روپے دینا پڑے ، وہ امتحان میں دو مرتبہ فیل ہوا ، تو تیسری مرتبہ اُسے پاس کرانے کے لئے سات آٹھ ہزار روپے خرچ کرنا پڑے ۔ اب وہ انجینئر ہے ۔

(تمہارے والد صاحب انجینئر اور اسسٹنٹ انجینئر کا فرق نہیں جانتے) اور اس کی ماہوار آمدن آٹھ سو اور بارہ سو کے درمیان ہے۔ (حالانکہ تمہاری کُل تنخواہ دو سو پچیس روپے ماہوار ہے اور یہ انکشاف بھی تمہارے والد نے کیا ہے) اس کی شادی کے لئے کئی جگہ سے پیغامات موصول ہوئے ہیں اور کچھ لوگوں نے اُسے کار کے علاوہ نقد تیس چالیس ہزار کی پیشکش بھی کی ہے، لیکن اُسے چونکہ آپ کی لڑکی پسند ہے، اس لئے میں نے ہر جگہ ناکر دی ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اس کی پسند کی خاطر اسکے نفع نقصان کے بارے میں نہ سوچوں۔ اور میں جانتا ہوں کہ آپ کو اپنی لڑکی کتنی عزیز ہے اور مجھے یقین ہے کہ اپنی بیٹی کی خاطر آپ کچھ بھی کرنے کے لئے تیار ہوں گے۔"

مجنوں صاحب! آپ کی سمجھ میں آگیا کہ آپ کے والد صاحب کیا کہنا چاہتے ہیں؟ وہ ہماری محبّت کی قیمت لگا رہے تھے اور کچھ دیر بعد انہوں نے اس کی یوں وضاحت کی: "ایک تو مجھے ان کی پڑھائی پر لگایا ہوا روپیہ مل جانا چاہیئے، دوسرا میں اپنے بیٹے کو اب سکوٹر پر آتے جاتے نہیں دیکھ سکتا اور میرا خیال ہے کہ شادی کے بعد آپ بھی یہ پسند نہ کریں گے کہ آپ کی بیٹی سکوٹر پر بیٹھ کر گھوما کرے۔ دشمن لوگوں کو باتیں کرنے کا موقع ملے گا کہ بڑے باپ کی بیٹی ہے لیکن تتلیوں کی طرح اسکوٹر پر گھومتی ہے، اس لئے آپ کو ایک کار کا بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔ میں نہیں جانتی کہ تمہارے والد کے ان مطالبات کا میرے ابا نے کیا جواب دیا۔ لیکن میں اس کے بعد سُن نہ سکی اور وہاں سے چلی آئی، ہو سکتا ہے کہ میرے والد نے تمہارے والد کے تقاضے پورا کرنے کے لئے ہاں کہہ دی ہو کیونکہ وہ میری خاطر کچھ بھی کرنے کے لئے تیار ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے ناکر دی ہو، کیوں کہ میرے علاوہ بھی ان کی دو اور لڑکیاں ہیں اور اور انہوں نے شاید یہ سوچا ہو کہ اپنا سارا اثاثہ ایک لڑکی کو دینا سخت ناانصافی ہو گی، بہرحال ان کا جو بھی فیصلہ ہو، آپ میرا فیصلہ سُن لیجئے۔

جب سے ہماری منگنی طے ہوئی ہے میری والدہ آپ کو چھ سوٹ اور ایک ولایتی گھڑی، ایک دھسّہ، دو فونٹین پن اور ایک ٹرانسسٹر بھیج چکی ہیں۔ میرے والد نے

پچھلے ہی سال آپ کو ایک نیا سکوٹر خرید کر کے دیا ہے۔ اس کے علاوہ منگنی ہی کے دن میرے بھیّا کا محبوب کیمرہ بھی آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ یہ سب چیزیں آپ نے بڑی محبت اور شفقت سے قبول کر لیں۔ اور ہر بار آپ نے میرے نام شکریہ کا خط لکھ کر ان چیزوں کی قیمت چکانے کی کوشش کی۔ دو سال تک میں یہی سمجھتی رہی کہ آپ یہ چیزیں صرف ابّا اور اماں کا دل رکھنے کے لئے قبول کر رہے ہیں ورنہ آپ کو ان چیزوں کی قطعاً کوئی ہوس نہیں ہے۔ آپ نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ "مجھے نہ دولت کی ضرورت ہے، اور نہ جاہ و حشمت کی، مجھے تو صرف تمہاری محبت کی ضرورت ہے"۔ دو سال تک میں اس فریب کا شکار رہی اور کل جب آپ کے والد صاحب قصائیوں کی طرح میرا مول تول کر رہے تھے تو مجھے یہ تکلیف دہ احساس ہونے لگا کہ آپ اس لین دین میں برابر کے شریک ہیں اور آپ کی مرضی اور منشار سے یہ سب سودے بازی ہو رہی ہے۔ عشق و محبت کے دعوے دراصل حرص و ہوس کی آگ کو خوبصورت اصطلاحوں میں چھپانے کی کوشش کے سوا کچھ بھی نہیں، اور آپ بڑی خوشی سے نیلام ہونے کے لئے تیار ہیں۔ آپ کے والد کی گفتگو سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ لین دین کے محاذ پر انہیں آپ کی آشیرباد حاصل تھی۔ ورنہ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اس بے شرمی اور بے حیائی سے آپ کے دام لگاتے۔

مجنوں صاحب! مجھے معاف کیجئے کہ اس خط کے آغاز میں میں نے آپ کو 'تم' کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ یہ بے تکلفی اور یگانگت کا انداز اُس دور کی یادگار ہے کہ جب آپ کی محبت پر تجارت کا گماں نہ ہوتا تھا۔ کل شام آپ کے والد صاحب نے تجارت کے چہرے سے محبت کا ملمع اُتار کر، ایک نئی دنیا اور کچھ نئی حقیقتوں کو مجھ پر آشکارا کر دیا، اور مجھے آپ کے وجود سے نفرت ہو گئی۔ آپ کی غیرت نے یہ کیسے گوارا کر لیا کہ آپ کا قصائی باپ آپ کے لئے زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنے کے لئے بازاروں کے چکر کاٹے اور آپ میرے ماں باپ کے دئے ہوئے سکوٹر پر یوں گھومتے ہوئے نظر آئیں کہ جیسے یہ آپ کی محنت کا پھل ہو۔ میں ایسے بے غیرت مرد کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی گوارا

نہیں کر سکتی کہ جو اپنی مردانگی کو ایک موٹر کار کے عوض بیچ کر اپنی خودی اور اپنی عزت کا سودا کرتا پھرے۔ میں آج شام اپنے ابا کو یہ کہنے جا رہی ہوں کہ مجھے آپ کے ساتھ شادی کرنا کسی قیمت پر منظور نہیں۔ آپ کو موٹر کار اور بنگلے کی ہوس ہے تو رشوت لے لے کر اسے پوری کر لیجئے۔ لیکن شادی کے مقدس بندھن کو موٹر کاروں اور بنگلوں کی ہوس کا شکار بنا کر محبت کی تذلیل نہ کیجئے۔ آپ جیسے لوگوں کو کسی لڑکی سے شادی کرنے کی بجائے ایک اچھی سی موٹر سے شادی کرنا چاہیئے۔

میرے بے غیرت مجنوں! مستقبل قریب میں جب آپ کی شادی کا سودا کسی مناسب جگہ پر طے پائے تو کیا یہ ممکن ہے کہ آپ میرے ابا کا دیا ہوا سکوٹر لوٹا دیں، کیونکہ میرے بھیا کی ٹوٹی سائیکل اب اتنی ضعیف ہو چکی ہے کہ چند قدم چل کر ہی اس کی سانس پھولنے لگتی ہے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ آپ بھیا کا وہ محبوب کیمرہ بھی واپس بھیج دیں کہ جو انہوں نے بڑے شوق سے خریدا تھا! میں ان چیزوں کا مطالبہ تو نہیں کرتی، لیکن اگر آپ کے بے غیرت وجود میں اب بھی کہیں غیرت کی کوئی رمق باقی ہے تو آپ کو یہ سب چیزیں اپنے پاس رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

میرے کفن چور مجنوں! خدا کے لئے آئندہ کسی لڑکی کو اپنی محبت کا یقین دلاتے کے لئے محبت بھرے خط نہ لکھا کیجئے۔ اپنے قصائی باپ کی طرح صاف صاف مول تول کی بات کیجئے، تاکہ میری طرح بہت سی لڑکیوں کو بہت دنوں تک فریب میں مبتلا نہ ہونا پڑے۔

(۱۵ر اگست ۱۹۷۰ء)

اِصلاحی تحریک کے معترضین

سماجی اصلاح کے لئے زمین کتنی ہموار اور ماحول کس درجہ سازگار ہے۔ اس کا اندازہ چراغ بیگ کو پچھلے دو تین ہفتوں کے دوران شہر اور دیہات میں رسوماتِ بد کے خلاف نوجوانوں کی اس نئی تحریک کے مطالعہ سے ہوا کہ جو خوش قسمتی سے ابھی تک کسی سیاسی لیڈر یا مذہبی رہنما کی سرپرستی سے محروم ہے۔ فرسودہ رسوم و رواج، اسراف اور فضول خرچی کے خلاف عوامی ابھار کے حیات افروز مظاہرے دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس قوم میں ابھی اپنی حالت بدلنے کا احساس کلیتاً ختم نہیں ہوا ہے۔ اور راکھ کے ڈھیر میں ابھی کچھ چنگاریاں موجود ہیں، جو "کسی وقت" شعلہ بن سکتی ہیں۔ شادی بیاہ کے مواقع پر نمائش، ظاہرداری، تکلّف، اسراف اور بے ہودہ رسوم و رواج کے خلاف نئی تحریک اسی احساس کی پیداوار ہے اور چراغ بیگ کو یہ دیکھ کر بیحد مسرت ہو رہی ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے یہ تحریک ایک عظیم سماجی انقلاب کا روپ اختیار کر رہی ہے اور بغیر کسی "لیڈرشپ" یا "تنظیم" کے یہ انقلاب شہر اور دیہات کو اپنی زد میں لے رہا ہے۔ اس سے صرف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سماجی تضادات اور طبقاتی کشمکش نے عام لوگوں کو ایک ذہنی اور فکری انقلاب کے لئے بالکل تیار کر دیا ہے۔ اور وہ کہنہ روایات اور فرسودہ رسوم و رواج کی زنجیروں سے آزاد ہونے کے لئے بے چین ہیں۔

یوں تو ہماری سماجی زندگی کا ہر شعبہ، فرسودہ ذہنیت اور بے ہودہ روایات کے

کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ لیکن شادی بیاہ کی تقریبات پر جس جہالت، بے ہودگی اور بے اعتدالی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اُس سے ہماری معاشرت کا ہر پہلو متاثر ہوتا ہے اور یہ بالکل مناسب بات ہے کہ اصلاحی تحریک کے علمبرداروں نے سب سے پہلے جہالت اور کثافت کے اسی قلعے پر یلغار شروع کر دی ہے۔ جہیز، لین، دین، مول تول، ضیافت اور دوسری بدعات نے شادی کو سب سے مشکل، پے چیدہ، مہنگی اور جان لیوا تقریب بنا دیا ہے۔ ہماری آدھی زندگی اس کی تیاریوں اور آدھی اس سے پیدا ہونے والی بیماریوں کی دیکھ بھال میں صرف ہوتی ہے۔ اور اس کے باوجود یہ اطمینان نصیب نہیں ہوتا کہ سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ چند سرمایہ داروں نے دولت کا سہارا لے کر غریبوں کے لئے اخلاق، شرافت، وضع داری اور دنیاداری کے معیار مقرر کر لئے ہیں اور غریب لوگوں نے صحیفۂ آسمانی سمجھ کر ان بدعتوں کو اپنے لئے قبول کر لیا ہے۔ مستعار قدروں اور مصنوعی اخلاق کے ان ضابطوں نے بے چارے غریب کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ لیکن اپنی ناک بچانے کے لئے وہ اپنی کمر پر زندگی بھر یہ "بوجھ" اُٹھائے رہتا ہے۔ اور بالآخر اُسے یہ احساس ہو جاتا ہے کہ جس ناک کی خاطر اس نے اتنی بڑی قربانی دی ہے، اس ناک کو کوئی بھی قرض خواہ، کسی بھی وقت کاٹ کر لے جا سکتا ہے۔ اسی تکلیف دہ احساس نے آج غریبوں کو یہ ہمّت دی ہے کہ وہ ان رئیسوں کا گھیراؤ کریں کہ جو ناجائز طریقوں سے کمائی ہوئی دولت کا مظاہرہ کر کے غریب کی دنیا کو جہنّم بنانے پر بضد ہیں۔

شادی بیاہ کی تقریب کو قناعت، سادگی اور بے تکلفی کا ایک نمونہ بنانے میں بظاہر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن چراغ بیگ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی ہے کہ اس سیلاب کو روکنے کے لئے کچھ لوگ چمچ لے کر سامنے آ رہے ہیں۔ وہ بدحواسی اور پریشانی کے عالم میں یہ بھول گئے ہیں کہ انقلاب کا سیلاب چمچوں سے رکتا نہیں، بلکہ انہیں بہا کر لے جاتا ہے۔ یہ "کچھ لوگ کون ہیں؟ ان کا حلیہ کیا ہے؟ ان کی تاریخ اور ان کا جغرافیہ کیا ہے؟ یہ کیا چاہتے ہیں؟ اور کیوں چاہتے ہیں؟ چراغ بیگ

مختصر الفاظ میں یہ حکایت بیان کرنا چاہتا ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے پاس بغیر کسی محنت اور مشقت کے، دولت جمع ہو گئی ہے۔ ان میں زیادہ تر تعداد ان "شریفوں،، کی ہے کہ جو اپنے "ماضی" پر دولت کا پردہ ڈال کر، دنیا کی نظروں میں دھول جھونکنا چاہتے ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ آسمان سے اُتری ہوئی اس دولت کا کیا کریں۔ اس لئے یہ اسراف اور فضول خرچی کے جواز میں نقلی مولویوں اور جعلی مفتیوں کے فتویٰ پیش کرتے ہیں۔ ان "کچھ لوگوں،، میں وہ سادہ لوح، بھولے بھالے، معصوم صفت غریب بھی ہیں کہ جو اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں، کہ امیروں کے ٹھاٹھ باٹھ اختیار کرنے سے وہ بھی امیروں کی صف میں شامل ہو جائیں گے۔ ان احمقوں کو یہ معلوم نہیں کہ کوا ہنس کی چال چلنے سے ہنس نہیں بنتا۔ ہاں اپنی چال ضرور بھول جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو غریبی، مفلسی اور ناداری کے باوجود اسراف اور فضول خرچی پر مصر نظر آتے ہیں۔ اور یہ پچھلے تین چار ہفتوں میں اِن احمقوں نے اِس تحریک کی سب سے زیادہ مخالفت کی ہے۔ آپ کو یہ سُن کر شاید حیرت ہو، کہ قناعت، سادگی اور بے جا رسوم و قیود سے اجتناب کی اپیل پر لبیک کہنے والوں میں غریبوں کے مقابلے میں امیروں کی تعداد زیادہ تھی۔ اور اکثر ہمیں غریب بیٹی کے غریب باپ کی طرف سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اِس مزاحمت کا واحد نفسیاتی سبب یہ ہے کہ غریب کا احساسِ کمتری اُسے اپنی زنجیریں توڑنے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ بعض مقامات پر کچھ مولوی نما بزرگوں نے بھی اِس تحریک کی راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش کی۔ یہ لوگ نوجوانوں کی توجہ فروعی مسائل کی طرف مبذول کرنے کی غرض سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ ان کے خیال میں شادی بیاہ پر اسراف اور فضول خرچی کی بدعات کو ختم کرنے سے پہلے چوری، بے ایمانی، شراب خوری اور جوئے بازی کو ختم کرنا ضروری ہے۔ اور اس لئے وہ شادی بیاہ کے مواقع پر اسراف کو اوّلین اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ان مولوی صاحبان کو یک لخت یہ یاد آگیا ہے کہ سماج میں اسراف اور لین دین کے علاوہ بھی بہت سی بدعتیں ہیں۔ جنہیں ختم کیا جانا

چاہیئے۔ ان لوگوں سے ہماری گذارش یہ ہے کہ ہم ان تمام سماجی بدعتوں کا خاتمہ چاہتے ہیں کہ جن کی وجہ سے ہماری زندگی جہنّم بن گئی ہے، لیکن کہیں سے تو اس کام کو شروع ہونے دیجئے۔ بعض معترضین کے خیال میں " وازہ وان " ہماری قومی روایات ہی نہیں، بلکہ میراث کا ایک حصّہ ہے۔ اور اسے ختم کر دینا تہذیب کشی کے مترادف ہے۔ یہ خالص سرمایہ دارانہ استدلال ہے۔ اور اس کا مقصد صرف جاگیر دارانہ اداروں کو زمانے کی دستبرد سے بچانا ہے۔ ہم " وازہ وان " کے خلاف نہیں ہیں۔ لیکن شادی بیاہ کی تقریب پر اس تکلف کو قابلِ اعتراض تصوّر کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کی تیاری میں امیر کی دولت اور غریب کا لہو صرف ہوتا ہے۔ اور جس ضیافت سے غریب، مفلوک الحال اور مجبور کے خون کی بو آتی ہے۔ وہ کسی قانون کی رُو سے جائز قرار نہیں دی جاسکتی۔ سماجی اصلاح کی اس تحریک میں قوم کی حالت بدلنے کے زبردست امکانات موجود ہیں، لیکن اس کی بے پناہ کامیابی سے کچھ لوگ خائف اور کچھ پریشان نظر آرہے ہیں، اور اسی لئے اس تحریک کو تفرقے اور افراتفری کا شکار بنانے کی سازشیں شروع ہوگئی ہیں۔ کئی ناموں سے کئی انجمنیں وجود میں آگئی ہیں۔ اور ہر انجمن اصلاح کے لئے الگ الگ نسخہ تجویز کر رہی ہے۔ ابھی سے طریقِ کار اور طرزِ فکر میں اختلاف کی ہلکی ہلکی لہریں اُبھرنے لگی ہیں۔ اور اگر نوجوانوں نے باہمی رقابت اور تنگ نظری کی سطح سے بلند ہوکر اس پاکیزہ مقصد کو سامنے نہ رکھا کہ جس کی خاطر وہ سرگرم عمل ہوئے ہیں، تو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ قوم بڑی بدقسمت ہے۔ اور اس کے نجات کی کوئی صورت ممکن نہیں!

(۲۳ر اگست ۱۹۷۰ء)

یہ بیگار بند کیجئے

بہت سے لوگوں کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ بیسویں صدی کی اِس آخری چوتھائی میں بھی، کشمیر میں بیگار کا رواج قائم ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس رواج کو سرکاری سرپرستی حاصل ہے۔ آزادی کے بیس بائیس برسوں میں اِس غیر انسانی اور غیر مہذب رواج کو تقویت ہی نہیں، بے پناہ وسعت بھی ملی ہے۔ اور ہر سال ہزاروں گھوڑے، مرکبان، قلی اور ڈانڈی والے حکم حاکم کی تعمیل میں مرگِ مفاجات کا شکار بنا دئے جاتے ہیں۔ اِس سال اگست میں امرناتھ جی یاترا کے دوران ۱۸ یاتریوں کی موت نے دنیا کو پہلی بار اِس خطرناک اور پُرپیچ راستے کی صعوبتوں اور دشوار گذاریوں کا احساس دلایا، لیکن یاتریوں کی موت کے سانحے نے اصل انسانی مسئلے کو اُبھرنے نہیں دیا اور عام طور پر حکومت کو صرف اس لئے تنقید اور نکتہ چینی کا ہدف بنایا گیا کہ اس نے یاتریوں کی سہولت کے لئے معقول اور مناسب انتظامات نہیں کئے تھے۔ قطع نظر اس کے کہ حکومت پر غفلت شعاری، بدانتظامی اور نا مکتفی انتظامات کی شکایت غلط ہے یا صحیح، میں ان ہزاروں مزدوروں، گھوڑے والوں اور ڈانڈی والوں کی بات کرنا چاہتا ہوں کہ جو ہر سال سرکاری بیگار کے ظلم کا شکار بنائے جاتے ہیں اور جنہیں ایک حقیر سے معاوضے کے بدلے میں اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔ ہر سال سرکاری سطح پر وادی کے کونے کونے سے سواری اور بار برداری کے گھوڑے حاصل کرنے کے لئے محکمہ مال کے افسروں کو غیر معمولی اختیارات دئے جاتے ہیں۔ اور "عوامی حکومت" کے

تحصیل دار شوپیان، کلگام، گاندربل، ٹنگمرگ اور وادی کے دوسرے حصوں میں اندھا دھند گھوڑے اور گھوڑے والوں کی گرفتاری کا حکم جاری کرتے ہیں اور صرف چند دنوں کے اندر اندر مجبور، بے بس اور مظلوم گھوڑے والے ہزاروں کی کی تعداد میں پہلگام پہنچ جاتے ہیں۔ ان میں سے ۹۹ % نہیں سو فیصدی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس خطرناک سفر اور خوفناک منزل پر جانے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے، لیکن تحصیلداروں کے عتاب اور قہر سے بچنے کی چونکہ کوئی اور صورت نہیں ہوتی، اسلئے چاروناچار ہر علاقے کے مرکبان اس بیگار پر روانہ ہو جاتے ہیں اور جو لوگ جائز وجوہات کی بنا پر اس زور زبردستی کے خلاف احتجاج کرتے ہیں، یا جسمانی مجبوریوں کے سبب اس سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے سے معذوری ظاہر کرتے ہیں، انہیں گرفتاری کے خوف اور پولیس کی دہشت سے اس گناہِ بے لذت پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ اور بالکل یہی حال، قلیوں، مزدوروں اور ڈانڈی والوں کا بھی ہوتا ہے۔ انہیں بھی تقریباً گرفتاری کی حالت میں پہلگام پہنچا کر یاتریوں کی خدمت پر مامور کیا جاتا ہے۔ اس معاملے کا سب سے المناک اور افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس دشوار گذار پہاڑی سفر کے لئے کہ جس میں کئی دن صرف ہوتے ہیں، گھوڑے والوں اور مزدوروں کو اتنا حقیر معاوضہ ادا کیا جاتا ہے کہ وہ گھوڑے کی خوراک کے لئے بھی ناکافی ہوتا ہے۔ ایک گھوڑے والے کو پورے سات دن کے لئے کُل ملا کر بیاسی روپئے دئے جاتے ہیں۔ اور یہ اُجرت چونکہ سرکاری طور پر مقرر ہے۔ اس لئے اس میں کسی اضافے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک گھوڑے کے ساتھ چونکہ ایک مرکبان کا ہونا ضروری ہے، اس لئے یہ بیاسی روپے گھوڑے اور مرکبان دونوں کی مشترکہ اُجرت ہوتی ہے۔ چندن واری سے شیش ناگ، پسو گھاٹ، مہاگنس اور آخر میں مقدس گپھا تک پہنچنے میں کتنے نازک مقامات سے گذرنا پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ کچھ انہی لوگوں کو ہو سکتا ہے کہ جو ایک بار اس راستے سے گذرے ہوں۔ شیش ناگ تک پہنچتے پہنچتے انسانوں کا ہی نہیں گھوڑوں کا بھی دم چھوٹنے لگتا ہے۔ اور پھر راستہ

اتنا تنگ اور پتھریلا ، کہ ذرا لغزش ہوئی اور موت نے زندگی کا دامن تھام لیا۔ ہر سال درجنوں گھوڑے اِن ہی بلندیوں سے پھسل کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ شیش ناگ اور پسو گھاٹ کے درمیان ۱۸ یاتریوں کی موت اس بات کی واضح شہادت ہے کہ ان خطرناک بلندیوں پر موسم کی کیا کیفیت ہوتی ہو گی۔ ان تمام مشکلات کا اندازہ کیجئے اور پھر سوچئے کہ سات دن کے لئے گھوڑے اور مرکبان کے لئے بیاسی روپے کی رقم بیگار نہیں تو اور کیا ، اور پھر جب کسی مرکبان کی ساری زندگی کا سرمایہ اس کا گھوڑا۔ سفر کی صعوبتوں تاب نہ لا کر دم توڑ دیتا ہے تو اُسے بڑی تگ ودو کے بعد پانچسو روپے کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ یہی حال سامان اُٹھانے والے مزدوروں اور ڈانڈی بردار قلیوں کا ہے۔ اس خوفناک چڑھائی کو عبور کر کے مقدّس گپھا تک پہنچانے اور واپس پہلگام سے آنے کے لئے ڈانڈی کے آٹھ مزدوروں کو کل چار سو روپے یعنی ۵۰ روپے فی کس کی مزدوری ملتی ہے۔ اندازہ کیجئے کہ جس راستے پر چلتے ہوئے خالی ہاتھ چلنے والے انسان کا دم بھی پھول جاتا ہے۔ اسی راستے پر ڈیڑھ دو من وزن لے جانے والے مزدور اور قلی کی حالت کیا ہوتی ہو گی۔ لیکن چونکہ معاوضے کی یہ رقم سرکاری طور پر منظور شدہ ہے اس لئے اس میں اضافے کی کوئی گنجائش نہیں۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ریاستی حکومت نے گھوڑوں ، قلیوں اور ڈانڈی والوں کے لئے اس بیگار کو آج تک کیوں اور کس طرح جائز قرار دیا ہے ؟ امرناتھ کی یاترا کے لئے ہر سال ہزاروں یاتری یہاں آتے ہیں۔ حکومت کا فرض یہ ضرور ہے کہ وہ ان یاتریوں کو ہر ممکن سہولت بہم پہنچانے کے لئے وہ تمام انتظامات کرے جو اس کے حدِ اختیار اور حدِ امکان میں ہیں۔ لیکن سرکاری مشینری کا استعمال کر کے گھوڑوں کی فراہمی اور قلیوں کی بہم رسانی یقیناً ریاستی حکومت کے فرائض میں شامل نہیں ہونا چاہیئے۔ مان لیجئے کہ یاتریوں کو سیّاحوں کا درجہ دے کر حکومت ان کے لئے گھوڑوں کی فراہمی میں ان کا ہاتھ بٹانا چاہتی ہے۔ تو اس سلسلے میں زور زبردستی سے کام لینے کی بجائے مزدوری کی ایسی شرحیں مقرر کیوں نہیں کی گئی ہیں کہ جو گھوڑے والوں ، مزدوروں اور قلیوں

سبھی کے لئے قابلِ قبول ہوں۔ مقدّس گپھا میں 'لنگم' کے درشن کے لئے آئے ہوئے ہزاروں یاتری مذہبی عقیدت اور روحانی جذبے سے سرشار ہوتے ہیں اور انہیں اِس سفر کی اذیتوں میں بھی ایک روحانی لذّت کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن مرکبان، قلی اور ڈانڈی والے تو محض چار پیسے کمانے کے لئے یہ مصیبت مول لیتے ہیں، پھر ان کو مناسب اور معقول اُجرت سے کیوں محروم رکھا جائے؟ میں نے اسمبلی کے حالیہ اجلاس میں حکومت پر یہ بات واضح کر دی ہے کہ وادی کے مرکبان، قلی اور مزدور اگلے سال سے بیگار کے اِس ظلم کے خلاف بغاوت کریں گے۔ اور وہ کسی قیمت پر بھی سرکار کی طرف سے مقرر کئے گئے توہین آمیز "معاوضے" پر اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنے کے لئے تیار نہ ہونگے اور اگر حکومت یاتریوں کو کم سے کم خرچ پر یاترا کرنے کی سہولیات بہم پہنچانا چاہتی ہے تو وہ یہ سہولت مرکبانوں اور مزدوروں کی قیمت پر بہم نہیں پہنچا سکتی۔ اسے اپنے خزانوں کے دروازے کھول کر یہ ثواب کمانا ہوگا! مجھے امید ہے کہ ریاستی حکومت میری اِس وارننگ پر سنجیدگی سے غور کر کے ابھی سے ایسے اقدامات کرے گی کہ جس سے آئندہ سال کسی قسم کی ناگواری اور تلخی پیدا ہونے کا امکان باقی نہ رہے!

(۷، اکتوبر ۱۹۷۰ء)

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

چراغ بیگ کے دشمنوں کی طرح اس کے دوستوں کی فہرست بھی طویل ہے اور اس فہرست میں وکیل، سیاستداں، صحافی، وزیر، امیر، فقیر، نجار اور گلکار سبھی شامل ہیں۔ چراغ بیگ چونکہ دوستی میں طبقاتی امتیاز کا قائل نہیں، اس لئے اس کی نگاہوں میں نجار اور گلکار دونوں کو برابر کا درجہ حاصل ہے۔ یہ الگ سوال ہے کہ اس کے بہت سے دوست، دوستی اور تجارت میں فرق نہیں کر سکتے۔ سات سال تک اپنے دشمنوں کے بارے میں لکھنے کے بعد آج چراغ بیگ آپ کو اپنے ایک دوست کے متعلق کچھ بتانا چاہتا ہے تاکہ آپ اُس کے تجربات سے سبق سیکھیں۔

شورہ فرنشنگ کمپنی کے مالک میرے بہت ہی عزیز دوست ہیں اور میری اُن کی دوستی کم از کم چھ سات سال پُرانی ہے۔ شورہ صاحب نہایت ہی شریف، مخلص اور باذوق آدمی ہیں۔ انہیں فرنیچر کے علاوہ ادب، صحافت اور سیاست سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ انہیں پُرانی موٹریں اور جیپیں خریدنے کا بھی شوق ہے۔ اور ان کے ورکشاپ میں سو برس پُرانی گاڑیوں کے ڈھانچے بھی نظر آتے ہیں۔ موصوف "آئینہ" کا بڑی باقاعدگی سے مطالعہ کرتے ہیں۔ اور چراغ بیگ کے بڑے مدّاح ہیں۔ اردو اخبارات اور رسائل کے علاوہ انگریزی اخبارات بھی پڑھتے ہیں۔ چہرے بشرے اور گفتگو سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بی۔ اے تک تعلیم پائی ہوگی۔ بی۔ اے پاس ہیں یا فیل، میرے لئے کچھ کہنا مشکل ہے اور یہ ایک ایسا نازک سوال ہے کہ ان سے پوچھا

بھی نہیں جاسکتا۔

شورہ صاحب سے میری دوستی کا "قافلہ" خراماں خراماں آگے بڑھ رہا تھا، کہ ایک دن میں نے ایک زبردست حماقت کی۔ میں نے بزرگوں کی واضح ہدایات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے دوستی اور تجارت کو خلط ملط کر دیا۔ یہ ۲۲ر جولائی ۱۹۷۰ء کا واقعہ ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ آپ میری اس "حماقت" کی تفصیل سُن کر میرے بارے میں فیصلہ صادر کریں کہ مجھے کیا سزا ملنی چاہیئے۔

۲۲ر جولائی کو میں نے شورہ صاحب سے دو عدد مسہریاں خریدلیں۔ شورہ صاحب نے ازراہ عنایت ان کی قیمت صرف تین سو روپیہ مقرر کر دی۔ حالانکہ بازار میں یہی مسہریاں کم قیمت پر بھی مل سکتی تھیں۔ لیکن دوستی میں چونکہ مول تول کی زیادہ گنجائش نہیں ہوتی۔ اس لئے میں نے بخوشی تین سو روپے ادا کئے۔ ۲۴ر جولائی کو ان دونوں مسہریوں کے انجر پنجر ڈھیلے پڑ گئے اور ۲۶ر جولائی کو مسہریوں کے مختلف اعضاء نے اپنے حق خود ارادیت کا استعمال کر کے اپنی علیحدگی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ میری بیوی اس صورت حال سے گھبرا کر مجھے کوسنے لگیں، کہ میں نے سو روپے کی چیز تین سو روپے میں خریدی ہے۔ لیکن مجھے چونکہ شورہ صاحب کی دوستی پر اعتماد تھا۔ اس لئے میں نے بڑی خندہ پیشانی سے بیوی کی لعنت ملامت کو برداشت کر کے شورہ صاحب کو صورت حال سے مطلع کر دیا۔ ۲۶ر جولائی سے ۱۵ر اگست تک میں برابر بیوی کی جھاڑ سُنتا رہا اور ہر روز شورہ صاحب کو اس "تشویشناک" صورت حال سے مطلع کرتا رہا۔ ٹھیک بیس دن بعد شورہ صاحب نے اپنے ورکشاپ کے ایک ماہر کو میرے ہاں بھیج کر مسہری کی "مرمت" کا کام ہاتھ میں لیا۔ بدورانِ مرمت یہ انکشاف بھی ہو گیا کہ ان مسہریوں میں بوسیدہ اور گھٹیا لکڑی استعمال ہوئی ہے۔ اور اس کے لئے مجھے اپنی بیوی کے سامنے ایک بار پھر خفیف ہونا پڑا۔ لیکن میں نے دوستی کے نام پر یہ سب کچھ سہہ لیا۔ اور اپنی وکالت کا سارا زور صرف کر کے اپنی بیوی کو یہ اطمینان دلایا کہ کشمیر سے لیکر راس کماری تک اتنی عمدہ، مضبوط، خوبصورت اور سستی مسہریاں

نہیں مل سکتیں۔ لیکن میری بد قسمتی سے صرف دو دن بعد یعنی ۱۷ اگست کو ان مسہریوں نے پھر حق خود ارادیت کا مطالبہ دُہرانا شروع کر دیا۔ اور ۲۰ اگست کو میری انتہائی کوششوں کے باوجود مسہریوں کے وہ اعضاء جنہیں شورہ صاحب کے بھیجے ہوئے "ماہر" نے بڑی مہارت کے ساتھ جوڑ دیا تھا۔ ایک بار پھر الگ الگ ہو گئے۔ دوسرے روز میں نے علی الصبح سورہ صاحب کو اس حادثے کی اطلاع کر دی۔ اور انہوں نے مجھے اطمینان دلایا کہ وہ سب ٹھیک کر دیں گے۔ انہوں نے دبی زبان سے اپنی شرمندگی اور ندامت کا بھی اظہار کر دیا۔ ۲۰ اگست سے لے کر ۲۰ اکتوبر تک میں تقریباً ہر روز شورہ صاحب کو ٹیلیفون پر یہ یاد دلاتا رہا کہ ان کے مرمت کئے ہوئے دو پلنگ شکستہ حالت میں مرمت کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور شورہ صاحب نے مجھ سے یہ وعدہ کیا کہ میں ابھی اپنے آدمی کو بھیج کر انہیں ٹھیک کرا دوں گا۔ لیکن دو ماہ کے دوران کئے گئے ان دو سو وعدوں میں سے ایک بار بھی انہوں نے وعدہ پورا نہ کیا۔ اور بالآخر میں نے بہ نفسِ نفیس ان کے دربار میں حاضر ہو کر فریاد کی کہ حضور! میں نے کون سی خطا کی ہے کہ جس کی مجھے سزا دی جا رہی ہے۔ شورہ صاحب نے اپنی مصروفیتوں، معذوریوں، دشواریوں اور لاچاریوں کی ایک طویل داستان سُنا کر مجھ سے معذرت چاہی۔ اور وعدہ کیا کہ کل شام ان کا آدمی ہر قیمت پر آ کر مسہریوں کو ایک بار پھر جوڑ دے گا۔ یہ شام بھی گذر گئی مگر کوئی نہ آیا۔ پھر ایک اور شام گذر گئی لیکن شورہ صاحب کا آدمی نہ آیا۔ اور میں فیض صاحب کا یہ شعر گنگنانے لگا ؎

اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا!

بدقسمتی سے ایک رات میری چھوٹی بچی اس ٹوٹے ہوئے پلنگ سے گر کر بُری طرح زخمی ہو گئی اور مجھے شورہ صاحب سے زیادہ اپنی حماقت پر غصّہ آنے لگا۔ میں نے دوسرے دن غصّے میں آ کر شورہ صاحب کو ٹیلی فون کیا اور کہا کہ "مجھے میری حماقت کی کافی سزا مل گئی۔ آپ آ کر اپنی مسہریاں واپس لے لیجئے۔" آپ کو یہ سُن کر حیرت ہو گی کہ شورہ صاحب نے ندامت یا معذرت کا اظہار کرنے کی بجائے بڑے تلخ لہجے میں جواب دیا کہ "جائیے آپ کو

جو کچھ کرنا ہے کر لیجیے، میں پروا نہیں کرتا۔" اور شورہ صاحب پروا بھی کیوں کرتے انہوں نے مسہری کی قیمت وصول کر لی تھی اور اپنی "چیز" کی معقول قیمت وصول کرنے کے بعد انہیں اس سے کیا دلچسپی تھی کہ خریدنے والے پر کیا گذری ہے۔

اس کہانی کو بیان کرنے کا صرف ایک مقصد ہے اور وہ یہ کہ اس کو پڑھنے والے آئندہ کبھی کسی دوست سے کوئی چیز نہ خریدیں۔ بازار میں کوئی چیز مہنگی بھی ملے تو خرید لیجیے۔ لیکن مروّت میں آکر دوست کی دُکان سے کوئی سستی چیز بھی نہ خریدیئے۔ ورنہ میری طرح پچھتانا پڑے گا۔ دوسروں سے آپ شکایت کر سکتے ہیں، لڑ سکتے ہیں، جھگڑ سکتے ہیں۔ لیکن دوستوں کو آپ کیا کہیں گے۔ وہ تو آپ کی شکایت کا بھی بُرا مانیں گے اور اسطرح برسوں کی دوستی خطرے میں پڑ جائے گی۔ میں نے دو مسہریوں کے عوض میں شورہ صاحب سے اپنی سات سالہ پُرانی دوستی اور نقد تین سو روپے برباد کئے مجھے اس کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔

لیکن اس مسئلے کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ اکثر کشمیری تاجر اور دکاندار تجارت کے بنیادی اُصولوں کا بھی احترام نہیں کرتے، ان کا اصول یہ ہے کہ کسی طرح "خریدار" کو پھانس کر "مال" بیچو اور نفع کماؤ۔ اور اس بات کی فکر نہ کرو کہ خریدار کی تسلّی ہوتی ہے یا نہیں۔ بعض تاجروں کے اس رویّے سے کشمیر کی تجارت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے اور بیرونی سیّاح کشمیری دکانداروں اور تاجروں کو "ٹھگ" کے نام سے یاد کرنے لگے ہیں۔ اس طرح چند خود غرض اور بددیانت تاجروں کی ہوس نے پورے کشمیر کو بدنام کر دیا ہے۔ شورہ صاحب نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ تو بہرحال دوستی کے نام پر معاف کیا جا سکتا ہے، لیکن میں شورہ صاحب اور ان کے ہم پیشہ دوسرے دوستوں سے گذارش کروں گا کہ وہ تجارت کا ایک معیار قائم کریں اور صرف منافع کمانے کو ہی کامیاب تجارت کا پیمانہ نہ سمجھیں۔ تاجروں اور جیب کتروں میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔

(۲۰ر اکتوبر ۱۹۷۰ء)

باضمیر مگر بے وقوف

کشمیر یونیورسٹی کے کچھ باضمیر اور بے وقوف اُستادوں نے امتحانی مراکز میں وسیع پیمانے پر "نقل" کی وبا کے خلاف سخت احتجاج کیا ہے۔ ان کا دعوی ہے کہ اکثر امتحانی مرکزوں پر طالب علم کُھلم کُھلا کتابوں کی مدد سے امتحانی پرچے حل کرتے ہیں، اور نگراں عملہ خوف یا مصلحت کی بنا پر خاموش رہتا ہے۔ انہیں شکایت ہے کہ جب کوئی باضمیر یا بے وقوف استاد اِس بدعت کو روکنے کی کوشش کرتا ہے، تو اسے تھپڑ مار کر خاموش کر دیا جاتا ہے۔ انہیں شکوہ ہے کہ یونیورسٹی کے اربابِ اختیار اور بعض بزرگ اُستاد صورتِ حال کو بہتر بنانے کی بجائے بالواسطہ اور بلاواسطہ اسکو تقویت پہنچا رہے ہیں، انہیں اس بات کا افسوس ہے کہ طالب علموں کی اس بے راہ روی سے تعلیمی معیار پست ہوگیا ہے اور امتحان کا موجودہ طریقِ کار بالکل بے معنی اور بے مقصد ہو کر رہ گیا ہے۔ ان کے خیال میں 'نقل' کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی نے سارے تعلیمی ڈھانچے کو ایک خطرناک بحران سے دوچار کر دیا ہے، اور اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے انہوں نے تب تک امتحانات کی نگرانی سے انکار کر دیا ہے کہ جب تک امتحانی مراکز میں صحت مند اور پُر امن ماحول پیدا نہ کیا جائے۔ جہاں تک اساتذہ کرام کے الزامات اور ان کی شکایات کا تعلق ہے۔ چراغ بیگ نے اس بات کی تصدیق کر لی ہے کہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں۔ امتحانی مراکز میں نقل کی کوششیں اِس وقت سے جاری ہیں کہ جب سے امتحان کا موجودہ طریقِ کار رائج ہوا ہے۔ چراغ بیگ کے ایام

طالب علمی میں بھی کچھ نالائق اور ناقابل طالب علم 'نقل' کی سیڑھی سے علم کی بلندیوں تک پہونچنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن عام طور پر 'نقل' کو ایک سنگین جرم تصور کیا جاتا رہا ہے اور اکثر اوقات مجرم کو سخت سے سخت سزا دی جاتی تھی۔ نقل کرنے والے طالب علم اگر نقل کی کوشش کرتا ہوا پکڑا جاتا، تو وہ سب کی نظروں میں ذلیل ہونے کے علاوہ خود اپنی نگاہوں میں گر جاتا، اور پھر سخت سزا کا خوف طالب علموں کو عام طور پر اس جُرم کے ارتکاب سے باز رکھتا، چراغ بیگ کو اچھی طرح یاد ہے کہ ایکبار اس نے بھی فزیکس کے پرچے میں نقل کا ارادہ، صرف ارادہ کیا تھا۔ اور اُس کی جان عذاب میں مبتلا ہو گئی تھی۔ امتحان ہال میں داخل ہوتے ہی وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اور اسے یوں محسوس ہوا کہ ساری دنیا کی نگاہیں اس پر مرکوز ہیں۔ اندرونی جیب میں کاغذ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اُسے ایک ایٹم بم معلوم ہونے لگا۔ اور جب تک اس نے اسے ضائع نہیں کیا، اسے سکون حاصل نہیں ہوا۔ لیکن یہ سب اگلے وقتوں کی باتیں ہیں۔ اور اب خواب معلوم ہوتی ہیں۔ پچھلے چار پانچ سال میں فضا بدل گئی ہے۔ اب نقل جُرم نہیں، رواج بن گیا ہے، امتحان کا ایک جزوِ لاینفک اب اس کے بغیر امتحان کا تصوّر ہی نہیں ہوسکتا۔ چند سال قبل تمام امتحانی مراکز میں میٹرک اور ہائر سیکنڈری کے طالب علموں کو کُھلّم کُھلّا نقل کی اجازت دی گئی اور بعض مقامات پر نگراں عملے نے ان کی مدد بھی کی، یہ نسل جب کالج میں پہونچ گئی تو اس نے نقل کو اپنا بنیادی حق سمجھ کر اس حق کو باضابطہ طور پر منوانے کی جدوجہد کی۔ اربابِ اختیار نے اِس صورتِ حال کو روکنے کی بجائے اِس کو ہوا دی، کیونکہ اِس حق سے عام طالب علم ہی نہیں ان کے اپنے لاڈلے بھی مستفید ہو رہے تھے، بلکہ حق یہ ہے کہ ان ہی لاڈلوں نے اِس بدعت کو جنم بھی دیا۔ اب یہی لوگ یونیورسٹی کی سطح پر آکر اپنے " بنیادی حق " کا استعمال کرنے لگے ہیں، اور جب کبھی کوئی بے ضمیر اور بے وقوف اُستاد اُن کی راہ میں حائل ہو جاتا ہے تو وہ طاقت کا استعمال کر کے اِسے مرعوب اور مغلوب کرتے ہیں۔

چراغ بیگ نے نقل کی بدعت کے خلاف احتجاج کرنے والے اساتذہ کو باضمیر تو کہا ہے، لیکن ساتھ ہی بے وقوف بھی قرار دیا ہے، آپ پوچھیں گے بے راہ روی

اور بے ایمانی کے خلاف احتجاج کرنا کیا بے وقوفی ہے ؟ میں اس سوال کا براہِ راست جواب نہیں دونگا۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اس دور میں باضمیر ہونا تقریباً بے وقوف ہونے کے مترادف ہے اور اسی لئے بہت سے ذی فہم اور عاقبت اندیش لوگوں نے اپنے ضمیر کو خواب آور گولیاں کھلا کھلا کر گہری نیند سُلا دیا ہے۔

جن اساتذہ کرام کو امتحانی مراکز میں وسیع پیمانے پر نقل کی بدعت سے تشویش لاحق ہو رہی ہے۔ کیا انہوں نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا کی ہے کہ گذشتہ چھ سات سالوں میں اس ذلت کو عزت کا درجہ کیوں حاصل ہو گیا ہے ؟ کیا اُنہوں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ طالب علموں میں غنڈہ گردی، بے راہ روی اور بد اخلاقی کے رجحانات کو کیوں تقویت مل رہی ہے ؟ کیا انہوں نے کبھی سنجیدگی سے اس بات پر غور کیا ہے کہ ہماری درس گاہیں اور ہماری یونیورسٹیاں، ہمارا کردار بلند کرنے کی بجائے ہمارے اخلاقی زوال کی باعث کیوں بن رہی ہیں ؟ اُنہوں نے ان سوالات پر غور کیا ہوتا تو وہ امتحانات میں 'نقل' کی بڑھتی ہوئی بدعت کی بجائے اس معاشرے کے خلاف احتجاج کرتے، کہ جس نے ان بے راہ رویوں کو جنم اور جواز بخشا ہے۔

کیا ہماری یونیورسٹی کے معزز اساتذہ کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ گذشتہ بیس بائیس سال کے دوران اس ریاست میں قانون، شرافت، اخلاق، انسانیت اور تہذیب کی ہر قدر پامال کی گئی ہے ؟ کیا وہ اس بات سے واقف نہیں ہیں کہ ہمارے سیاستدان اقتدار اور اختیار حاصل کرنے کے لئے ناجائز حربہ استعمال کرنے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں کرتے ؟ کیا وہ نہیں جانتے کہ اقتدار کے مسندوں پر بیٹھے ہوئے یہ "شریف" اور "معزز" لوگ انصاف اور اخلاق کے ہر تقاضے کو پاؤں تلے روند کر آگے بڑھتے ہیں۔ کیا ان معصوم پروفیسروں کو یہ معلوم نہیں کہ اس ریاست میں ہر پانچ سال بعد انتخابات کے نام پر کونسا سوانگ رچایا جاتا ہے ؟ کیا انہیں اس بات کا اندازہ نہیں کہ اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھے ہوئے اخلاقی مجرم، ہمارے نوجوانوں کی اخلاقیات اور ان کی نفسیات کو کس طرح متاثر کرتے ہیں ؟ کیا وہ اس حقیقت سے آشنا نہیں ہیں کہ ہماری درس گاہوں کے معزز استادوں کو انتخابات میں بے ایمانیوں اور

بدعنوانیاں کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا رہا ہے؟ کیا انہیں اس بات کا احساس نہیں ہے کہ ہماری زندگی کے ہر شعبے میں رشوت ستانی، کنبہ پروری، اقربا نوازی اور ناانصافی کا دور دورہ ہے؟ کیا انہیں علم نہیں کہ بے ایمانی، جھوٹ اور دغابازی کو اس ریاست میں سرکاری سرپرستی حاصل ہے؟ کیا وہ اس بات سے انکار کرسکیں گے کہ اساتذہ کے انتخاب، ان کی تبدیلی اور تقرری میں قابلیت اور موزونیت کی بجائے ان کے اثر ورسوخ اور رشتہ داری کا دخل ہوتا ہے؟ کیا یہ امر واقعہ نہیں کہ کشمیر یونیورسٹی میں ایسے بھی اساتذہ منتخب ہوتے ہیں کہ جنہیں ہندوستان کی کوئی یونیورسٹی تو کیا کوئی کالج بھی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا؟ اگر ہمارے باضمیر استادوں کو ان تمام باتوں کا علم ہے تو پھر وہ نقل کا سہارا لے کر آگے بڑھنے کی کوشش کرنے والے طالب علموں سے ناراض کیوں ہیں؟ آخر یہ طالب علم بھی تو اسی سماج کا ایک حصّہ ہیں۔ یہ کیوں کر اس اخلاقی زوال اور سماجی بحران سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکتے ہیں؟ انہیں اس بات کا احساس اور اندازہ ہو گیا ہے کہ اس دنیا میں آگے بڑھنے اور اُوپر جانے کے لئے چوری چکاری، بے ایمانی اور خودغرضی، جھوٹ اور فریب، سب کچھ جائز ہے۔ اگر ایک کفن چور سرکار کی اعانت سے انتخاب میں بے ایمانی اور دھاندلی کے بعد وزیر ہوسکتا ہے تو ایک طالب علم امتحان ہال میں نقل کرکے بی، اے اور ایم، اے کیوں نہیں ہوسکتا؟ اگر ایک نالائق اور نکمّا کلرک رشوت اور خوشامد کے راستے اعلیٰ سے اعلیٰ منصب تک پہنچ سکتا ہے تو ایک طالب علم امتحان پاس کرنے کے لئے ہر جائز طریقہ استعمال کرنے میں کیوں کوئی جھجھک محسوس کرے؟ جب چاروں طرف بے ایمانی اور بداخلاقی کا دور دورہ ہو تو پھر غریب طالب علم ایمانداری کی سولی پر چڑھ کر خودکشی کا اقدام کیوں کرے؟ انہی حقائق کی روشنی میں، میں نے طالب علموں کو نقل کا حق نہ دینے والے اُستادوں کو بے وقوف کہا ہے اور مجھے اُمید ہے کہ اس تشریح کے بعد وہ میری خطا معاف کریں گے!

چراغ بیگ کی نگاہوں میں ان استادوں کی عزّت اور وقار اس دن بحال ہوگا کہ جب وہ سماج میں ہونے والی ہر دھاندلی اور بدعنوانی کے خلاف احتجاج کرکے نئی نسل کے سوئے ہوئے ضمیر کو بیدار کرنے کا عزم کریں۔ جب وہ انتخابات میں بے ایمانی اور دھاندلیوں کے خلاف رائے عامہ کو منظم کرنے میں مدد دیں تاکہ اخلاق اور انصاف کی قدریں مستحکم ہوں، جب وہ خود بے ایمانی، خودغرضی اور تنگ نظری کی پستیوں سے بلند ہوکر طالب علموں کے سامنے ایسی مثال پیش کرسکیں کہ جو قابلِ رشک بھی ہو اور قابلِ تقلید بھی۔ جب تک یہ نہ ہو طالب علموں کو دُنیا کی کوئی طاقت نقل کرنے سے نہیں روک سکتی۔

(۲۳ مئی ۷۲ء)

چمبل کی گھاٹی اور کشمیر کی وادی

مدھیہ پردیش کی چمبل گھاٹی میں پچھلے ماہ ایک ایسا ڈرامہ اسٹیج ہوا کہ جسے دیکھ کر ساری دنیا دنگ رہ گئی، دُنیا بھر کے اخباری نمائندے اور فوٹو گرافر اس تاریخی ڈرامے کا مشاہدہ کرنے کے لئے مدھیہ پردیش کے اُن دور دراز اور گمنام دیہات میں پہنچ گئے کہ جہاں اس ڈرامے کے سبھی کردار جمع تھے۔ مشہور سرودیہ لیڈر جے پرکاش نرائن اس بے مثال اور ناقابلِ یقین ڈرامے کے ہیرو اور چمبل گھاٹی کے بڑے بڑے ڈاکو اس کے اہم کردار تھے۔ چیف منسٹر پی۔ سی۔ سیٹھی اور مدھیہ پردیش پولیس کے اعلیٰ افسر تماشائیوں کی صف میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر یوں دیکھ رہے تھے کہ جیسے یہ حقیقت نہ ہو، کسی الف لیلوی افسانے کا فلمی روپ ہو، چمبل گھاٹی کے وہ ڈاکو کہ جن کے نام سے قتل، لوٹ مار اور غارت گری کی سینکڑوں داستانیں وابستہ ہیں اور جن کے نام سے عام لوگ ہی نہیں، پولیس کے بڑے بڑے کپتان بھی لرز جاتے تھے، جے پرکاش نرائن کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنے آپ کو پولیس کی حراست میں دے رہے تھے۔ وہ جن کے سروں کی ایک ایک لاکھ قیمت مقرر کی گئی تھی جے پرکاش جی کے قدموں میں اپنا سر جھکانے کے لئے آئے تھے وہ جن پر قابو پانے کے لئے بارہ سال سے ریاستی حکومت کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں، اپنے آپ کو بغیر کسی مزاحمت کے قانون کے سپرد کر رہے تھے۔ ایک دو نہیں سینکڑوں کی تعداد میں صوبے کے بدنام اور خوفناک ترین ڈاکو اپنے ہتھیار ڈال کر پولیس کی گاڑیوں میں سوار جیل خانوں کی طرف جا رہے تھے۔ انہیں اس بات کا علم تھا کہ ان پر مقدمے چلیں گے۔ انہیں سزا دی جائے گی۔ اور ان کی آزادی ہمیشہ

کے لئے ختم ہو جائیں گی۔ لیکن اس کے باوجود وہ سینکڑوں کی تعداد میں اپنے آپ کو پہلے جے پرکاش نرائن اور پھر پولیس کے حوالے کر رہے تھے۔ اس ناقابلِ یقین معجزے کا سہرا جے، پی کے سر رہے گا۔ کہ جس نے پیشہ ور قاتلوں اور لٹیروں کے وجود میں بھی ضمیر کا سراغ لگا کر انہیں اپنی زندگی کا سانچہ اور ڈھانچہ بدلنے پر آمادہ کیا۔ یہ جے، پی کا کمال ہے کہ اس نے اپنے خلوص اور اپنی نیک نیتی سے پتھر دل ڈاکوؤں کے سینے میں بھی قانون کی برتری اور انصاف کی فضیلت کا احساس بیدار کر دیا اور وہ کہ جن کے ہاتھ سینکڑوں بے گناہوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے انفعال اور ندامت کے آنسوؤں سے اپنے وجود کو پاک و صاف کرنے کے لئے اپنی مرضی سے قانون کے شکنجے میں آ گئے!

یہ جے، پی، کی عظمت، ان کی انسان دوستی اور ان کے خلوص کا ایک ایسا کارنامہ ہے کہ جسے رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔ لیکن مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ چمبل گھاٹ کے ڈاکوؤں پر اخلاقی فتح حاصل کرنے سے وہ کہیں اس فریب میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ اس ملک میں ڈاکوؤں کی صرف ایک ہی قسم ہے۔ اور ان سب کو اخلاق، اہنسا اور انسان دوستی سے راہِ راست پر لایا جا سکتا ہے۔

چراغ بیگ کے خیال میں چمبل گھاٹ کے ڈاکو اتنے خطرناک اور تکلیف دہ نہیں ہیں کہ جتنے وہ سیاسی اور سماجی رہزن کہ جن کا کاٹا پانی بھی نہیں مانگتا۔ چمبل کے ڈاکو کسی ایک کنبے یا قافلے پر ڈاکہ ڈال کر اس کی جائیداد لوٹ لیتے ہیں۔ لیکن سیاسی لیڈروں کے روپ میں پھرنے والے ڈاکو کنبے اور قافلے ہی نہیں، ساری قوم اور ملک پر شب خوں مارتے ہیں۔ مان سنگھ اور مادھو سنگھ تو قانون سے بچنے کے لئے جنگلوں کی خاک چھانتے ہیں۔ لیکن سیاسی لیڈر قانون اور انصاف کا سہارا لیکر قتل، لوٹ مار اور غارتگری کرتے ہیں۔ جب تک جے، پی، ان سیاسی لٹیروں اور رہزنوں کے ہتھیار نہیں چھینتے، ملک میں ڈاکہ زنی، لوٹ مار اور غارتگری کا سکّہ چلتا رہے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ جے، پی نے سب سے پہلے اپنی توجہ چمبل کی گھاٹیوں پر مرکوز کر دی۔ انہیں تو سب کام چھوڑ کر وادیٔ کشمیر کا رُخ کرنا چاہیئے تھا کہ جہاں پچھلے بیس بائیس برسوں سے ڈاکہ زنی، قتل اور لوٹ مار کو قانون، انصاف اور جمہوریت کا درجہ حاصل

ہے۔ جہاں ڈاکوؤں کے ایک مخصوص گروہ نے عوام کے حقوق چھین کر انہیں اتنا بے بس اور مجبور بنا دیا ہے کہ وہ اُف بھی نہیں کر سکتے۔ جہاں ہر انتخاب کے موقع پر سرکاری ڈاکو ووٹروں کے ہاتھ سے ووٹوں کی پرچیاں چھین کر اپنے من پسند نمائندوں کی کامیابی کا اعلان کرتے ہیں۔ جہاں جمہوریت اور شہری آزادیوں کے نام پر ایسی غنڈہ گردی اور لاقانونیت کا مظاہرہ ہوتا ہے کہ چمبل کی گھاٹیوں میں بھی نہ ہوتا ہوگا۔ اس وادیٔ گلپوش میں پچھلے بیس برسوں سے جمہوریت، انصاف اور شہری آزادیوں کا اس بے دردی سے قتل ہوا ہے کہ خدا کی پناہ! یہاں عوام کے حقوق کی دولت اس بے دردی سے لوٹی گئی ہے کہ الاماں۔ یہاں شریفوں کی عزت اور غریبوں کی دولت پر اتنی بار شب خون مارا گیا ہے کہ اب یہ بھی یاد نہیں کہ اس ریاست میں کبھی قانون کی برتری اور انصاف کی عملداری تھی بھی یا نہیں۔ چمبل کے ڈاکو تو رات کی تاریکیوں میں چھپ چھپ کر لوگوں کو لوٹتے ہیں۔ لیکن کشمیر کے ڈاکو دن دھاڑے، قانون اور انصاف کی چھاؤں میں، جمہوریت اور آزادی کے نام پر بے چارے عوام کو لوٹ لیتے ہیں۔ اور اکثر نہیں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ لوٹنے والا ہی قانون کی زد میں آکر اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت لیتا ہے۔

چمبل کی گھاٹی اور کشمیر کی وادی دونوں ہی ڈاکوؤں کی زد میں ہیں۔ لیکن چمبل کے ڈاکو افراد کے لئے خطرہ ہیں۔ ملک کی عزت اور سالمیت کے لئے نہیں، اس کے مقابلے میں کشمیر کے ڈاکو آزادی، انصاف اور جمہوریت کے اقدار کے لئے زبردست خطرہ بنے ہوئے ہیں، اور جے پرکاش نرائن پر لازم تھا کہ وہ چمبل سے پہلے کشمیر کو ڈاکوؤں کی بالادستی اور دست اندازی سے محفوظ کرانے کی کوشش کرتے۔ چراغ بیگ کی نگاہوں میں وہ ڈاکو اتنا خطرناک اور موذی نہیں ہوتا کہ جو اپنے ڈاکو ہونے کا اعتراف اور اعلان کرتا ہے لیکن اس ڈاکو کا کیا کہئے کہ جو قانون کا محافظ بن کر آپ کی عزت اور دولت لوٹتا ہے۔

چمبل کے ڈاکوؤں نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ بارہ سال تک دوسروں کی دولت پر جینے اور لہو پینے کے بعد بھی انسان کا سویا ہوا ضمیر بیدار ہو سکتا ہے اور اپنے گناہوں کے داغ دھونے کیلئے مادھو سنگھ جیسا ڈاکو بھی ہتھیار ڈال کر اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر سکتا ہے۔ کیا کشمیر کے ڈاکو مادھو سنگھ سے سبق حاصل کر کے اپنے آپ کو قانون کے حوالے کریں گے۔

(۲۳ رمئی ۷۲ء)

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

جوں جوں زمین اور شہری جائداد کی حد مقرر کئے جانے کے دن قریب آرہے ہیں۔ بلڈ پریشر، اختلاجِ قلب، امراضِ اعصابی، عوارضِ دماغی اور علّتِ بے خوابی کے مریضوں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ایک اخباری اطلاع کے مطابق پنجاب میں حد (Coeling) سے بچنے کے لئے کچھ لوگ حد سے بھی تجاوز کر گئے۔ یعنی انہوں نے دھڑا دھڑ اپنی بیویوں کو طلاق دینا شروع کر دیا تاکہ حد کی زد سے محفوظ رہیں۔ مہاراشٹر میں زمین کی فرضی خرید و فروخت کا سلسلہ اتنی خطرناک صورت اختیار کر گیا کہ CIELING کا قانون تقریباً بے مقصد نظر آنے لگا۔ ملک کے دوسرے حصّوں میں بھی زمیندار اور سرمایہ دار "مقررہ حد" کو بے کار بنانے کیلئے کاغذی تقسیم، فرضی شراکت نامے، نقلی ہبہ نامے، جعلی دستاویزات اور مصنوعی طلاق نامے تیار کرنے میں مصروف ہیں۔ کشمیر میں زمین تو پہلے ہی زمین داروں سے چھین کر کاشت کاروں کی تحویل میں آگئی ہے۔ لیکن شہری جائداد کے مالکوں میں بے حد سراسیمگی اور بدحواسی پھیلی ہوئی ہے۔ اور چراغ بیگ کو معلوم ہوا ہے کہ جموں اور سری نگر میں بہت سے غاصب سرمایہ دار، حکومت کے بڑے بڑے اہل کاروں سے مل کر قانون اور انصاف کی آنکھوں میں دھول جھونک چکے ہیں۔ اس فریب کی ابتدا سب سے پہلے مہاراج ادھیراج ڈاکٹر کرن سنگھ، مرکزی وزیر سیاحت و شہری ہوا بازی نے کی تھی کہ جنہوں نے نوشتۂ دیوار کو پڑھ کر اپنی زمین و جائداد کو آج سے دو سال قبل ہی ٹھکانے لگا دیا۔

زمین اور شہری جائداد کی ایک مناسب اور مقررہ حد قائم کئے جانے سے بجا طور پر

ان لوگوں کی نیندیں حرام ہو گئی ہیں کہ جنہوں نے زمین اور جائداد کے انبار لگانے کیلئے اپنے اوپر راتوں کی نیندیں اور دن کا چین حرام کر رکھا تھا۔ جن کی زندگی کا مقصد ہر جائز و ناجائز طریقے سے دولت سمیٹ کر اپنے اور اپنے بچوں کے لئے اونچی اونچی حویلیاں تعمیر کرنا تھا، ہوس کے ان بندوں نے ایک ایک پائی کے لئے جھوٹ، دغا اور فریب سے کام لیا ہے۔ اور ایک ایک انچ زمین کے لئے اپنے ضمیر کا خون کیا ہے۔ اپنے پڑوسیوں کا حق غصب کرنے کے لئے پٹواریوں سے لے کر ڈپٹی کمشنروں تک کی جیبیں گرم کی ہیں۔ معصوم، بے زبان اور بھولے بھالے لوگوں کو مقدمات میں پھنسا کر انہیں زبردستی اپنے حقوق سے دستبردار کیا ہے۔ ان کی غربت اور مجبوریوں سے فائدہ اُٹھا کر ان کے سونے کو مٹی کے داموں خرید کر اپنے لئے شیش محل تعمیر کئے ہیں۔ بے ایمانی، ضمیر فروشی، مکاری، دغا بازی اور جعلسازی کی بنیادوں پر تعمیر کی گئی حویلیاں آج اُمیدوں اور آرزوؤں کے کھنڈر دکھائی دے رہی ہیں۔ اور غاصبوں کے دل و دماغ گناہ بے لذّت کے احساس سے بوجھل ہیں۔ ایک ایک تنکا جمع کرنے میں اُنہوں نے کتنی بار اپنے ضمیر کا خون کیا تھا، ایک ایک دیوار کھڑی کرنے میں اُنہوں نے اپنے ملک، اپنی قوم اور اپنے پڑوسیوں سے کتنی بار غدّاری کی تھی، ایک ایک کمرہ سجانے میں اُنہوں نے کتنی بار حقداروں کا حق غصب کر کے اپنے لئے سامانِ عیش فراہم کیا تھا۔ لیکن آج وقت کا بے رحم انقلاب شیش محل کے فولادی دروازوں پر اس زور سے دستک دے رہا ہے کہ غاصبوں کے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے ہیں۔

یہ لمحۂ فکریہ ہے ان ٹھیکے داروں کے لئے کہ جنہوں نے عوامی مفاد کے ہر سرکاری کام میں بد دیانتی اور خیانت سے لاکھوں روپے کما کر عالیشان محل بنائے، ان انجینیروں کے لئے، کہ جنہوں نے ٹھیکیداروں سے مل کر عوامی خزانے کو لوٹا، اور اپنے لئے لال قلعے تعمیر کئے۔ ان اعلیٰ سرکاری افسروں کے لئے کہ جنہوں نے رشوت اور گول مال سے لاکھوں روپے کی جائداد بنا کر اپنی شہزادیوں کے لئے جہیز تیار کیا۔ ان بدکردار شہریوں کے لئے جنہوں نے چرس کی ناجائز تجارت اور سمگلنگ سے کروڑوں روپے کما کر نہایت عالیشان سینما گھر تعمیر کروائے پولیس کے ان بڑے بڑے کرمچاریوں کے لئے کہ جنہوں نے چرس کی تجارت اور سمگلنگ کو ممکن

بنا کر اپنے لئے بڑی بڑی کوٹھیاں بنوائیں، اُن بدچلن وزیروں کے لئے کہ جنہوں نے عوامی اعتماد کو اپنے ذاتی مفاد کے لئے استعمال کر کے اپنے لئے ایسے ایسے عشرت کدے تعمیر کیئے کہ ان پر تاج محل کا گماں ہوتا ہے۔ اِن ڈاکٹروں اور معالجوں کے لئے کہ جنہوں نے مجبور انسانیت کی رگوں سے لہو کا آخری قطرہ نچوڑ کر اپنے لئے رنگ محل تعمیر کروائے، ان تاجروں کے لئے کہ جنہوں نے اشیاء خوردنی میں ملاوٹ کر کے لاکھوں لوگوں کی زندگی خطرے میں ڈال دی تاکہ ان کی اپنی زندگی آرام سے کٹے، ادویات کے ان سوداگروں کے لئے کہ جنہوں نے دوا کے نام سے پانی بیچ بیچ کر غریب اور مفلوک الحال عوام کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالا تاکہ اُن کے اپنے بچّے اونچی اونچی حویلیوں میں رہ سکیں، ان بے ضمیر، بے ایمان اور بے حیا "دین داروں" کے لئے کہ جنہوں نے بعض ایک انچ کی زمین پر اپنا قبضہ جتانے اور جمانے کے لئے قرآن اور گیتا کی جھوٹی قسمیں کھائیں۔ ان واعظوں اور میرواعظوں کے لئے کہ جنہوں نے مذہب کے مقدّس نام کو اپنی ذاتی جائداد میں اضافہ کرنے کے لئے استعمال کیا۔ ان تمام لوگوں کو سوچنا چاہیئے کہ کیا بے حد زمین اور بے حساب دولت، دلی مسرت اور سچّی خوشی کا نعم البدل ہو سکتی ہے؟ اور یہ کیا وجہ ہے کہ سب سے زیادہ دولت مند اور صاحب جائداد لوگ سب سے زیادہ دل کی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں، آج جبکہ زمین اور شہری جائداد کی حد مقرر کئے جانے سے سرمایہ داروں، ٹھیکے داروں، وزیروں اور سرکاری اہل کاروں کی دُنیا میں ہاہاکار مچی ہے، چراغ بیگ مزے کی نیند سوتا ہے اور نہایت ہی سُندر سپنے دیکھتا ہے۔ اُسے نہ زمین کی حد مقرر کئے جانے کا غم ہے اور نہ جائداد کے چھن جانے کا۔ وہ خوش ہے کہ ناجائز طور سے دولت جمع کرنے والوں کا روزِ حساب قریب آرہا ہے۔ اور شاید وہ وقت بھی آجائے کہ بڑے بڑے محلات میں رہنے والے ان غاصبوں سے پوچھ لیا جائے کہ تم نے اتنی دولت کہاں سے اور کیوں کر جمع کر لی؟ یہ اخلاقی مجرم اور سیاہ کار تو خاموش رہیں گے لیکن اگر ان عشرت کدوں میں لگی ہوئی اینٹوں کو زبان مل جائے، تو مجھے یقین ہے کہ ایسے ایسے انکشافات ہوں گے کہ انسانیت لرز جائے گی اور دنیا حیران ہوگی کہ اس سماج میں کیسے کیسے موذی درندوں کو عزّت و حشمت کا مستحق سمجھا جاتا رہا ہے۔

(۳۱ر مئی ۷۲ء)

سخن ہائے ناگفتنی!

شملہ کی چوٹی کانفرنس میں وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے علاوہ چار کشمیری مشیر شامل تھے، شری ڈی، پی، در۔ پی، این، در۔ شری ٹی، این، کول اور شری پی، این، ہکسر۔ جب مشیر اعلیٰ ڈی، پی، در صاحب دل کی دھڑکن تیز ہونے کی وجہ سے بات چیت میں شرکت نہ کر سکے تو ہندوستانی وفد کی قیادت کشمیر ہی کے ایک مایہ ناز فرزند شری پی، این، ہکسر کے سپرد ہوئی، چوٹی کانفرنس میں کشمیریوں کے اس غلبے پر اندرون ملک اور بیرون ملک بڑے دل چسپ تبصرے ہوئے اور ابھی دہلی سے شائع ہونے والے ایک انگریزی معاصر ہندوستان ٹائمز کے کارٹونسٹ سدھیر در (جو غالباً خود بھی کشمیری ہیں) نے ایک کارٹون میں بڑے لطیف انداز میں اس غلبے پر ایک عام آدمی کا ردِّ عمل ظاہر کیا ہے۔ سدھیر در نے شیخ عبداللہ کے اس دعویٰ کا مذاق اڑایا ہے کہ کشمیر کے متعلق ہونے والی بات چیت میں کشمیریوں کو بھی شامل کیا جانا چاہیئے۔ کیونکہ ان کے خیال میں وزیر اعظم سمیت کل ملا کر پانچ کشمیری شملہ کی بات چیت میں پہلے سے ہی شریک تھے۔ کارٹون کے طنز سے قطع نظر بات ہے بھی صحیح۔ اس وقت سارے ہندوستان میں اس بات کا چرچا ہے کہ آدھ درجن کشمیری، پورے ملک پر چھائے ہوئے ہیں، اور وزیر اعظم پر ان کے کچھ مخالف یہ الزام عائد کر رہے ہیں کہ وہ کشمیر کو ہندوستان کے ساتھ ملانے کی بجائے ہندوستان کو کشمیر سے ملانے کی پالیسی پر عمل کر رہی ہیں۔ بحیثیت کشمیری کے چراغ بیگ کو وزیر اعظم کی اس کشمیر نوازی پر خوش اور اپنے کشمیری بھائیوں کے اس عروج پر فخر ہونا چاہیئے۔ ادر ہے، لیکن ایک دو باتیں بری طرح کھل رہی ہیں، جن کا ذکر کئے بغیر

دل اور پیٹ کے درد میں افاقہ ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ ایک یہ کہ جب کشمیری پورے ہندوستان پر حکومت کرنے کے اہل ہیں۔ تو پھر انہیں اپنے گھر یعنی کشمیر پر حکومت کرنے کا اختیار حاصل کیوں نہیں ہے؟ کیا وجہ ہے کہ جب بھی کشمیر میں نمائندہ حکومت، آزادانہ انتخابات، جمہوریت کی بحالی اور عوام کی سرداری کا موضوع زیر بحث آتا ہے، تو وزیر اعظم کے خوبصورت ماتھے پر انتہائی بدصورت شکنیں نمودار ہوتی ہیں۔ اور وہ جمہوریت، انصاف اور آئین کی حرمت کا مطالبہ کرنے والوں کو کچّا چبانے پر آمادہ نظر آتی ہیں؟ کیا کشمیری صرف اپنی ریاست سے باہر ہی حکومت کی اہلیت اور صلاحیت رکھتے ہیں؟ کیا ایک بار انہیں اپنے گھر پر حکومت کرنے کا حق دے کر کچھ مدّت کے لئے ان پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا؟ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی ریاست میں بھی اپنی قابلیت اور اہلیت کا سکّہ جما سکیں مگر آزمائش شرط ہے۔ یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ کشمیریوں کو گذشتہ چھ سو سال میں ایک بار بھی اپنے گھر پر حکومت کرنے کا حق نہیں ملا ہے۔ اس حق کا نام خود ارادیت رکھا گیا ہے۔

دوسری بات کہتے ہوئے کچھ ڈر لگ رہا ہے کہ پاکستانی ایجنٹ کہلانے کے بعد اب فرقہ پرست نہ کہلاؤں۔ میں دنیا کے سارے الزامات اپنے سر لینے کے لئے تیار ہوں لیکن فرقہ پرستی کی گالی برداشت نہ کر سکوں گا۔ اور جو کچھ کہنے جا رہا ہوں اس میں اگر فرقہ پرستی کی بُو آئے تو قصور میرا نہیں۔ اس حقیقت کا ہے کہ جو فرقہ وارانہ لباس پہنے ہوئے نظر آتی ہے۔ یہ بات محض اتفاق ہے، کیا کہ وزیر اعظم کے تمام کشمیری مشیر، کشمیری پنڈت ہیں؟ کیا کشمیر کے ایک مسلمان میں بھی یہ سلیقہ صلاحیت اور اہلیت نہیں ہے کہ وہ وزیر اعظم کے اعتماد اور اعتبار کے اہل ثابت ہو سکے؟ صلاحیت، اہلیت، قابلیت اور ذہانت کے اعتبار سے کشمیر میں بہت سے مسلمان بھی ان منصبوں پر فائز ہو سکتے ہیں جہاں ڈی، پی، در۔ پی، این، در۔ ٹی، این، ہکسر۔ کول اور دوسرے کشمیری جلوہ گر ہیں۔ لیکن مسز گاندھی پر ان کی نگاہ نہیں پڑی ہوگی، اس لئے ان پر "فرقہ پسندی" کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ چراغ بیگ انہیں مشورہ دے گا کہ وہ اپنے مشیروں کی یو وک سبھا توڑ کر اسے نیشنل کانفرنس میں بدل دیں۔ تاکہ قومی یک جہتی کے ساتھ ساتھ سیکولرازم کا علم بھی بلند رہے۔

(۱۷ر جولائی ۷۲ء)

روزگار نہیں ریزگاری

انسان چاند پر اپنا جھنڈا گاڑ کر اب مریخ پر جانے کی تیاریوں میں مصروف ہے، لیکن ہندوستان ابھی بیل گاڑی کے پہیئے کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ آسمان پر جمبو جہازوں کی اُڑان اور زمین پر راجدھانی ایکسپریس کی رفتار دیکھ کر اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ ہمارا شمار ترقی یافتہ ممالک میں ہوتا ہے۔ یہ سب ملنگے کا اُجالا ہے، اور صرف ظاہری ٹھاٹھ باٹھ ہیں۔ ہمارے جمبو جہازوں کی دُم بھی ہماری روح کی طرح بیل گاڑی سے ہی بندھی ہوئی ہے! ثبوت میں ایک نہیں ایک ہزار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، لیکن میں صرف دو پر اکتفا کرونگا۔

اس وقت مغرب کے لوگوں کو جن مسائل کا سامنا ہے، ان میں فضا میں گرد و غبار، زہریلی گیس، کارخانوں اور موٹروں سے نکلنے والے دھوئیں اور دوسرے غیر صحت مند عناصر کے بڑھتے ہوئے عناصر کا مسئلہ سب سے اہم مسئلہ بن گیا ہے اور ابھی حال ہی میں سٹاک ہوم میں اقوام متحدہ کے اہتمام سے اس مسئلے پر غور کرنے کے لئے ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی تھی، جس میں ہمارا ملک بھی شریک ہوا تھا اور ہماری وزیر اعظم نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے اس کانفرنس سے خطاب بھی کیا تھا۔ دنیا اور خاص طور پر مغربی دنیا کو درپیش اس مسئلے کے مقابلے میں، ہمارے ملک کو اس وقت کونسا اہم ترین مسئلہ درپیش ہے؟ ذرا سوچ کر بتائیے! غربت؟ تعلیمی پسماندگی؟ چھوت چھات، بڑھتی ہوئی آبادی؟ بے کاری اور بے روزگاری؟ ان میں سے ہر مسئلہ اپنی جگہ اہم ہے۔ اور ان مسائل کو حل کئے بغیر ہم ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ لیکن یہ ایسے پیچیدہ اور سنجیدہ مسائل ہیں کہ انہیں

فوری طور پر حل کرنا کسی کے بس کی بات نہیں، ان سے نپٹنے کے لئے سالہا سال کی لگن، محنت، ریاضت اور ہمت چاہیئے۔ مسز اندرا گاندھی نے "غریبی ہٹاؤ" کا نعرہ دے کر غریبوں کا اعتماد تو حاصل کر لیا ہے۔ لیکن اب انہیں اس بات کا اندازہ ہو رہا ہے کہ غریبی نعرے بلند کرنے سے نہیں، غریبوں کا معیارِ زندگی بلند کرنے سے ہٹتی ہے اور یہ مسز گاندھی اور ان کے چالیس چوروں کے بس کی بات نہیں۔ میرے خیال میں اس ملک کو اس وقت جو اہم ترین مسئلہ درپیش ہے، وہ نہ بے کاری کا ہے اور نہ بے روزگاری کا۔ وہ ہے ریزگاری کا، پچھلے دو سال سے اِس ملک میں ریزگاری کا جو کال پڑا ہے، اس سے جہاں عام لوگوں کی زندگی عذاب بن گئی ہے وہاں یہ بات بھی ثابت ہو گئی ہے کہ اِس ملک کی حکومت انتہائی نااہل، نالائق اور بد دیانت ہاتھوں میں ہے۔ پورے دو برس سے لوگ ریزگاری کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ روزمرہ کی زندگی مشکل بن گئی ہے۔ دکاندار، خریدار، بس ڈرائیور، مزدور، پان والا، ہوٹل والا، تانگے بان، کشتی بان، نائی، دھوبی سب چلا رہے ہیں کہ ریزگاری نہیں مل رہی ہے۔ لیکن حکومت ٹس سے مس نہیں ہو رہی ہے۔ ریزگاری نہ ملنے کی وجہ سے چیزوں کی قیمتیں بڑھ گئی ہیں اور اگر بڑھی بھی نہیں ہیں تب بھی خریدنے والے کو زیادہ دینا پڑ رہا ہے۔ کیونکہ دکاندار کے پاس لوٹانے کے لئے ریزگاری نہیں اور خریدنے والے اپنی ضرورت سے مجبور۔ آخر ریزگاری مہیّا کرنے میں کون سے پہاڑ کاٹنے ہیں کہ حکومت روزمرّہ زندگی کی یہ معمولی سی ضرورت پورا کرنے بھی ناکام ہو گئی ہے۔ نوٹ اور ریزگاری تیار کرنے میں حکومت کو مکمل اجارہ داری حاصل ہے۔ اور یہی ایک شعبہ ہے جس میں حکومت کسی دوسرے کو دخل دینا بھی چاہے تو نہیں دے سکتی۔ غیر معمولی اختیار اور بے پناہ وسائل کے باوجود حکومت دو سال سے یہ معمولی مسئلہ حل کرنے میں کیوں ناکام رہی ہے؟ اس کی کوئی معقول وجہ مجھے نظر نہیں آ رہی ہے۔ سوائے اس کے کہ اُسے عوام کی مشکلات کا احساس نہیں ہے یا وہ ان عوامی مسائل کو زیادہ اہمیت دینے کی روادار نہیں ہے۔ پچھلے کئی ماہ سے جس اعلیٰ اور ادنیٰ سطح پر زرعی زمین اور شہری جائداد کی حد مقرر کرنے کے سوال پر بحث ہو رہی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے جیسے اس ملک کے سارے مسائل حل ہو چکے ہیں۔ اور اب آخری مسئلہ

زمین اور جائداد کی حد مقرر کرنے کا ہے۔ کوئی ان لال بجھکڑوں سے یہ نہیں پوچھتا کہ تم اس ملک کے لوگوں کو ریزگاری تک تو مہیا نہیں کر سکتے روزگار کہاں سے مہیا کرو گے، اور میرا عقیدہ ہے کہ جو سرکار اتنی نکمّی اور نالائق ہو کہ وہ ریزگاری جیسی معمولی ضرورت پوری نہ کر سکے اُس سے بے روزگاری دُور کرنے کی توقع رکھنا ہی بے کار ہے۔

ابھی حال ہی میں سرکار نے یہ حکم نامہ جاری کر دیا ہے کہ پبلک ٹیلی فون بُوتھوں سے ٹیلی فون کرنے کے لئے اب بیس کی بجائے تیس پیسے درکار ہوں گے، قطع نظر اس بات کے کہ ایک ٹیلی فون کال کے لئے تیس پیسے کی رقم ناقابلِ برداشت حد تک زیادہ ہے، یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ کہ ریزگاری کے اِس قحط میں یہ تیس پیسے آئیں گے کہاں سے؟ بیس پیسے حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے برابر تھا اب تیس پیسے کہاں سے آئیں گے۔ اور پھر اس پر طرّہ یہ کہ تیس پیسے ڈال کر بھی آپ اس خوش فہمی میں نہ رہیئے کہ آپ مطلوبہ نمبر کے ساتھ بات کر سکیں گے، کیوں کہ پبلک بوتھوں پر لگے ہوئے اسی فیصد ٹیلی فون، آپ کا پیسہ ہضم کرنے کی صلاحیت تو رکھتے ہیں لیکن آپ کا مقصد پورا کرنے کی اہلیت سے محروم ہیں۔ یہ بات میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ دہلی ہو یا سری نگر، بمبئی ہو یا کلکتہ جس شہر میں بھی، میں نے کبھی پبلک بوتھ سے ٹیلی فون کیا، وہ ٹیلی فون خراب تھا۔ اور اس کا مجھے بکس میں پیسے ڈالنے کے بعد ہی علم ہو جاتا تھا، امریکہ اور لندن میں ہوائی اڈوں، ریلوے سٹیشنوں اور اہم مقامات پر ہی نہیں، شاہراہِ عام کے دونوں طرف سینکڑوں ٹیلی فون بوتھ لگے ہوئے ہیں اور میں نے ایک نہیں، درجنوں بار یہ ٹیلی فون استعمال کئے۔ مجال ہے کہ ایک بار بھی دھوکہ کھایا ہو۔ اگر آپ کو مطلوبہ نمبر نہ ملے یا دوسری طرف کا ٹیلی فون خراب ہو تو کھٹاک سے پیسے بکس سے واپس نکل آتے ہیں۔ ایک بار نیویارک میں، میں نے ایک بوتھ سے ٹیلیفون کیا تو آواز آئی کہ آپ نے دو سینٹ کم ڈالے ہیں، جب تک میں نے دو سینٹ نہ ڈالے مطلوبہ نمبر نہ ملا۔ پھر ایک دن میں نے دو سینٹ زیادہ ڈالے تو کھٹاک سے دو سینٹ باہر نکل پڑے۔ ہوائی اڈوں اور ریلوے سٹیشنوں پر ٹیلی فون بوتھس کے ساتھ ہی ریزگاری حاصل کرنے کی مشین بھی لگی ہوئی ہیں۔ آپ نوٹ مشین میں ڈالئے اور جس قسم کی ریزگاری کی ضرورت

ہو بٹن دبا کر حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں اولاً ریزگاری ہی دستیاب نہیں، جوں توں کر کے ریزگاری حاصل کرلی تو ٹیلی فون کا کچھ یقین نہیں، خدا کا نام لے کر پیسہ ڈالو قسمت ہوئی تو مراد پوری ہوگی ورنہ چراغ بیگ ہی کی طرح نامراد لوٹو گے۔ کیوں کہ ٹیلی فون کے پیٹ سے پیسہ نکالنے کی کوئی صورت نہیں۔ شکایت آپ کر نہیں سکتے۔ کیوں کہ سب سے پہلے تو آپ کی بات کا کوئی اعتبار نہیں کرے گا اور اگر کسی نے بدقسمتی سے آپ کی بات کا اعتبار کر بھی لیا تو سمجھ لیجئے کہ آپ کی شامت آگئی۔ اب آپ کو ملزموں کی طرح دفتروں کی حاضری دینا پڑے گی، اور تیس پیسے کی خاطر تیس چالیس روپوں کا نقصان اُٹھانا پڑے گا۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ سب کچھ سہیئے اور چپ رہیئے۔

کروڑوں روپے سے جمبو جیٹ خرید کر چلانا، ایٹمی توانائی پیدا کرنا، خلائی تحقیق پر کروڑوں روپے صرف کر کے اپنے ترقی یافتہ ہونے کا دعویٰ کرنا، امیروں سے زمین چھین کر غریبوں میں تقسیم کرنا، یہ سب اچھی باتیں ہیں۔ لیکن روزمرہ کے استعمال کے لئے ریزگاری مہیا کرنا اور اپنے ٹیلی فون سسٹم کو ٹھیک کرنا، جمبو جیٹ چلانے سے کم اہم نہیں ہے۔

ہندوستان کی ایک فیصد آبادی بھی جمبو جیٹ اور ایٹمی توانائی کے استعمال سے دلچسپی نہیں رکھتی۔ لیکن سو فیصد آبادی کو ریزگاری اور ٹیلی فون سے روز کا واسطہ پڑتا ہے۔ اِس لئے کیا یہ مناسب نہیں کہ پہلے عوامی ضرورت اور اہمیت کے مسائل کی طرف توجّہ دی جائے اور پھر ستاروں پر کمندیں ڈالی جائیں۔ لیکن یہ بات سُنے گا کون؟ ہندوستان کے حکمرانوں کو اس بات کا یقین ہے کہ اس ملک کے عوام ہر ذلّت، ہر مصیبت اور ہر قسم کی بے عزّتی سہنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اس لئے انہیں ابھی بہت دیر تک خوبصورت نعروں کے کھلونوں سے بہلایا جا سکتا ہے۔ جلدی کیا ہے۔ روزگار کی طرح کبھی نہ کبھی ریزگاری بھی مہیّا ہو ہی جائے گی۔

(۲۳ر جولائی ۷۲ء)

حاجی یا پاجی ؟

علاقہ شوپیان کے موضع ــــ میں چراغ بیگ کے ایک جان پہچان والے بزرگ رہتے ہیں۔ علاقہ بھر میں مشہور آدمی ہیں۔ جنگلات سے لکڑی چُرانا اُن کا مشغلہ ہی نہیں، ذریعہ روزگار بھی ہے، کبھی کبھی گھوڑے چُرا کر بھی اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ گاؤں کے ہر مقدمے اور تنازعے میں فریق ہوتے ہیں۔ مقدمات میں جھوٹی گواہی دینے میں اِن کا جواب نہیں۔ پولیس کے افسروں کو جی بھر کر رشوت دیتے ہیں۔ اور اسی بنا پر ابھی تک حوالات کی سیر نہیں کی ہے۔ آدمی بڑے تیز طرار اور دل چسپ ہیں اور "بڑے" آدمیوں سے راہ و رسم پیدا کرنے کا انہیں بڑا شوق ہے۔ اسی لئے تحصیل دار سے لے کر ڈپٹی کمشنر تک سبھی لوگ انہیں جانتے ہیں اور پہچانتے ہیں۔

یہ حضرت پچھلے ایک ماہ سے میرے پیچھے پڑ گئے ہیں کہ میں ان کے حج بیت اللہ جانے کا انتظام کروں۔ بالفاظِ دیگر ان کے لئے حج پر جانے کے لئے سیٹ کا بندوبست کروں۔ پچھلے ہفتے انھوں نے یہ انکشاف بھی فرمایا کہ وہ سیٹ حاصل کرنے کے لئے ہزار ڈیڑھ ہزار روپے کی رشوت بھی دینے کے لئے تیار ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ صاحب جتوں توں کر کے اپنے لئے سیٹ حاصل کر کے ہی دم لیں گے۔ اور بیت اللہ شریف کی زیارت کا شرف حاصل کریں گے۔ واپسی پر یہ حضرت بہت سی ممنوعہ چیزیں بھی "سمگل" کریں گے۔ اور پھر حاجی صاحب کہلائیں گے۔

کیا مفتیانِ کرام اور علمائے دین یہ بتانے کی زحمت کریں گے کہ اِن حضرات سے اور اسی قماش کے دوسرے عازمینِ حج کا حج جائز ہے؟۔ میرا خیال ہے کہ اس قسم کے حاجی صاحبان اسلام اور مسلمان دونوں کے لئے تذلیل کا باعث ہیں۔ اور انہیں حاجی کے بجائے پاجی کہنا چاہیئے۔

(۳۱ر جولائی ۶۷ء)

ہائیڈ پارک سے پرتاپ پارک

لندن میں یوں تو کئی قابلِ دید مقامات اور تاریخی عمارات ہیں، لیکن چراغ بیگ کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ "ہائیڈ پارک" ہے۔ یہ پارک شہر کے وسط میں ایک وسیع و عریض خطے پر پھیلا ہوا ہے، اور صبح سویرے سے شام گئے تک لوگ یہاں ٹہلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ظاہری طور پر اس پارک میں کوئی خوبی یا خوبصورتی نظر نہیں آتی، اور ہمارے شہر میں اس سے کہیں خوبصورت باغات اور "پارکات" (جمع پارک کی) موجود ہیں، لیکن ہائیڈ پارک انگریزوں کی خوش مذاقی، اعلیٰ ظرفی، وسعت قلبی اور اپنے آپ پر ہنسنے کی صلاحیت کا ایک مثالی نمونہ ہے اور برطانوی پارلیمنٹ کی طرح اسے بھی ایک ادارے کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ پارک کے ایک کونے کو "سپیکرس کارنر" یعنی مقرروں کا کونہ، کا نام دیا گیا ہے، اور یہاں ہر شام اور اتوار کو دن بھر تقریریں ہوتی رہتی ہیں۔ مقررین میں صرف انگریز ہی نہیں، افریقہ، امریکہ، مصر، اسرائیل، ہندوستان، پاکستان، افغانستان، ایران غرض دنیائے جہاں سے آئے ہوئے لوگ شامل ہوتے ہیں، اور جو شخص جس موضوع پر بولنا چاہے بول سکتا ہے۔ تقریر کے لئے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں، ایک سٹول پر کھڑے ہو کر تقریر شروع کر دیجیے، کچھ لوگ آپ کے گرد جمع ہو جائیں گے، اگر آپ کی تقریر دلچسپ ہے تو مجمع بڑھتا جائے گا، ورنہ آپ اپنی آواز سننے کے لئے تنہا رہ جائیں گے۔ دس دس بیس بیس گز کے فاصلے پر بیک وقت کئی مقرر اپنی دکان سجائے رکھتے ہیں، اور انگریز سامعین بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے ان مجمع باز مقرروں کے "خیالات" سے مستفید

کم اور محظوظ زیادہ ہوتے ہیں، لندن پہنچنے کے پہلے ہی دن جب میں شام کو ہائیڈ پارک گیا تو اس دن نائیجیریا (افریقہ) کا ایک حبشی بہت بڑا مجمع اکٹھا کئے ہوئے تھا، مجمع میں زیادہ تر لوگ انگریز تھے اور حبشی بڑی شستہ انگریزی میں انگریزوں کو گالی دے رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ "تم بدمعاشوں نے افریقہ کا خون چوس کر اپنے لئے عالیشان شہر اور سڑکیں تعمیر کیں، تم نے ہماری عزت اور آبرو کو لوٹ کر اپنے لئے عیش اور عشرت کا سامان بہم کر دیا۔ تم دنیا بھر کے ذلیل ترین لوگ ہو اور ہم افریقیوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اب تمہیں اپنی دھرتی پر کبھی قدم نہ رکھنے دیں گے۔" میرا خیال تھا کہ یہ حد درجہ اشتعال انگیز تقریر سن کر انگریز اس حبشی کو سٹول سے اُتار کر اس کی ہڈی پسلی ایک کر دیں گے۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب میں نے دیکھا کہ حبشی کے زہر میں بجھے ہوئے ایک ایک فقرے پر بڑے زور کا قہقہہ بلند ہو رہا ہے، اور سامعین میں سے بعض لوگ اس کے خیالات کی داد دے رہے تھے۔ یہ حبشی لندن یونیورسٹی میں پولٹیکل سائنس کا طالب علم تھا اور اس کے بارے میں معلوم ہوا کہ جب تک ہر شام ہائیڈ پارک میں آکر انگریزوں کو گالی نہیں دیتا، اس کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ سپیکرس کارنر کا مقبول ترین مقرر سمجھا جاتا ہے اور اس کے گرد ہمیشہ ایک بہت بڑا مجمع رہتا ہے۔

حبشی سے کچھ ہی دور ایک عرب طالب علم انگریزوں کو ان کی بے ہودگی، بدتمیزی اور مکاری پر کوس رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "تم خبیثوں نے اسرائیل کو جنم دے کر عربوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے اور تم اپنی تجارت کے لئے اپنی بہو بیٹیوں کا سودا کرنے کے لئے بھی تیار ہو، تم ہمارے تیل کی خاطر ہمارے تلوے چاٹتے ہو، اور پھر یہودیوں کے ساتھ سازش کر کے ہمیں تباہ کرنے کی کوشش کرتے ہو۔ تم دنیا میں سب سے زیادہ بے ایمان، مکار اور ریاکار ہو۔"

چند گز کے فاصلے پر ایک انگریز بلیک بورڈ پر لوگوں کو کمیونزم اور مارکسزم کا فلسفہ سمجھا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ سرمایہ داری کی موت قریب ہے، اور ساری دنیا پر کمیونزم کا غلبہ ہو کر رہے گا۔ وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ آئندہ بیس برسوں میں انگلستان پر لال جھنڈا

لہرائے گا۔ اور ملکہ کو اس کے وزیروں سمیت لندن کے عجائب گھر میں رکھا جائے گا۔

ایک کونے میں روڈیشیا کا ایک نوجوان وزیر اعظم ہیتھ کو ماں بہن کی گالی دے رہا تھا۔ اس کے متعلق معلوم ہوا کہ یہ وہاں کی ایک سیاسی جماعت سے تعلق رکھتا ہے اور اُسے روڈیشیا سے جلاوطن کر دیا گیا ہے۔ یہ نوجوان کہہ رہا تھا "تم اپنے آپ کو حضرتِ عیسیٰ کا پیرو کہتے ہو، لیکن میں کہتا ہوں کہ تم اصل میں شیطان کے پیرو ہو، تمہارا وزیر اعظم دنیا کا سب سے بڑا مجرم ہے۔ اور جب روڈیشیا تم سفید فام لوگوں کے تسلّط سے آزاد ہو گا۔ تو ہم تمہارے وزیر اعظم کی کھال میں بھوسہ بھر دیں گے۔

ایت وار کو میں دن بھر ہائیڈ پارک میں گھومتا رہا، اور آزادیٔ خیال، خود تنقیدی اور رواداری کے اس قابلِ تقلید مظاہرے پر سر دھنتا رہا۔ اس دن مقرر بھی زیادہ تھے۔ اور سامعین بھی۔ اور نائیجیریا کے طالب علم نے بڑی زوردار تقریر کے بعد سامعین کو بتایا کہ میں نے اپنی تقریروں کا ایک مجموعہ بھی شائع کیا ہے، اور اگر کوئی صاحب اسے خریدنا چاہیں تو وہ آگے آ جائیں۔ پمفلٹ سائز کے اس مجموعے کی قیمت ایک پونڈ سے کچھ کم تھی، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اس کا سارا اسٹاک ختم ہو گیا۔ اور خریدنے والے سارے انگریز تھے تقریروں کے دوران مقرر اور سامعین کے درمیان خوب فقرے بازی ہوتی رہتی ہے اور ہر مجمع میں ایک ایک مسخرہ شامل رہتا ہے۔ جو سپیکر کی ٹانگ کھینچنے یا مجمع کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے طرح طرح کی حرکتیں کرتا ہے۔ مقرر تجربہ کار اور سخت جان نہ ہو تو وہ پریشان ہو کر بھاگ جائے، لیکن عام طور پر سپیکرس کارنر کے کھلاڑی بہت اچھے اور حاضر جواب مقرر ہوتے ہیں اور وہ ہر فقرے کا برجستہ جواب دے کر مجمع کی دل چسپی اور توجہ قائم رکھتے ہیں۔ حبشی طالب علم پر کئی بار 'یلغار' ہوئی۔ لیکن وہ بھی منجھا ہوا اداکار تھا' اس نے ہر بار اپنے نکتہ چینوں کو خاموش کر دیا۔ ہائیڈ پارک میرے لئے بالکل ایک نیا اور نادر تجربہ تھا۔ اور لندن میں اپنے دس روزہ قیام کے دوران میں ہر شام سپیکرس کارنر کے لئے کچھ وقت نکال ہی لیتا۔ معلوم ہوا کہ ہائیڈ پارک' کا "ادارہ" بہت پُرانا ہے۔ اور اس کونے کو اکثر انگریزوں کے مخالفوں نے انگریزوں کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکالنے

کے لئے استعمال کیا ہے، ہندوستان کی جنگِ آزادی کے دوران نہ۔ ہندوستان کے سابق وزیرِ دفاع کرشنا مینن، جو ان دنوں انڈیا لیگ کے صدر تھے، بھی اسی مقام سے برطانوی سامراج کے خلاف تقریریں کیا کرتے تھے۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ ہائیڈ پارک کے اس ذکرِ خیر کی شانِ نزول کیا ہے۔ اور میں اس آڑ میں کہنا کیا چاہتا ہوں؟ شانِ نزول یہ ہے کہ لندن کے ہائیڈ پارک کو دیکھ کر مجھے اپنے ہاں کا پرتاپ پارک اور گاندھی پارک یاد آیا تھا۔ اور میں نے سوچا تھا کہ کیا ہم ان پارکوں میں ایک "سپیکرس کارنر" منظم نہیں کر سکتے؟ میرے ہندوستان لوٹنے کے صرف چند دن بعد ہندوستان پاکستان میں جنگ چھڑ گئی، اور بات کرنا تو الگ، سوچنے پر بھی پابندی عائد کر دی گئی، اس لئے میں نے ہائیڈ پارک اور سپیکرس کارنر کے بارے میں سوچنا بھی ترک کر دیا، اب جبکہ شملہ کا معاہدہ ہو چکا ہے، اور پرانی دشمنی نئی دوستی میں بدل رہی ہے، فضا میں ایک خوشگوار سی کیفیت پائی جاتی ہے اور ماحول پہلے کے مقابلے میں زیادہ relaxed ہے، ہم آزادی کے پچیس سال پورے کر رہے ہیں۔ اور اس سلسلے میں ایک جشن بھی منا رہے ہیں، میرے ذہن میں ایک بار پھر ہائیڈ پارک اور سپیکرس کارنر کے تصوّر نے انگڑائی لی ہے کیونکہ میرے خیال میں اس ملک کو بالعموم اور ہماری ریاست کو بالخصوص ایک ہائیڈ پارک کی ضرورت ہے۔ ضرورت ہی نہیں اشد ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم دنیا بھر میں سب سے زیادہ 'سیاست زدہ' لوگ ہیں۔ سیاست زدہ ہونا اچھی یا بُری بات ہے، اس وقت اس سے بحث نہیں۔ لیکن سیاست میں تنگ نظری اور تنگ دلی نہ صرف فرد کی شخصیت کو ابھرنے نہیں دیتی بلکہ قومی کردار اور معاشرے کو بھی زنگ لگا دیتی ہے۔ جب تک انسان اپنے خلاف بات سننے کیلئے تیار نہ ہو اور دوسرے کے نکتۂ نظر کو سمجھنے کی مخلصانہ کوشش نہ کرے اس کا ذہن نابالغ اُس کی شخصیت ادھوری اور اس کی سوچ کچّی رہے گی۔ اپنے نظریات اور عقائد میں پختگی اچھی بات ہے لیکن تعصب اور کٹّرپن ذہنی صحت کے لئے بہت مہلک ہے۔ اور برادرانِ وطن مجھے معاف کریں گے کہ ہمارے ہاں عوام ہی نہیں رہنمایانِ قوم بھی ابھی تعصب اور کٹّرپن کا شکار ہیں۔ اور نتیجہ یہ کہ ہمارے ملک میں اب دیوزاد شخصیتیں کم اور بونے زیادہ پیدا

ہونے لگے ہیں۔ جموّں اور کشمیر میں، نئی نسل کا ذہن ایک خاص سطح پر آکر رُک گیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب آگے بڑھنے کی طاقت ختم ہو چکی ہے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ ذہنی تعصّب اور فکری کٹّرپن ہے۔ اور اس لئے میں چاہتا ہوں کہ ذہنوں کی کھڑکیاں کھول کر ان میں تازہ ہوا اور روشنی کا انتظام کیا جائے۔ اور اس کے لئے ضروری ہے کہ نوجوانوں میں بات کرنے کا ہی نہیں، بات سُننے کا بھی حوصلہ پیدا کیا جائے۔

کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم پرتاپ پارک، گاندھی پارک یا حضوری باغ میں ایک حصّہ سپیکرس کارنر کے نام سے مخصوص کریں۔ اس کارنر میں جو شخص جو بات کہنا چاہے اور جس طور پر کہنا چاہے اُسے اُس کی مکمل آزادی ہو اور اس کارنر میں صرف وہی شخص داخل ہو کہ جو ناپسندیدہ بات سننے کے لئے تیار ہو۔ اس کارنر کا صرف یہ ضابطۂ اخلاق طے پائے کہ اس کی چار دیواری میں ہر شخص کو اپنے نظریات، خیالات اور تاثرات بیان کرنے کی مکمل آزادی ہوگی۔ اور کسی شخص کو اسے روکنے، ٹوکنے یا دھمکانے کا حق حاصل نہ ہوگا۔ وہ جب تک قانون کی حدود میں رہتے ہوئے، اپنے حقوق کا استعمال کرتا ہے۔ اس پر کوئی پابندی، کوئی تعزیر عاید نہ ہوگی، ظاہر ہے کہ اس قسم کا ضابطۂ اخلاق صرف پولیس اور قانون کے سہارے لاگو نہیں ہو سکتا۔ اسے سیاسی لیڈروں، دانشوروں، طالب علموں اور عام لوگوں کی عملی اور اخلاقی حمایت حاصل ہونا چاہیئے تاکہ ایک اچھی اور صحت مند روایت کا آغاز ہو سکے۔ شروع شروع میں کچھ مشکلات ضرور پیش آئیں گی لیکن اگر ہم دیانتداری سے آزادیٔ خیال کے اس تجربے کو آزمائیں تو مجھے یقین ہے کہ ان سبھی مشکلات پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اس معمولی سے تجربے کے بڑے دور رس نتائج نکل سکتے ہیں اور مجھے اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ہماری ذہنی صحت اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گی۔ اور ہم تنگ نظری، تعصب اور عصبیت کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ کا آغاز کر سکتے ہیں۔ میں اپنی یہ ناچیز تجویز جناب شیخ محمد عبداللہ، سیّد میر قاسم اور دوسرے سیاسی لیڈروں کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے اس بات کی توقع رکھتا ہوں کہ وہ اس معصوم اور بے ضرر مگر مفید اور صحت مند تجویز پر سنجیدگی اور ہمدردی سے غور فرمائیں گے۔

(۷ راگست ۷۲ء)

ہاتھ سے ناک تک

ہندوستانی آئین نے آزادئ تحریر و تقریر کو بنیادی حق قرار دے کر ہمارے ذہن، ضمیر اور فکر کی آزادی کا تحفظ کیا ہے۔ آئین کی دفعہ ۱۹ کی رُو سے ہر شہری کو اظہارِ خیال، اعتقاد اور اجتماع کا حق حاصل ہے۔ اور اپنے اِس حق کے تحفّظ کے لئے وہ براہِ راست عدالتِ عالیہ یا سپریم کورٹ سے رجوع کر سکتا ہے۔ لیکن کم ہی لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ آزادئ رائے یا اظہارِ خیال کا یہ حق، آئینی ضمانتوں اور عدالتی تحفظ کے باوجود مطلق ABSOLUTE نہیں ہے۔ اور آئین کی دفعہ ۱۹ میں ہی اس کے استعمال پر کچھ حدود اور قیود عائد کی گئی ہیں۔ ایسا کرنا ضروری بھی تھا اور مناسب بھی، کیوں کہ آزادئ مطلق' کا تصور کسی مہذّب سوسائٹی میں ناقابلِ قبول بھی ہے اور ناقابلِ عمل بھی، ہر شہری کو آزادئ تحریر یا تقریر کا حق اُسی حد تک حاصل ہے کہ جب تک وہ دوسرے شہری کے حقوق سے متصادم نہیں ہوتا اور جس نازک مرحلے پر اس کا یہ حق کسی دوسرے شخص کے حقوق سے ٹکرائے، اس کی آزادی وہیں پر ختم ہو جاتی ہے۔ میں ایک مثال کے ذریعے اس قانونی نکتے کی وضاحت کروں گا تاکہ پڑھنے والوں پر میرا مقصد اچھّی طرح واضح ہو جائے۔ ایک ہندوستانی نے کہیں سے یہ سُنا تھا کہ انگلستان میں لوگوں کو ہر قسم کی آزادی حاصل ہے، وہ جو چاہیں کریں اور جس طرح زندگی گذارنا چاہیں کسی کو مداخلت کا حق حاصل نہیں ہے۔ ایک دفعہ اِن حضرت کو انگلستان جانے کا موقع ملا، اور انہوں نے وہاں کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اپنی آزادی کا مظاہرہ کرنا چاہا۔ وہ کچھ دیر سڑکوں پر اُچھلتے رہے، خوب زور زور سے

قہقہے لگاتے رہے۔ اور جب کسی نے ان کا نوٹس نہ لیا، تو ان کے حوصلے بڑھ گئے اور انہوں
نے دائیں بائیں ہاتھ چلانا شروع کیا، اتفاق سے ایک بوڑھا انگریز سامنے آرہا تھا اور مستی
کے عالم میں ہندوستانی سیاح کا ہاتھ انگریز کی ناک کے ساتھ ٹکرا گیا۔ انگریز نے اس کا ہاتھ پکڑ
کر قریب کھڑے پولیس والے سے مخاطب ہو کر کہا کہ یہ شخص بدمست ہے۔ اسے گرفتار کر لو۔
ہندوستانی نے انگریز اور پولیس والے دونوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ میرا کچھ نہیں بگاڑ
سکتے، کیوں کہ میں نے سُنا ہے کہ اس ملک میں ہر شخص کو مکمّل آزادی ہے اور میں نے تو صرف
اپنے ہاتھ ہلانے کا حق استعمال کیا ہے۔ پولیس والے نے ہندوستانی کو جو جواب دیا وہ بلیغ
بھی ہے اور معنیٰ خیز بھی، اُس نے کہا " اے حضرت! آپ کی آزادی وہیں ختم ہوتی ہے جہاں کسی
دوسرے شخص کی ناک شروع ہوتی ہے۔" آزادی کی یہ تعریف ہر لحاظ سے مکمل اور جامع ہے اور
آزادئ تحریر و تقریر کا استعمال کرنے والے ہر شخص کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ دوسرے
کی ناک کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ ہمارے ملک کے بہت سے اخبار نویسوں کو اپنے حقوق کا
احساس تو ہے لیکن دوسرے لوگوں کی ناک کا اندازہ نہیں اور اسی لئے بہت سے اخبارات
آئے دن اپنے حقوق سے تجاوز کر کے کچھ لوگوں کی ناک چھو لیتے ہیں اور چونکہ صحافت کے
پیشے کے لئے کسی ڈگری، لائسنس یا تجربے کی ضرورت نہیں پڑتی، اس لئے بہت سے ان پڑھ،
اخلاقی مجرم اور مریض ذہن رکھنے والے بھی اس مملکت میں داخل ہو گئے ہیں جو آزادئ تحریر کا
ناجائز استعمال کر کے بے زبانوں، بے گناہوں اور بے ضرر انسانوں کو بلیک میل کرتے ہیں۔
اخبار نویس کی حیثیت سے چراغ بیگ اس ضابطۂ اخلاق کا پابند ہے کہ جو اخبار نویسوں کے
درمیان مروّج ہے اور جس کی رو سے کسی اخبار نویس کو دوسرے اخبار نویس کی بُرائی کرنے
سے حتی الامکان پرہیز کرنا چاہیئے۔ لیکن بہت سے لوگوں نے شکایت کی ہے کہ بعض اخبار
والے صرف انہیں بلیک میل کرنے کے لئے ان کے خلاف غلط الزامات اور بیانات کی تشہیر
کرتے ہیں، اور یہ ایک ایسی صورتِ حال ہے کہ اس کے خلاف ہر دیانت دار صحافی کو احتجاج
کرنا چاہیئے۔ صحافت ایک مقدّس اور باوقار پیشہ ہے اور اس کا تقدّس بہرحال قائم رہنا
چاہیئے۔ میں ایک اخبار نویس اور ایک عام شہری کی حیثیت سے اپنے پڑھنے والوں کو آگاہ

کرنا چاہتا ہوں کہ اخبارات کی بلیک میلنگ اور غلط بیانی کے خلاف انہیں کچھ قانونی تحفظات حاصل ہیں اور اگر کوئی اخبار نویس ان کی عزت اور شہرت کو نقصان پہنچاتا ہے تو وہ اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر کے اسے قید اور جرمانے کی سزا دلا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ اخبار میں شائع شدہ مواد من گھڑت فرضی یا بنیادی طور پر غلط ہو، تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۵۰۰ کی رُو سے کسی شخص کے خلاف اشارتاً یا کنایتاً غلط بیانی کر کے اس کی شہرت کو نقصان پہنچانا جرم ہے اور جن دوستوں کو جائز طور پر اس بات کی شکایت ہو کہ کسی اخبار نویس نے اپنی آزادیٔ تحریر کی حدود سے تجاوز کر کے ان کی عزت اور شہرت کو مجروح کیا ہے۔ انہیں بغیر کسی تامّل کے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہیئے، جو لوگ خاموشی سے اپنی بدنامی اور بے عزتی کا زخم برداشت کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں بجا طور پر یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے خلاف شائع ہونے والے الزامات صحیح ہیں۔ اور اس لئے وہ خاموش ہیں، ورنہ ہر باعزت اور دیانت دار شہری اور سرکاری ملازم سے یہ توقع رکھی جائے گی کہ وہ اپنی عزت اور شہرت پر حرف نہیں آنے دے گا۔ ایک اخبار نویس کی حیثیت سے مجھے جہاں اپنے حقوق کا احساس ہے، وہاں دوسروں کے حقوق کا بھی اندازہ ہے اور اس لئے میرے لکھنے کی میز پر ہتک عزت سے متعلق قوانین اور مقدمات کی تقریباً سبھی اہم کتابیں موجود ہیں۔ اور میں اس بات کا خیال رکھتا ہوں کہ کہیں میرے قلم سے کوئی ایسی غلط یا خلافِ واقعہ بات نہ نکلے کہ جس سے میں قانون کی زد میں آسکوں یا آئین کی حدود سے تجاوز کر جاؤں۔ باوجود اس کے کہ میں نے بہت سی شہرتیں بگاڑی اور بہت سی پگڑیاں اُچھالی ہیں، میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کبھی کسی غلط یا خلافِ واقعہ بات کا سہارا لے کر کسی کی عزت اور شہرت کو مجروح نہیں کیا ہے۔ میں جو کچھ لکھتا ہوں۔ واقعات کی چھان بین کر کے اور پوری ذمہ داری کے ساتھ لکھتا ہوں۔ میں "آئینہ" میں شائع ہونے والے ہر لفظ کے لئے اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھتا ہوں، اور اس لئے ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ میرے قلم سے کوئی 'بے گناہ' مجروح نہ ہونے پائے، میری اس کوشش سے میرا اور "آئینہ" دونوں کا اعتبار بڑھ گیا ہے اور ایک صحافی کی حیثیت سے یہی میری دولت ہے۔ میں غلط بیانات، جھوٹے الزامات اور فرضی شکایات شایع کر کے کسی کی عزت یا شہرت کو نقصان پہنچانے کے خلاف ہوں اور نہ کسی شخص کو یہ حق ہے دونگا کہ وہ میرے خلاف غلط اور بے ہودہ الزامات لگا کر میری شہرت کو زک پہنچانے کی کوشش کرے۔

(۷ر اکتوبر ۶۲ء)

نوجوان سیاست دانوں کے نام!

گزشتہ ماہ گلمرگ میں لیزرلے ساہنی پروگرام کے تحت نوجوان طلبار کے لئے ایک نوروزہ تربیتی کیمپ کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں ملک کی دوسری ریاستوں کے علاوہ کشمیر سے بھی دس طالب علم شامل ہوئے تھے۔ نوروزہ پروگرام میں سیر و تفریح کے علاوہ اہم سیاسی اور علمی موضوعات پر تقریریں اور مباحثے بھی شامل تھے اور اس غرض کے لئے ملک کے مقتدر دانشوروں اور صحافیوں کو اہم موضوعات پر لیکچر دینے کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔ کیمپ کی آخری دو نشستوں میں خاکسار کو بھی جمہوریت اور انتخابات اور جمہوری معاشرے میں صحافت کا رول کے عنوان سے دو عدد تقریریں جھاڑنے کا موقع فراہم کیا گیا تھا۔ تقریروں کے خاتمے پر نوجوان طلبار کو مقرر سے سوالات پوچھنے کی اجازت دی جاتی تھی اور مجھ سے پوچھے گئے سوالات سے میں نے یہ اندازہ کر لیا کہ میرے پیش روؤں پر کیا گزری ہوگی۔ کیمپ کے منتظمین نے مجھے بتایا کہ سوال پوچھنے میں کشمیری نوجوان باقی تمام ساتھیوں کے مقابلے میں آگے تھے اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ انہیں پہلی بار ایک آزادانہ ماحول میں سوال پوچھنے کا موقع مل رہا ہے۔ اور اس لئے وہ اپنی اس آزادی کا بھرپور استعمال کرنا چاہتے تھے۔ میں ذاتی طور پر سوال پوچھنے کی عادت کو ایک صحت مند رجحان سے تعبیر کرتا ہوں، اور اس بات کی حوصلہ افزائی کرتا ہوں کہ نوجوان زیادہ سے زیادہ سوال پوچھیں، مجھے اس نوجوان سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی کہ جس میں سوال پوچھنے کا حوصلہ نہ ہو۔ اس لئے مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ کشمیری طالب علموں نے

ہر قسم کے سوال پوچھ کر فاضل مقررین کا ناک میں دم کر دیا۔ لیکن نوجوانوں سے بات چیت کے دوران مجھے اس تکلیف دہ حقیقت کا بھی احساس ہوا کہ ہمارے اکثر نوجوان سوال پوچھنے کی ہمّت تو رکھتے ہیں لیکن جواب سُننے کا حوصلہ یا سلیقہ نہیں رکھتے، عام طور پر ایسا ہوا کہ جب اُنھوں نے سوال پوچھا تو وہ اپنا 'پسندیدہ' جواب نہ پا کر جواب دینے والے سے خفا ہو گئے، اور کئی بار ایسا بھی ہوا کہ وہ سوال پوچھ کر جواب میں دلچسپی کھو بیٹھے اور جب ان کے سوال کا جواب دیا جا رہا تھا تو وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ گویا سوال پوچھنا ہی ان کا مقصد اور ان کی منزل ہے۔ میں اس عادت، رجحان اور رویّے کو نوجوانوں کی ذہنی نشو و نما کے لئے مفید نہیں سمجھتا، لیکن میری نوٹس میں اس سے بھی زیادہ قابلِ اعتراض بات آئی کہ جس کا تذکرہ کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔

مجھے بتایا گیا کہ کشمیر سے تعلق رکھنے والے اکثر طالب علموں نے مقرّرین سے کشمیر کی سیاست کے متعلق سوال پوچھے اور ان میں سے اکثر سوالات آئینِ ہند کی دفعہ ۳۷۰ کے گرد گھومتے رہے۔ دفعہ ۳۷۰ کو کیوں ختم کیا جا رہا ہے؟ دفعہ ۳۷۰ سے ثابت ہوتا ہے کہ کشمیر اور ہندوستان کا الحاق عارضی ہے پھر ہندوستان اپنے آئین کا احترام کیوں نہیں کرتا؟ دفعہ ۳۷۰ کو ختم کرنے کی تہہ میں کون سا مقصد کارفرما ہوتا ہے؟ یہ اور اسی قسم کے درجنوں متعلق اور غیر متعلق سوالات، دفعہ ۳۷۰ آئینِ ہند کی ایک اہم ترین دفعہ ہے اور اس کا تعلق چوں کہ براہِ راست کشمیر سے ہے، اس لئے کشمیری طالب علموں کی اس سے گہری دلچسپی کا جواز سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن ایک دن ایک مقرّر کو شرارت سوجھی اور اس نے سوال کرنے والے نوجوانوں سے یہ سوال پوچھا کہ "دفعہ ۳۷۰ کیا ہے؟" اس کی وضاحت کیجئے۔" بس پھر کیا تھا۔ سب کو سانپ سونگھ گیا۔ قینچی کی طرح چلنے والی زبانیں یکلخت خاموش ہو گئیں۔ اور ہمارے نوجوان ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ معلوم ہوا کہ سوال کرنے والے غازیوں میں سے کسی نے ایک بار بھی دفعہ ۳۷۰ کا مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ اُنھوں نے سیاسی جلسوں میں لیڈروں کی زبان سے اور اخبارات میں اس کا چرچا سُنا تھا، اور یہی اُن کا منبعِ علم تھا۔ اور اب

جب اُن سے پوچھا گیا کہ اس دفعہ میں درج کیا ہے تو وہ گونگوں اور بہروں کی طرح ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگے۔ مجھے بتایا گیا کہ اس کے بعد کسی نے دفعہ ۳۷ کے متعلق کوئی سوال نہ پوچھا۔ ایک دوسری نشست میں علی گڑھ یونیوسٹی ترمیمی ایکٹ کا ذکر آیا۔ اور ہمارے نوجوانوں نے ایکٹ پر تابڑ توڑ حملے کئے اور حکومتِ ہند پر یونیورسٹی کے مسلم کردار کو ختم کرنے کا الزام عائد کیا۔ فاضل مقرّر نے ایک بار پھر طالب علموں سے یہ دریافت کیا کہ آیا اُنہوں نے اس بل کا مطالعہ کیا ہے؟ تو معلوم ہوا کہ ایک بھی غازی نے بل کا تفصیلی مطالعہ تو کیا، اس کے خصوصی فیچرس جاننے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ وہ صرف اخبارات میں شایع ہونے والے ان احتجاجی جلسوں اور جلوسوں سے ہی 'فیضان' حاصل کرتے رہے تھے اور نتیجہ یہ کہ حریف کے پہلے ہی وار میں گھائل ہو کر گر پڑے۔ اِن دو مثالوں سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ ہمارے نوجوان اتنے تن آسان اور جذباتی واقع ہوئے ہیں کہ وہ کسی مسئلے پر خود تحقیق یا تفتیش کرنے کی بجائے صرف نعروں سے گمراہ ہو جاتے ہیں۔ وہ کسی مسئلے پر اپنی رائے قائم کرنے سے پہلے اس کے متعلق ضروری واقفیت حاصل کرنے کو ضروری نہیں سمجھتے۔

ایک اور واقعہ سُن لیجئے۔ پچھلے ہفتے ایک شام کو ایک وزیر کے ہاں ایک درجن کے قریب نوجوان، وزیر موصوف کے ساتھ اعلیٰ سطح پر سیاسی، معاشی اور تعلیمی مسائل پر بحث میں مصروف تھے کہ چراغ بیگ بھی وہاں پہنچ گئے۔ بحث بڑی سنجیدہ نوعیت کی تھی اس لئے میں خاموشی سے سُنتا رہا۔ بات بڑھتے بڑھتے سیاست، الحاق اور حق خود ارادیت تک پہنچ گئی۔ وزیرِ موصوف نوجوانوں کو "حقیقت پسندی" کا درس دے رہے تھے، اور نوجوان وزیرِ با تدبیر کو حق خود ارادیت کا۔ میں نوجوانوں کے ذوق و شوق اور جذب و جنون سے بے حد متاثر ہو رہا تھا کہ بات اقوام متحدہ تک پہنچی، ایک نوجوان نے جو ایل، ایل، بی، پاس ہیں بڑے اعتماد سے کہا کہ ہم اپنا مطالبہ اقوام متحدہ میں لے جائیں گے۔ میں نے اُن کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے کہا کہ اقوام متحدہ افراد کی شکایت پر غور کرنے کی مجاز نہیں، وہاں صرف ممبر سٹیٹس (states) کی شکایت ہی

غور ہو سکتا ہے۔ میرے قانون داں دوست میرے خیال سے متفق نہ ہو سکے اور مجھے اس بات پر قدرے تعجب ہوا کہ وہاں موجود اکثر دوستوں نے میری ہی بات کو غلط سمجھا۔ بات اقوام متحدہ کے چارٹر کی ہو رہی تھی اور میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ ان میں سے ایک نوجوان نے بھی اس چارٹر کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔

میں اس صورتحال کو تشویشناک سمجھتا ہوں کہ نوجوانوں کی ایک پوری نسل سیاست، پولٹیکل سائنس اور تاریخ کے مبادیات سے واقفیت کے بغیر ہی سیاست، تاریخ، تہذیب اور بین الاقوامی تعلقات کے اہم موضوعات اور مسائل پر اپنے فیصلے صادر کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے نوجوانوں کے ذہن "ادھ کچے"، ان کی فکر نابالغ اور ان کا شعور خام رہے گا اور وہ شاعرِ مشرق کے اس شعر کی تفسیر بنے رہیں گے۔

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسوں میں
نہ ادائے کافرانہ ، نہ تراش آذرانہ

میں سیاست سے دلچسپی رکھنے والے سبھی طالب علموں اور نوجوانوں سے گزارش کروں گا کہ تاریخ، جغرافیہ، اقتصادیات، معاشیات، عمرانیات اور سائنس کی طرح سیاست بھی ایک علم ہے اور اس میں دسترس حاصل کرنے کے لئے محنت ہی نہیں ریاضت بھی کرنا پڑتی ہے۔ آپ اگر اچھے سیاست داں بننا چاہتے ہیں تو آپ کو کسی مسئلے پر حتمی رائے قائم کرنے سے پہلے اس مسئلے کے ہر پہلو پر غور کرنا چاہیئے۔ اور اس کے متعلق ہر ممکن جانکاری حاصل کرنا چاہیئے۔ نصیحت کرنا نہ میرا پیشہ ہے نہ میرا منصب، لیکن بقولِ اقبال ؎

اچھا ہے دِل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

(۱۵ر اکتوبر ۷۲ء)

شہری اور دیہاتی فتنہ

عید کی تقریب پر وزیر اعلیٰ سید میر قاسم کی طرف سے دیئے گئے عصرانے میں چراغ بیگ کی ملاقات ایک صاحبِ دستار شہری بزرگ سے ہوئی۔ بزرگ موصوف نے موسم کی نامہربانی، اشیائے خوردنی کی گرانی، بجلی کی نایابی اور بالن کی کامیابی کا مفصل احوال سُنا کر سرگوشی کے انداز میں کہا کہ دیکھئے ہم شہر کے لوگوں پر اب کیا وقت آن پڑا ہے۔ اُوپر سے نیچے تک دیہاتیوں کی ہی حکومت ہے۔ وزیر اعلیٰ بھی دیہاتی، ساری کی ساری کابینہ دیہاتی، سیکریٹری جنرل ڈیپارٹمنٹ، ہوم سیکریٹری، ڈی آئی جی، ڈائریکٹر فوڈ اور الّم غلّم سب افسر دیہاتی ہیں۔ ایک دن شہر کے لوگ اتنے ذلیل ہو جائیں گے، یہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ابھی بیس پچیس سال پہلے کی بات ہے کہ دیہاتیوں کو شہر آتے ہوئے ڈر لگتا تھا اور آج دیکھئے کہ ساری حکومت پر چھائے ہوئے ہیں۔

"کیوں ہے نا ٹھیک بات؟" بزرگ موصوف نے مجھے شہری سمجھ کر رازدارانہ لہجے میں، میری تصدیق چاہی۔

"بالکل، اور اسی کو انقلاب کہتے ہیں"۔ میں نے بزرگ موصوف کی تائید تو کی لیکن ساتھ ہی اُنہیں یہ بھی بتا دیا کہ میں بھی دیہاتی ہوں۔ میرے اس انکشاف سے میرے بزرگ دوست کچھ پریشان سے ہو گئے اور کہنے لگے کہ "میں تو صرف حقیقتِ حال بیان کر رہا تھا۔ کیوں ہے نا ٹھیک بات؟"

بعض لوگوں کے لئے مذہبی تعصب، فرقہ پرستی، علاقائی عصبیّت اور مردم بیزاری، روحانی غذا کا درجہ رکھتی ہے اور یہ لوگ کہیں نہ کہیں سے اپنی غذا حاصل کرتے رہتے ہیں۔ مذہبی تعصّب، علاقائی عصبیّت اور اسی نوع کی دوسری قسم کی فرقہ پرستیوں سے جی بہلا کر اب کچھ لوگوں کو شہری اور دیہاتی کا فرق محسوس ہونے لگا ہے۔ اور اسی لئے کچھ بزرگوں کو ہر جھاڑی کے پیچھے ایک شیر نہیں ایک دیہاتی نظر آرہا ہے۔

(۱۵ر نومبر ۷۲ء)

والدہ مرحومہ کی یاد

ماں کی سب سے بڑی خوبی اور خوبصورتی اس کا ماں ہونا ہے۔ وہ صرف ہمیں جنم ہی نہیں دیتی، بلکہ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک بے پناہ اور بے لوث محبّت کے خزانے لُٹا کر ہماری پرورش بھی کرتی ہے۔ وہ ساری عمر ہماری خوبیوں کی تشہیر اور بُرائیوں کی توجیہہ کرتی رہتی ہے اور اس کی نگاہوں میں ہم ہمیشہ کمسن، ناتجربہ کار اور معصوم ہی رہتے ہیں۔ ماں کے منصب کی عظمت اور اس کی محبّت کی گہرائی کا اندازہ کرنے کے لئے ابھی تک الفاظ یا اظہار کا کوئی ایسا پیمانہ ایجاد نہیں ہوا ہے کہ جس میں اس کی ساری بلندیاں، وسعتیں، پاکیزگی اور خلوص سما سکیں۔ آنحضرت صلعم نے والدین کے مرتبے کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ان کے پاؤں تلے تمہاری جنّت ہے۔ حضور کے اس ارشاد سے ماں باپ کے منصب کا اندازہ ہوتا ہے، لیکن ماں کی محبّت کی گہرائی اور گیرائی گرفت میں نہیں آتی۔ باپ کا اپنے بیٹے یا بیٹی کو اپنی محبّت اور وراثت سے محروم کرنے کے واقعات اور حادثات آئے دن رونما ہوتے ہیں لیکن کسی ماں کا اپنی اولاد کو اپنی شفقت اور محبّت سے محروم کرنے کا واقعہ آج تک میرے علم میں نہیں ہے۔ ہاں ناخلف، نافرمانبردار اور نالائق بیٹوں کے ہاتھوں اپنی ماؤں کی بے عزتی اور بے حُرمتی کے کئی سانحات میری نوٹس میں آتے ہیں۔ اور مجھے اس بات کا بھی علم ہے کہ اس کے باوجود ماں کی محبّت اور شفقت میں کوئی فرق یا کمی واقع نہیں ہوئی۔ یہ تاریخی یا تعلیمی واقعہ تو سب نے سُنا ہوگا کہ جب ایک نوجوان اپنی

محبوبہ کی خواہش پوری کرنے کے لئے اپنی ماں کا کلیجہ کاٹ کر لے جارہا تھا۔ اور بدحواسی میں ٹھوکر کھا کر گر پڑا تو ماں کے کلیجے سے بے اختیار یہ آواز نکلی کہ "بیٹا کہیں چوٹ تو نہیں آئی۔" قطع نظر اس کے کہ یہ واقعہ صحیح ہے یا غلط، اس سے ماں کی محبّت اور شفقت کا اندازہ کرنے میں مدد ملتی ہے۔

ماں کی محبت اور عظمت کے اس ذکرِ جمیل کی شانِ نزول یہ ہے کہ میں اس ماہ کی ۸ر اور ۹ر تاریخ کی درمیانی شب کو اپنی بے پناہ محبّت کرنے والی ماں کے سائے سے محروم ہوگیا۔ وہ جب تک زندہ تھیں میں نے ان کے وجود کی عظمت اور اہمیّت پر کبھی غور ہی نہیں کیا۔ لیکن جب وہ بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موت کی آغوش میں سوگئیں تو مجھے یکلخت یہ احساس ہوا کہ موت نے مجھ سے کتنی بڑی دولت، کتنا عظیم سرمایہ چھین لیا ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ جب تک کوئی چیز اسے حاصل رہے، وہ اس کی قدر وقیمت سے بے خبر یا بے نیاز رہتا ہے، لیکن جونہی وہ اس سے محروم ہوجائے، اسے اس کی اہمیت اور افادیت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ جب تک ماں زندہ تھیں، میں ان کی محبّت اور مروّت، شفقت اور رفاقت کو ایک معمولی حقیقت سمجھ کر اس سے غافل رہا۔ اور آج جب ماں حقیقت سے افسانہ بن گئی ہیں۔ تو مجھے یہ احساس ہورہا ہے کہ میں نے کسی دولتِ نایاب اور متاعِ گرانمایہ سے ہاتھ دھویا ہے۔ وہ میری ماں ہی نہیں میرا باپ بھی تھی۔ سولہ سال کی عمر میں سر سے باپ کا سایہ اُٹھ جانے کے بعد ماں ہی نے میری اور میری بہنوں کی پرورش کا بوجھ سنبھالا اور میرے لئے یہ بات باعثِ تسکین بھی ہے اور قابلِ فخر بھی کہ وہ اپنی تمام ذمہ داریوں کو بطریقِ احسن نبھا کر اپنے آخری سفر پر روانہ ہوگئیں۔ میں آج جو کچھ ہوں، ان کی بدولت ہوں۔ اور مجھے اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ میرے ذہن، میری فکر اور میری شخصیت کی تعمیر میں ماں کا پسینہ ہی نہیں اُس کا لہو بھی شامل ہے۔ باپ کی موت کے بعد جب دنیا نے بے کار اور بے آسرا سمجھ کر مجھ سے نگاہیں پھیر لیں، تو ماں نے اپنی محبت اور شفقت کی آغوش وا کر کے میرے سارے دُکھ درد سمیٹ لئے، وہ

ایک معمولی سکول ٹیچر تھیں اور ان کی کل تنخواہ ایک سو دس روپے یا اس کے لگ بھگ تھی، لیکن وہ ایک سپاہی، ایک مجاہد اور ایک کوہ پیما کا دل اور عزم بھی رکھتی تھیں۔ اِس لئے انہوں نے اپنی غربت، لاچاری اور مجبوری کو کبھی اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں حائل نہیں ہونے دیا۔ ۱۹۵۹ء میں بی۔ ایس۔ سی کے امتحان میں دوبارہ فیل ہونے کے بعد جب میں نے علی گڈھ جانے کا ارادہ کیا تو انہوں نے میری حوصلہ شکنی کی بجائے میری حوصلہ افزائی کی اور وہ مجھے ہر ماہ باقاعدگی سے پچاس روپے بھیجتی رہیں۔ اپنی تنخواہ میں سے نصف رقم بھیج کر وہ خود کس طرح گذارہ کرتی ہوں گی اس کے تصوّر سے میں کانپ اُٹھتا ہوں۔ لیکن ماں نے ایک بار بھی مجھ سے اپنی مشکلات اور اپنے مصائب کا ذکر نہیں کیا۔ وہ میرے ہر عزم اور ہر ارادے میں شریک رہتی تھیں۔ اور انہوں نے اپنی عافیت یا سلامتی کے لئے کبھی میرے AMBITION کی راہ میں حائل ہونے کی کوشش نہیں کی۔ ۱۹۶۲ء میں جب میرے سر میں سرکاری ملازمت چھوڑ کر وکالت پڑھنے کا سودا سمایا تو میرے بہت سے ہمدردوں اور بہی خواہوں نے مجھے یہ "خطرناک" قدم اُٹھانے سے باز رکھنے کے لئے میری ماں سے رجوع کیا اور انہیں بتایا کہ میں کس طرح گزیٹڈ افسری کا محفوظ راستہ چھوڑ کر وکالت کے بیابانوں میں خودکشی کا ارادہ کر رہا ہوں۔ ماں ان نجومیوں کی پیش گوئیوں سے خوفزدہ ہو کر گھبرا گئیں اور مجھے دو سال تک اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ لیکن جب انہیں اس بات کا احساس ہو گیا کہ سرکاری ملازمت کے پنجرے میں میری روح کو ایک لمحہ بھی سکون نہیں مل رہا ہے، تو انہوں نے مجھے بخوشی ملازمت چھوڑ کر وکالت پڑھنے کی اجازت دی۔

ماں کا تعلق تحصیل کولہ گام میں ناسنور نام کے ایک گاؤں سے تھا۔ اور وہ ایک بہت ہی غریب کسان کی بیٹی تھیں۔ میرے والد نے اس غریب دیہاتی لڑکی سے شادی کر کے اپنے سارے خاندان کو مایوس کر دیا تھا اور ان کے والد مولوی محمد عبداللہ وکیل کے سوا کوئی اس رشتے سے خوش نہ تھا۔ والد صاحب نے اپنی جوانی کی ترنگ اور جذبات کے جوش میں اپنے خاندان سے تو بغاوت کر لی، لیکن میری ماں

کو ساری عمر اِس بغاوت کی قیمت چُکانا پڑی۔ مولوی محمد عبداللہ کا تعلیم یافتہ، روشن دماغ اور آسودہ حال خاندان اِس غریب لڑکی کو اپنی صفوں میں جگہ دینے پر رضامند نہ تھا اور اس نے آخری لمحے تک اپنی مزاحمت جاری رکھی۔ یہ بات والدِ مرحوم کے حق میں کہی جاسکتی ہے کہ اُنھوں نے 'خاندانی وقار' کی اس کشمکش میں آخری دم تک اپنی رفیقۂ حیات کا ساتھ دیا۔ اور میری ماں کو کبھی اپنے فیصلے پر ندامت یا افسوس کا احساس نہ ہوا۔ ماں طبعاً بہت نیک سیرت، منکسر المزاج اور سادہ طبیعت کی تھیں۔ اور ان کی زبان سے میں نے کبھی شکوے یا شکایت کا کوئی لفظ نہیں سُنا ہے۔ وہ سخت مذہبی تھیں اور اپنی زندگی کے آخری ایّام تک پابندی سے نماز پنجگانہ ادا کرتی رہیں۔ بیماری کی وجہ سے جب ان کے روزے چھوٹ گئے تو انہیں اس کا بیحد افسوس ہوا اور وہ اپنے پہننے کے کپڑے خیرات کر کے اس محرومی کی تلافی کرتی رہیں۔" وہ ناسنور (یہ سارا گاؤں ہی قادیانی ہے) سے تعلق رکھنے کی بنا پر بہت دِنوں تک احمدی عقائد سے متاثر تھیں، لیکن کچھ میری محنت اور کچھ ان کی بصیرت نے آخر میں انہیں اس حقیقت سے روشناس کر دیا تھا کہ مسلمان ہونا احمدی اور غیر احمدی، اہل حدیث، حنفی اور مودودی ہونے سے بہتر ہے۔" یہ ان کی مذہبیّت، ان کے ایمان اور ان کے اعتقادات ہی کا کرشمہ تھا کہ بے شمار مایوسیوں اور محرومیوں کے باوجود ان کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہیں آئی اور وہ آخری دم تک نامساعد حالات سے لڑتی رہیں۔ ماں صرف آٹھویں جماعت تک پڑھی تھیں، لیکن مجھے حیرت ہے کہ انہیں اپنے ماحول سے لڑنے اور زندگی کی تلخ حقیقتوں کو سمجھنے کا حوصلہ کہاں سے ملا تھا۔ وہ بے حد نیک، غریب پرور اور ہمدرد عورت تھیں اور ان سے کسی کا دُکھ نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ انہیں دوسروں کے دُکھ دُور کرنے میں سُکھ ملتا تھا، وہ اپنے غریب رشتہ داروں کا بے حد احترام کرتی تھیں، اور مجھے اکثر نصیحت کیا کرتی تھیں کہ بُلندیوں کی طرف جاتے ہوئے اُن پستیوں کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ جہاں سے تم نے اپنا سفر شروع کیا ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ زیادہ دِنوں کے لئے کسی سے ناراض یا بدگمان نہیں رہ سکتی تھیں۔ جن لوگوں نے اُسے بے حد تکلیفیں دی

تھیں وہ بھی اگر ایک بار ان سے مسکرا کر بات کرتے تو وہ سب کچھ بھول جاتی تھیں۔ کسی کو کوئی دکھ یا غم ہو وہ بے قرار ہو جاتیں اور اکثر ان کی آنکھیں نم ہو تیں۔ مجھے اس بات کا اطمینان ہے کہ اُن کی موت کے بعد، اُن کا ایک بھی جاننے والا نہیں ہے کہ جس کو اُن سے کوئی شکایت یا بدگمانی ہو۔ ۲۰ نومبر کو میرے پاس دلّی آنے سے پہلے اُنھوں نے اپنے سبھی عزیزوں، رشتے داروں اور جاننے والوں سے باضابطہ طور پر رخصت لی تھی، اپنے سارے زائد کپڑے غریبوں میں تقسیم کروائے تھے۔ اور جن لوگوں سے وہ ناراض یا بدگمان تھیں اُن سے خاص طور پر ملنے کے لئے گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنی موت کا علم تھا اور وہ اپنے سینے پر کوئی بوجھ لے کر اپنے آخری سفر پر نہیں جانا چاہتی تھیں۔ انہیں حج بیت اللہ پر جانے کی بے حد خواہش تھی اور اس سال میں نے ان کی یہ خواہش پوری کرنے کا بھی ارادہ کر لیا تھا۔ افسوس کہ ان کی موت نے ان کی یہ آخری خواہش پوری کرنے کا موقع نہ دیا۔

انہیں اس بات کا اندیشہ تھا کہ ان کی موت کے وقت میں ان کے پاس موجود نہ ہوں گا۔ وہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ میری موت کے وقت نہ معلوم تم مجھ سے کتنی دور ہوگے، خدا کا شکر ہے کہ ان کی زندگی کے آخری ایّام میں مجھے ان کی خدمت کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اور آخری سانس لیتے وقت میں ان کے سرہانے موجود تھا۔ موت سے صرف چند لمحے قبل ماں نے اشارے سے مجھے اپنے قریب بُلا کر میرے رخسار چوم لئے اور اس طرح میری حقیر سی خدمت کا معاوضہ ادا کر کے اپنے مولا سے جا ملیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

(۱۵ر دسمبر ۷۲ء)

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

چراغ بیگ اڑھائی مہینے کی دشت نوردی اور آوارہ گردی کے بعد وطن لوٹا، تو اُسے یوں محسوس ہوا کہ ساری دنیا میں تغیر، تبدیلی اور حرکت کی اُتھل پتھل کے باوجود کشمیر میں زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے، ہر چیز نہ صرف اپنی جگہ پر کھڑی نظر آتی ہے بلکہ اس پر گرد و غبار کئی تہیں جمی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین کا یہ حصّہ ساری کائنات سے الگ، بادِ نسیم کے ہلکے ہلکے جھونکوں کے زد سے بھی محفوظ ہے۔ چاروں طرف خاموشی ہے۔ قبرستان کی سی خاموشی، دلوں کا درد، بدن کی کسک، رُوح کے زخم، زبان کے چھالے، چہرے سے کسی قسم کا کوئی تاثر ظاہر نہیں ہوتا، جیسے ساری دنیا کا صبر میرے ہی وطن کے لوگوں کو مل گیا ہو، ہر بات سننے کی قوت، ہر فریب کھانے کا حوصلہ، ہر زخم سہنے کا یارا اور سب کچھ دیکھ کر آنکھیں بند کرنے کی عادت، اس میں یقیناً ہمارا کوئی جواب نہیں۔ اور اسی لئے ہمیں ایک جیسے لیڈر، واعظ اور حاکم نصیب ہیں۔

کشمیر آتے ہوئے چراغ بیگ کچھ دنوں کے لئے جموّں رُک گیا، جہاں ان دنوں ریاستی اسمبلی کا بجٹ اجلاس منعقد ہو رہا ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ جموّں میں کسی شخص کو اسمبلی کے اجلاس سے کوئی دل چسپی نہیں، میں جس وقت کارروائی کا مشاہدہ کرنے کے لئے گیا تو ایوان میں وزیر خزانہ گردھاری لال ڈوگرہ کے سوا کوئی وزیر دکھائی نہ دیا۔ ممبرانِ اسمبلی کسی مقامی ہفت روزہ کے خلاف مراعتِ شکنی کی تحریک پر بڑی زوردار تقریریں جھاڑ رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی اجلاس کی اس روز کی کارروائی ختم ہوگئی، جموّں میں

مختصر سے قیام کے دوران یہ اندازہ ہوگیا کہ اگرچہ آئینی طور پر سید میر قاسم ہی ریاست کے وزیر اعلیٰ قرار پائے ہیں، لیکن ریاست کے اس حصّے پر پنڈت ترلوچن دت کا ہی راج ہے اور کم از کم جموّں کے معاملات میں، ان کا حکم اور ان کی مرضی قانون کا درجہ رکھتے ہیں قاسم صاحب نے بغیر کسی مزاحمت، مخاصمت اور مدافعت کے پنڈت جی کی سرداری قبول کر کے غیر ضروری تناؤ اور تصادم کے امکانات ختم کر دیئے ہیں۔ پنڈت جی کے متعلق یہ معلوم ہوا کہ جموّں کی علاقائی شخصیت کے نام پر بے ایمان، بدکردار اور بدعنوان افسروں کو تحفظ اور ترقی دینے میں انہیں کوئی عار محسوس نہیں ہوتا۔ اور اس نیک کام میں انہیں جن سنگھ کی ہمدردی اور اشتراک حاصل ہے۔ سیاسی سطح پر پنڈت ترلوچن دت اپنی سرمایہ داری کا سہارا لیکر "غریبی ہٹاؤ" اور سوشلزم کے سب سے بڑے علمبردار بنے ہوئے ہیں اور اس وقت وہ بلاشرکتِ غیرے جموّں کے قائدِ اعظم بنے ہوئے ہیں۔ شہر میں آئے دن چھوٹے چھوٹے مطالبات منوانے کے لیے جلسے جلوس منظم کئے جاتے ہیں۔ مظاہرین کو دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کے جرم میں گرفتار کر کے دوسرے دن رہا کیا جاتا ہے۔ اور اس طرح کاروبارِ شوق اور سیاست جاری ہے۔ ریل آجانے سے شہر کی رونق اور کاروباری سرگرمیوں میں کئی گنا اضافہ ہوگیا ہے اور موسم کی مسلسل خرابی کے باوجود جموّں کی رعنائیوں میں کسی قسم کی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔

سری نگر پہنچ کر بے اختیار غالب کا یہ شعر یاد آیا ؎

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کر گھر یاد آیا

نہ کوئی سیاسی سرگرمی، نہ کاروبار کی گرم بازاری اور نہ کسی محرومی کا احساس، بازار میں ضروریاتِ زندگی نایاب مگر نہ کسی کے لب پہ شکایت اور نہ شکوہ، حکومت کا کہیں اتا پتہ نہیں۔ بجلی نہیں ہے، تو لوگ موم بتّی جلا کر گزارہ کر رہے ہیں۔ لکڑی نہیں ہے تو کیا ہوا؟ بہار کی اُمید تو ہے۔ غرض یہاں کے لوگ ہر طرح سے مطمئن اور اپنی تقدیر پر قانع نظر آتے ہیں، اربابِ حکومت کے لیے یہ رویّہ باعثِ اطمینان بھی ہے

اور قابلِ تقلید بھی، لیکن چراغ بیگ کے خیال میں یہ کیفیت ایک پیچیدہ ذہنی اور نفسیاتی بیماری کی علامت ہے۔ ایک بے جان، بے حرارت اور بے روح جسم کی طرح یہ قوم بھی احساس اور ردِعمل کے جذبے سے عاری دکھائی دیتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ظلم، ناانصافی، بے عزتی اور اشتعال انگیزی کے باوجود نہ اس کا ضمیر بیدار ہوتا ہے اور نہ احساس کے آبگینے کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ قوموں کی زندگی میں یہی لمحہ سب سے نازک اور خطرناک ہوتا ہے، یہاں پہنچ کر درد کا احساس بھی مِٹ جاتا ہے اور ظلم کے خلاف احتجاج کی حِس بھی ختم ہو جاتی ہے۔ کیا ہم اپنی زندگی کی اِس منزل پر پہنچ گئے ہیں؟

خدا بھلا کرے سری نگر سے شائع ہونے والے آدھ درجن روزانہ اخبارات کا کہ ان کے دم سے سیاسی دکانداروں کی ریل پیل قائم ہے، ہر روز صفحۂ اوّل پر پانچ دس سیاسی لیڈروں کے بیانات شائع ہوتے ہیں، اور اکثر آزمودہ اور تجربہ کار لیڈر اپنے گھریلو حماموں میں بیٹھ کر گرم گرم چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے آزادی، عزتِ نفس اور حقِ خودارادیت کی لڑائی لڑنے میں مصروف ہیں۔ اور اخبارات کے ذریعے عوام الناس، ان کی جدوجہد، ان کے یقینِ محکم اور ذوقِ عمل سے باخبر رہتے ہیں، اخباری بیان بازیوں کے اس معرکے میں اپنے فخرِ کشمیر میرزا محمد افضل بیگ نے حسبِ معمول اپنے تمام رقیبوں کو پچھاڑ کر رکھ دیا ہے، پچھلے چھ ماہ سے وہ برابر اخباری بیانات کے ذریعے اہلِ کشمیر کو یہ باور دلا رہے ہیں کہ نئی دہلی میں جواہرلال نہرو یونیورسٹی کے وائس چانسلر مسٹر پارتھا سارتھی سے ان کی بات چیت آگے بڑھ رہی ہے۔ نئی دہلی روانہ ہونے سے پہلے اور سری نگر وارد ہونے کے فوراً بعد مقامی اخبارات میں بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ اس مفروضہ بات چیت کی پیش رفت کا احوال شایع ہوتا ہے۔ ابھی تک مرکزی حکومت نے ایک بار بھی سرکاری سطح پر اس بات چیت کے وجود کو تسلیم نہیں کیا ہے لیکن میرزا محمد افضل بیگ کو چونکہ کشمیری عوام کی سادگی اور حماقت پر غیر متزلزل اعتقاد ہے اس لیے اُنہیں اس بات کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ وہ کشمیری عوام نہ سہی، اپنے کارکنوں کو ہی اعتماد میں لے لیتے، کہ آخر کیا بات چیت

ہو رہی ہے ؟ کس کے ساتھ ہو رہی ہے ؟ اور یہ پارتھا سارتھی صاحب ہیں کون ؟
ایک یونیورسٹی کا وائس چانسلر ایک سیاسی مسئلے پر کس حیثیت سے بات چیت کر رہا
ہے، اور آج چھ ماہ سے یہ بات چیت کہاں سے کہاں پہنچی ہے ؟ یہ سب اہم سوالات ہیں۔
لیکن میرزا افضل بیگ کو یقین ہے کہ ان سے کوئی اِن سوالات کے جواب نہیں پوچھے
گا۔ پارتھا سارتھی سے اپنی مفروضہ بات چیت سے گھبرا کر بیگ صاحب کبھی کبھی
ریاستی حکومت کی کارکردگی پر بھی تنقید فرماتے ہیں، تاکہ ریاستی سیاست میں حزبِ
مخالف کی حیثیت سے ان کا وجود بھی قائم رہے۔ اس قسم کا ایک تازہ بیان ابھی بیگ
صاحب نے حال ہی میں اخبارات میں جاری فرمایا ہے، جس میں علاوہ دیگر باتوں کے
فخرِ کشمیر نے ریاستی حکومت پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ اس نے کشمیر میں پنچائتیں
بالکل مفلوج بنادی ہیں۔ اور یہ کہ حکمراں پارٹی کے قول و فعل میں تضاد ہے۔ بیگ
صاحب کا یہ بیان کافی سخت ہے۔ اور قدرتی طور پر مقامی اخبارات نے اسے نمایاں
طریقے پر شایع کیا ہے۔ لیکن میرزا افضل بیگ چراغ بیگ کو معاف کریں گے کہ وہ
اس سخت "مخالف بیان" سے نہ مرعوب ہوئے ہیں اور نہ متاثر کیوں کہ وہ اچھی طرح سے
جانتے ہیں کہ محاذ رائے شماری کے صدر فخرِ کشمیر میرزا افضل بیگ، ریاست کی کسی حزبِ
مخالف جماعت کے سربراہ نہیں، بلکہ سرکاری رعایتوں اور سفارشوں پر چلنے والی
پنکچر شدہ گاڑی کے ڈرائیور ہیں، وہ ریاستی سرکار کو لاکھ آنکھیں دکھائیں اور دھمکیوں
کے ایندھن سے دھواں اُڑانے کی کوشش کریں۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ وہ سرکار کی عنایتوں
تلے اس قدر دبے ہوئے ہیں کہ ان میں سرکار کی مخالفت کا دم نہیں ہے۔ ساری دُنیا
جانتی ہے کہ ڈاکٹروں کے تقرر، انجنیروں کی تبدیلی اور دوسرے ملازمین کی ترقی کے
سلسلے میں جتنی پہنچ بیگ صاحب کی ہے، بڑے بڑے کانگریسی لیڈروں کی بھی نہیں۔ جو
کام، جو سفارش کسی سے نہیں ہوتی، اس کے لئے بیگ صاحب کی ذاتِ گرامی نسخہ کیمیا سے
کم نہیں۔ قاسم صاحب ساری دنیا کو ٹال سکتے ہیں، لیکن بیگ صاحب کی بات نہیں ٹل سکتی۔
معلوم نہیں کہ بیگ صاحب نے اپنے دوستوں، کارکنوں اور رفیقوں کو یہ بات بتائی ہے یا

نہیں، کہ دلیؔ میں ان کے قیام کے دوران انہیں ریاستی حکومت کی طرف سے باقاعدہ ایک موٹر کار اور ایک ڈرائیور کی خدمات حاصل رہتی ہیں، اور یہ غالباً دنیا کی تاریخ میں پہلا واقعہ ہے کہ حق خود ارادیت کی جنگ لڑنے والا ایک جرنیل سرکاری مکان، سرکاری موٹر اور سرکاری ڈرائیور کے ساز و سامان سے لیس ہو کر محاذ پر جاتا ہے اور پھر سری نگر لوٹ کر عوام کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، کہ بیگ صاحب کشمیری عوام کے لئے حق خود ارادیت حاصل کرنے کے لئے مسز گاندی کے نمائندے سے بات چیت کر رہے ہیں، میں اسے معصوم کشمیری عوام کے ساتھ ایک دھوکا اور فراڈ سے کم نہیں سمجھتا، اور مجھے یقین ہے کہ میرزا محمد افضل بیگ کے برادر غلام قادر بیگ کے علاوہ کوئی شخص اس کی تعریف نہیں کر سکتا۔

اس پس منظر میں بیگ صاحب کا ریاستی حکومت کے تئیں تنقیدی رویہ محض ایک دل لگی ہے اور کسی شخص کو اس اداکاری سے دھوکا نہیں لگ سکتا!

(۱۵ر مارچ ۷۳ء)

یہ گلاب بھون ہے

کچھ لوگوں کو عجیب و غریب چیزیں جمع کرنے کا شوق ہوتا ہے مثلاً میرے ایک دوست کو پرانے ٹوٹے ہوئے اور ناقابلِ استعمال تالے جمع کرنے کا شوق ہے، ایک اور صاحب کو قسم قسم کی مرغیاں پالنے کا خبط ہے۔ ایک پروفیسر صاحب کو پھٹے پرانے، چلے ہوئے، بوسیدہ نوٹ جمع کرنے کا جنون ہے۔ کچھ لوگوں کو زمین، بعض کو سونا اور اکثر لوگوں کو روپیہ جمع کرنے کا شوق ہوتا ہے اور ان کی ساری زندگی اس شوق میں گذر جاتی ہے۔ اس ہیچمندان کو چٹکلے اور لطیفے جمع کرنے کا شوق ہے۔ اور اس شوقِ فضول نے صحافتی اور سیاسی دنیا میں بہت سے دوستوں کو اس کا دشمن اور کئی دشمنوں کو اس کا دوست بنا دیا ہے۔ پچھلے دنوں جموّں میں لطیفوں اور چٹکلوں کا ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ جسمیں ریاست کے بڑے بڑے لطیفہ گو، چٹکلے باز اور مسخرے جمع تھے، میلے کے انعقاد کی خبر ملتے ہی چراغ بیگ نے رختِ سفر باندھ لیا اور جموّں پہنچ گیا۔ جہاں گلاب بھون میں ریاستی کانگریس کے اہتمام سے اس عجیب و غریب میلے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ دو روزہ میلے میں سرکاری مسخروں اور غیر سرکاری بھانڈوں نے گلاب بھون کے سٹیج پر جو کرتب دکھائے، ان کی ایک نہایت ہی مختصر رپورٹ قارئین "آئینہ" کی خدمت میں حاضر ہے۔

اس میلے کا نام انگریزی میں پولٹیکل کانفرنس اور اردو میں سیاسی کانفرنس رکھا گیا تھا اور اس میں شرکت کے لئے اندرا سرکس کے سب سے بڑے رنگ ماسٹر مسٹر ڈی، پی

در، نہایت پالتو قسم کے ٹائیگر ڈاکٹر کرن سنگھ، بہت ہی بے ضرر اور سبزی خور قسم کے خرگوش اوم مہتہ اور حد درجہ خوشنما مگر خطرناک سانپ محمد شفیع قریشی بھی تشریف لائے تھے۔

میلے کے لئے سامعین اور تماش بین مہیا کرنے کے لئے خصوصی انتظامات کئے گئے تھے اور اس سلسلے میں محکمہ سی، آئی، ڈی کے "سفید پوشوں" اور جموں کے دور افتادہ علاقوں سے جمع کئے گئے گوجروں کی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔ کوا پریٹو سوسائٹیوں میں غبن کرنے والوں، بقایا داروں اور ہلدی میں ملاوٹ کرنے والے کارخانہ داروں کی ایک اچھی خاصی تعداد بھی صبح سے شام تک سرکاری و غیر سرکاری مسخروں کی اٹھکیلیوں سے محظوظ ہوتی رہی!

جب گلاب بھون کے محدود سٹیج پر قاسم صاحب کی لامحدود کابینہ کے سبھی وزیر ایک ساتھ بیٹھتے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گلاب بھون کا سٹیج بیک وقت اتنے احمقوں کا بوجھ نہ اٹھا سکے گا۔ ایک مرتبہ تو ایک ڈپٹی وزیر، پردیش کانگریس کے صدر محمد ایوب خان کی گود میں بیٹھ گئے۔

اس سیاسی کانفرنس یا میلے کا مطلب اور مقصد کیا تھا؟ یہ ابھی تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکا، قیاس غالب ہے کہ اس کا مقصد جموں کے عوام کو ذہنی تفریح اور جذباتی سکون مہیا کرنا تھا۔ لیکن جموں کے بدقسمت عوام اس سے پوری طرح لطف اندوز نہ ہو سکے۔ کیونکہ گلاب بھون پر سی، آئی، ڈی کے "سفید پوشوں" نے پہلا شو شروع ہوتے ہی قبضہ کر رکھا تھا! (جو "آخری شو" تک قائم رہا۔)

کانفرنس نما میلے میں یوں تو ایک سو آٹھ کے قریب تقریریں ہوئیں، لیکن آپ کی خدمت میں اہم مقررین کی اہم تقریروں کے "اقتباسات" پیش کئے جائیں گے!

خاندانی وزیر برائے منصوبہ بندی شری درگا پرشاد در وائسرائے بہادر کی طرح سٹیج پر تشریف لائے اور ریذیڈنٹ بہادر کی طرح حاضرین سے خطاب کیا، انھوں نے فرمایا:

"قاسم صاحب نے میرے بارے میں شکایت کی ہے کہ جب سے میں پلاننگ منسٹر ہو گیا ہوں ریاست کو مناسب مالی امداد نہیں مل رہی ہے۔ یہ بالکل غلط ہے، مجھ سے جو کچھ ہو سکتا ہے میں کر رہا ہوں، لیکن مجھے صرف اس ریاست کا خیال نہیں رکھنا ہے، مجھ پر پورے ملک کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ (غلام رسول کار کے اشارے پر

سی، آئی، ڈی کے سفید پوش تالیاں بجاتے ہیں۔) کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ ریاستی کابینہ میں وزیروں کی تعداد زیادہ ہے، کون کہتا ہے کہ تعداد زیادہ ہے، آخر کام بھی زیادہ ہے، میرے خیال میں یہاں پچاس وزیر ہونا چاہیئیں۔ (اس مرحلے پر صرف مکھن لال فوطیدار نے تالی بجائی کیونکہ ڈی، پی صاحب دراصل اُسی بچارے کی وکالت کر رہے تھے)۔

اب پیر غیاث الدّین سٹیج پر حملہ کرتے ہیں:

"میں آئیڈیالوجی، جدّلیات، مارکسزم، نالۂ مار، ترقی پسند تحریک، سیکولرازم اور کشمیری مسلمانوں کے متعلق کچھ کہوں گا، لیکن میں پہلے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں چاروں طرف کشمیری پنڈت ہیں، بچارے کشمیری مسلمان کا کہیں نام ونشان نہیں، ہمیں اس بارے میں سوچنا ہے (اس مرحلے پر ڈی، پی، صاحب نے پولیس کے ایک سفید پوش افسر کے کان میں کچھ کہہ دیا، غیاث صاحب پولیس افسر کو دیکھ کر بدحواس ہوگئے) اور کہنے لگے۔

"لیکن سیکولرازم، سیکلرازم" .... اور یہ کہتے ہوئے وہ بیٹھ گئے۔

اس کے بعد محمد شفیع قریشی (جو سرکاری خرچے پر ابھی حال ہی میں حج کر آئے ہیں) سٹیج پر اپنے جوہر دکھانے کے لئے جلوہ گر ہوئے اور ان کے دیکھتے ہی سب سرکاری اور غیر سرکاری، سیاسی اور غیر سیاسی سامعین محتاط ہوگئے۔

"ضرور کسی کو کاٹے گا۔" ایک سفید پوش پولیس والے نے ایک سرخ پوش پولیس والے کے کان میں سرگوشی کی۔

"قاسم صاحب کی قیادت میں ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔"، قریشی صاحب نے اُسی طرح قاسم صاحب کا قصیدہ پڑھنا شروع کیا، جسطرح اُنھوں نے ۱۹۶۷ء میں اننت ناگ سے بلامقابلہ کامیاب ہوکر کچھ دنوں کے لئے صادق صاحب کا قصیدہ پڑھا تھا۔"اس ریاست سے وہ منحوس سایہ ختم ہوگیا ہے کہ جس کی وجہ سے اس پر مصائب کے پہاڑ پڑے تھے۔" (قریشی صاحب کا خیال تھا کہ صادق صاحب کو گالی دئے بغیر وہ قاسم صاحب کو خوش نہیں کرسکتے، لیکن ان کا اندازہ غلط ثابت ہوا، قاسم صاحب اس بدتمیزی پر سخت پریشان

نظر آنے لگے۔)

"میں نہ کہتا تھا، کہ ضرور کسی کو کاٹے گا۔" سفید پوش نے سُرخ پوش کے کان میں کہا۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ محمد شفیع قریشی کب مہذب انسانوں کی زبان میں بات کرنا سیکھیں گے۔ اُن کا خیال ہے کہ وہ صرف شیخ عبداللہ کو گالی دے کر مسز گاندھی کا اعتماد اور صادق صاحب کے نام بُرا بھلا کہہ کر قاسم صاحب کی خوشنودی حاصل کر سکیں گے۔ انہوں نے اپنے اطوار نہیں بدلے، تو ساری زندگی ڈپٹی منسٹر ہی رہیں گے!

اب کانفرنس کا سب سے بڑا لطیفہ ظہور میں آنے والا تھا۔ یعنی حق خود ارادیت، رائے شماری، شہادتِ کربلا، اسوہ حسنہ، قانونِ شریعت، اخلاقِ طیبہ کے سب سے بڑے علمبردار، اور وعظ خواں، اہلِ تشیعہ کے نوجوان رہنما آغائے افتخار، ممبر نامزد لیجسلیٹو کونسل تشریف لائے، آغا صاحب کی نوجوانی، چہرے پر ریش نورانی، جسم پر خوبصورت شیروانی اور سر پر کلاہ قراقلی، گلاب بھون میں ایک ہلچل مچ گئی۔ اور پھر حضرت امام حسینؑ کے اس شیدائی نے ان الفاظ میں سیّد میر قاسم کے ہاتھ پر بیعت کی!

" قائد محترم، میرِ کارواں، روحِ سیاست، جانِ صحافت، مجسّم اخلاق، مرقع دیانت قبلہ قاسم صاحب، میں آج آپ کے ہاتھ پر بیعت کر کے کانگریس میں شامل ہونے کا اعلان کر رہا ہوں (منگت رام کے اشارے پر کارِ خاص اور غلام رسول کار کے علاوہ مفتی سعید نے بھی زور زور سے تالیاں بجائیں) میں آپ کی دیانت، آپ کی شرافت، آپ کی قیادت، آپ کی سیادت، آپ کی شخصیت سے متاثر ہو کر کانگریس میں شامل ہو رہا ہوں (ورنہ مجھے کانگریس کے پروگرام سے کوئی دلچسپی نہیں) میرا ایمان ہے کہ اس ریاست کو صرف آپ کی بلند نظر شخصیت اور قیادت ہی صراط المستقیم کی طرف لے جا سکتی ہے (اور آپ نے مجھے کونسل کا ممبر نامزد کر کے اس نیک کام کا آغاز کر لیا ہے۔"

اللہ! اللہ صرف چھ ماہ قبل حق خود ارادیت، آزادیٔ مکمل، رائے شماری اور بنیادی حقوق کا مطالبہ کرنے والا۔ یہ نوجوان لیجسلیٹو کونسل کا ممبر نامزد ہوتے ہی چاروں شانے چت ہو گیا۔ ایک طرف حضرت امام حسینؑ کا کردار کہ وہ جان دیتے ہیں مگر یزید کے

کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ دوسری طرف شہادتِ کربلا پر گریہ کرنے والے یہ" آغا صاحبان، کہ 'سرکاری ممبر'، 'نامزد' ہونے پر نہ صرف خود بیعت کرتے ہیں بلکہ اپنی پوری 'قوم' کو بطور ہدیہ پیش کرتے ہیں۔ مجھے آغائے افتخار کے کانگریس میں شامل ہونے پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن ان کے اس دعویٰ پر سخت اعتراض ہے کہ " میں تو اپنی قوم کو لے کر کانگریس میں شامل ہو رہا ہوں"۔ کیا بیسویں صدی کے اس آخری چوتھائی میں بھی شیعہ 'قوم'، اتنی سادہ لوح، پسماندہ اور سیاسی شعور سے بے بہرہ ہو سکتی ہے کہ 'ایک آغا' اپنے سیاسی مستقبل کے لئے اس کا استعمال اور استحصال کرے۔ آغائے افتخار کے مریدوں کو اس سودے بازی کے خلاف احتجاج کرنا چاہیئے اور تعلیم یافتہ شیعہ نوجوانوں کو بغاوت، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آغا صاحب نہ لفظ 'قوم' کے معنی سمجھتے ہیں اور نہ لفظ مسلمان کے۔

اور اس کی تصدیق اس وقت ہوئی کہ جب مولوی افتخار صاحب نے اپنی تقریر دلپذیر کے دوران یہ انکشاف فرمایا کہ:

"کچھ لوگ اپنے سیاسی مفادات کی خاطر گوجروں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑانا چاہتے ہیں۔،، گوجروں اور مسلمانوں کی یہ تقسیم میاں بشیر احمد وانگت و نائب وزیر حیوانات، نباتات، جمادات وغیرہ وغیرہ کے لئے حد درجہ ناگوار ہی نہیں، توہین آمیز بھی ثابت ہوئی۔ ان کی تو آنکھوں میں خون اُتر آیا اور جب تک آغائے افتخار کا بھاشن ختم نہ ہوا، وہ بے چینی سے پہلو بدلتے رہے۔ اُنہوں نے کانگریس اور اس تماشے کے نقلی صدر محمد ایوب خان سے درخواست کی کہ انہیں تقریر کرنے کی اجازت دی جائے، لیکن 'صدر ایوب' نے ان کی درخواست کو نظر انداز کر کے وزیر اعلیٰ سیّد میر قاسم کا نام لیا۔ قاسم صاحب تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ مگر وہ مائیک پر جھپٹے، اور خالص فلمی انداز میں (ٹھہرو! یہ شادی نہیں ہو سکتی) چلّانے لگے کہ قاسم صاحب سے پہلے میں تقریر کروں گا۔ قاسم صاحب ایک لمحے کے لئے بدحواس ہو گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کریں، صدر ایوب حیران و ششدر دیکھ رہے تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے،

کرائے کے سامعین بھی پریشان نظر آرہے تھے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا اور میاں بشیر چلا چلا کر کہہ رہے تھے، کہ آپ کو میری بات سننا ہوگی اور اگر آپ نہیں سنیں گے تو پھر ہمارے لئے (گوجروں کے لئے) ایک ہی راستہ ہے کہ ہم کانگریس چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ (یہ سن کر قاسم صاحب بھی، جو ابھی تک میاں بشیر کے ساتھ ہی کھڑے تھے بیٹھ گئے)۔ "گوجروں کے خلاف ایک سازش ہے اور اس سازش میں کچھ لونڈے بھی شریک ہیں (ان کا روئے سخن آغا افتخار کی طرف تھا) ہم ان کو بے نقاب کردینگے" میاں بشیر آگ بگولہ تھے۔ ایسا معلوم ہورہا تھا کہ وہ تقریر کے خاتمے پر آغا افتخار کو قتل کر کے سیدھے پولیس سٹیشن جائیں گے۔

"قاسم صاحب! یہ مت بھولئے کہ جس کرسی پر آپ آج بیٹھے ہیں، اس پر آپ کو بٹھانے میں، میں نے بھی اپنا حصّہ ادا کیا ہے۔ میں بھی ۳۲ ممبران اسمبلی کے ساتھ دہلی گیا ہوا تھا (یہ اشارہ تھا تین برس پرانے اُس واقعہ کی طرف کہ جب میاں نے ایک ہی دن صادق صاحب اور قاسم صاحب دونوں کو اپنی وفاداری کا اطمینان دلانے کیلئے قرآن شریف کی قسم کھائی تھی)

میاں بشیر کی تقریر سے گلاب بھون میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا اور سفید پوشوں اور سرخپوشوں کے علاوہ کھدر پوش بھی ہراساں نظر آنے لگے، خدا خدا کر کے میاں بشیر کی تقریر ختم ہوگئی اور قاسم صاحب کو خالص "گوگیا پاشائی" انداز میں اپنے جوہر دکھانے کا موقعہ ملا۔ قاسم صاحب کو تقریر کرنے کا "گر" آگیا ہے۔ وہ اپنی تقریر میں کوئی انکشاف نہیں کرتے، بلکہ مزے مزے میں ناگوار حقائق پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ گھنٹوں بولتے رہنے کے باوجود کچھ نہیں کہتے اور یہی ایک کامیاب سیاستداں کی خصوصیت ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنے ایک گھنٹے کی تقریر میں ڈی، پی، صاحب پر کئی چوٹیں کیں، لیکن کچھ اس انداز سے کہ ڈی، پی صاحب چوٹ کھا کر بھی مُسکراتے رہے۔ ڈی، پی صاحب نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ "قاسم صاحب سے ہمارے کچھ خفیہ معاہدے بھی ہیں۔" قاسم صاحب نے کہا کہ "میرا ڈی، پی صاحب کے ساتھ کوئی خفیہ

معاہدہ نہیں۔ میں ویسے بھی خفیہ معاہدوں پر یقین نہیں رکھتا۔" قاسم صاحب کی تقریر سے یہ اندازہ بھی ہوگیا کہ ڈی، پی صاحب اور ان کے درمیان کشمکش، آویزش، تناؤ اور کھنچاؤ کے جراثیم زوروں پر ہیں۔

شیخ صاحب اور مرکزی حکومت کے درمیان مفروضہ گفتگو کو بھی قاسم صاحب نے چٹکیوں میں اُڑانے کی کوشش کی، جو لوگ اس سے پریشان ہیں، ان کی پریشانی دور کرتے ہوئے قاسم صاحب نے فرمایا کہ "جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شیخ صاحب دوبارہ اقتدار میں آنا چاہتے ہیں، وہ شیخ صاحب کی شخصیت اور ان کی عظمت کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں۔ اور میں آپ کو یہ یقین دے دینا چاہتا ہوں کہ میں بھی آسانی سے کرسی چھوڑنے والا نہیں۔" قاسم صاحب کے اس فقرے پر افتخاروں، کاروں، مفتیوں، ڈوگروں، زرگروں، سفید پوشوں، سیاہ کاروں، بادہ نوشوں اور ضمیر فروشوں نے اس زور سے تالیاں بجائیں کہ گلاب بھون کی چھت ہلنے لگی۔ چراغ بیگ کے ساتھ بیٹھے ہوئے اخباری کاغذ کا بلیک کرنے والے ایک صحافی نے اپنی جیب سے 555 سگریٹ کی ڈبی نکال کر ایک سگریٹ سلگائی اور کہا "یہ ہوئی نا بات!" قاسم صاحب کی تقریر کے ساتھ ہی جلسہ برخواست ہوگیا۔

لیکن دوسرے دن شائقین کے "پرزور اصرار" پر گلاب بھون میں ڈاکومینٹری فلم "ٹائیگر" کا ایک شو دکھایا گیا۔ اس شو کا اہتمام مہاراجہ ڈاکٹر کرن سنگھ کے ایک عاشق زار، شری وید بھسین نے کیا تھا، اور جموں کے خاص و عام کو تماشا دیکھنے کی دعوت دی گئی تھی۔ گلاب بھون کا ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔ لیکن بلراج پوری اور امرت ملہوترہ کہیں نظر نہ آئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ دونوں 'ٹائیگر' سے خفا ہیں۔ (یا ہوسکتا ہے کہ ٹائیگر ہی ان سے خفا ہو۔) وید بھسین نے استقبالیہ ایڈریس پڑھا، جسمیں ڈاکٹر کرن سنگھ نے جوابی تقریر میں کہا کہ "میرے آبا و اجداد نے ملک کی خاطر اپنی جانیں قربان کردی ہیں۔ اسلئے ملک کی خاطر کرسی چھوڑ دینا میرے لئے کوئی بڑی بات نہیں (تالی پرزور تالی)

کچھ لوگ کہتے ہیں میں سیاستداں نہیں ہوں (کچھ لوگ سے مُراد ڈی، پی، در اور ترلوچن دت تھے) لیکن سیاست کا مطلب بغل میں چھری اور منہ میں رام رام ہے تو میں واقعی سیاستداں نہیں ہوں، اور اس اعتبار سے قاسم صاحب بھی سیاستداں نہیں ہیں۔" اس پر اور زور سے تالیاں بجیں۔ یہ ڈی، پی صاحب کی طرف واضح اشارہ تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہی فقرہ کہنے کے لئے ڈاکٹر صاحب نے وید بھسین سے اس تقریب کا اہتمام کروایا تھا۔

تیسرا صفحہ قدرے طویل ہو گیا، اس کے لئے معافی چاہتا ہوں ؎

لذید بود حکایت طویل تر گفتم

(۲۳، اپریل ۷۳ء)

موت کی چھاؤں میں

ہوائی جہازوں نے ایک جگہ سے دوسری جگہ کا ہی نہیں، موت اور زندگی کا فاصلہ بھی حیرت انگیز حد تک کم کر دیا ہے۔ اس کا احساس مجھے اس ماہ کی ۱۴ اکتوبر کو ٹھیک پونے پانچ بجے ہوا۔ اُس وقت مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں یہ تجربہ بیان کرنے کے لیے زندہ رہوں گا۔ اور آج جب اپنے لکھنے کی میز پر ان "فیصلہ کن لمحات" کا تصوّر کر کے اُس وقت کے تاثرات قلم بند کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تو یقین کیجیے کہ میرے دل کے ساتھ ساتھ میرا قلم بھی کانپ رہا ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں موت کی وادی سے لوٹ آیا ہوں!

۱۴ اکتوبر کو سری نگر کا موسم ابر آلودہ تھا، لیکن 'ایر پورٹ' پر بڑی چہل پہل تھی۔ ہوائی جہازوں سے آنے جانے والے مسافروں کی ریل پیل، استقبال اور الوداع کرنے والوں کی بھیڑ بھاڑ، ٹیکسی ڈرائیوروں اور ہاؤس بوٹ والوں کا شور و غل، یہ سب کچھ تو 'ایر پورٹ' کی روزمرہ کی زندگی کا ایک حصّہ ہے۔ لیکن آج کچھ رونق زیادہ ہی دکھائی دے رہی تھی۔ کچھ لوگ سرگوشیاں کر رہے تھے، کچھ تاک جھانک اور کچھ آگے بڑھنے کی کوشش میں دھکّم پیل۔ معلوم ہوا کہ مشہور فلم سٹار راجیش کھنّہ کی نئی نویلی دُلہن ڈمپل کپاڈیہ ایر پورٹ پر موجود ہیں اور دہلی جا رہی ہیں۔

ٹھیک چار بجے جب ہمارا جہاز سرینگر کے ہوائی اڈے سے اُٹھ کر فضا میں پرواز کرنے لگا تو اُس وقت موسم نسبتاً بہتر تھا۔ معمولی سی بارش کے بعد ہلکی سی

دھوپ نکل آئی تھی۔ اور چند ہی لمحوں کے بعد آسمان پر قوس قزح کی محراب نظر آنے لگی۔ میرے ساتھ والی نشست پر دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر خواجہ احمد فاروقی بیٹھے ہوئے تھے اور وہ اس نظارے سے اس طرح لطف اندوز ہو رہے تھے کہ جیسے پہلی بار دیکھنے کا موقع ملا ہو۔ یہ منظر تھا بھی بہت حسین، کبھی ہمارا جہاز قوس قزح کی چڑھی ہوئی کمان کے نیچے سے کبھی اسے چھوتا ہوا اور کبھی اس کے اوپر سے گذر جاتا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ مہمانوں کے استقبال کے لئے میزبان نے رنگین محرابیں سجادی ہیں۔

"میں نے اتنا خوبصورت نظارہ آج تک نہیں دیکھا ہے۔" خواجہ احمد فاروقی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بٹیا، کھڑکی سے باہر جھانکو، دیکھو کتنا حسین منظر ہے۔" میرے پیچھے بیٹھا ہوا باپ اپنی بیٹی سے کہہ رہا تھا۔

جہاز میں کل ستر کے قریب مسافر تھے، اور سبھی مسافر عروسِ فطرت کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ آخر کی نشستوں پر کچھ بچے اودھم مچا رہے تھے۔ ڈمپل کپاڈیہ اور اس کی ہم سفر مسز بقیجہ کسی بات پر قہقہے مار رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد ایئر ہوسٹسز نے "دستر خوان" بچھا کر مسافروں کو چائے پلانا شروع کی اور چار بجکر پینتیس منٹ کے قریب جہاز کے مائیکروفون سے یہ ہدایت نشر ہوئی کہ مسافر اپنی کرسی کی پٹیاں باندھ لیں اور اس کے ساتھ ہی جہاز جھٹکے کھانے لگا۔ ہوائی جہاز میں سفر کرنے والے اس قسم کے جھٹکوں کے عادی ہوتے ہیں اور جہاز کے اوپر نیچے جانے کو وہ کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے اور میں تو خراب سے خراب موسم میں بھی سفر کر چکا ہوں اس لئے میرے لئے یہ معمول کی بات تھی، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے جہاز میں اندھیرا چھا گیا۔ اور ہم نے جب کھڑکی سے جھانکا تو دیکھا کہ جہاز گھنے کالے بادلوں میں گھر گیا ہے اور کہیں سے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ اس وقت چار بجکر چالیس منٹ ہو رہے تھے۔ اور بہت سے مسافروں کے چہرے پر تفکر اور تشویش کے آثار نظر آنے لگے۔ خواجہ احمد فاروقی صاحب۔ جو ابھی کچھ دیر پہلے مناظر فطرت کی رنگینیوں میں ڈوب گئے تھے۔ اس خوفناک، گہرے اندھیرے سے اسقدر

گھبرا گئے کہ مجھے انہیں بار بار تسلّی دینا پڑی۔ کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ گھبرانے کی کوئی بات تھی بھی نہیں، میں اس سے زیادہ خطرناک اور خوفناک موسم میں سفر کر چکا تھا اور مجھے یقین تھا کہ ابھی چند ہی لمحوں میں ہمارا جہاز دلّی کے ہوائی اڈّے پر اُترے گا۔ پونے پانچ بج گئے تو BUMPING میں کمی ہونے کی بجائے اضافہ ہی ہونے لگا۔ اور بعض بعض جھٹکے تو ایسے لگے کہ میرا دل بیٹھنے لگا۔ کچھ عورتوں اور بچّوں کی چیخیں نکل گئیں۔ اور جہاز کے سبھی مسافروں کے چہروں پر موت کی سنجیدگی چھا گئی۔ میرے اعتماد اور یقین کی دیواریں بھی ہلنے لگیں، لیکن میں فاروقی صاحب کو تسلّی دیتا رہا، اُمید و بیم کی اس کشمکش میں دس منٹ گذر چکے تھے، اور آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ بتیس ہزار فٹ کی بلندی پر گھرے سیاہ بادلوں کی آغوش میں، دس منٹ کا یہ وقفہ کتنا طویل اور صبر آزما ثابت ہوا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کئی گھنٹے گذر چکے ہیں۔ جہاز کی اندرونی روشنیاں آن کر دی گئیں تھیں۔ اور ابھی چند لمحوں پہلے مسکراہٹیں بکھیرنے والی ایر ہوسٹسز موت کے اندیشے سے، پتھر کی مورتیاں بنی ہوئی کیبن کے باہر کھڑی تھیں۔ ان کے چہروں پر وحشت اور آنکھوں میں دنیا بھر کی بے چارگی سمٹ آئی تھی اور ان کی یہ حالت دیکھ کر میرے اعتماد اور امید کی شمع بھی بجھنے لگی اور دفعتاً میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ میری زندگی کا آخری لمحہ ہے۔ عین اُسی وقت ایک ایسا شور بپا ہوا کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جہاز پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی ہے اور جہاز تباہ ہو کر گر رہا ہے۔ سہمی ہوئی ایئر ہوسٹس سے پوچھا کہ یہ کیسا شور ہے تو معلوم ہوا کہ گرد و غبار کے طوفان کے بعد اب جہاز ژالہ باری HAIL-STORM میں پھنس گیا ہے۔ اب امید کی بجھتی ہوئی لو بالکل بجھ گئی۔ یہ موت کا لمحہ تھا، ایک لمحہ کیلئے میری نگاہوں میں اپنی بیوی اور بچیوں کی تصویر سما گئی۔ اور میں نے تصوّر ہی تصوّر میں ان سے خدا حافظ کہا، اس ایک منٹ میں میری ساری زندگی میری نگاہوں کے سامنے آ گئی اور میں یہ سوچنے لگا کہ انسانی زندگی کا آبگینہ کتنا نازک ہے، زندہ رہنے کیلیے کیا کیا منصوبے بنائے تھے، لیکن ابھی چند لمحوں کے بعد افسانہ بنوں گا۔ میری چھوٹی بچّی

شبنم نے آج صبح کسی بات پر ناراض ہو کر کہا تھا کہ " خدا آپ کو اپنے پاس لے جائے گا۔"
تو میں ہنس دیا تھا، لیکن اسوقت مجھے دفعتاً یہ بات یاد آگئی اور میں جو دوسروں کی ضعیف
الاعتقادی اور توہم پرستی کا مذاق اُڑانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا خود
اسی وہم میں مبتلا ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ میری موت کی پیشگی اطلاع تھی۔ تین منٹ کے اس
قیامت خیز وقفے کے دوران کون کون سے خیالات دماغ میں آتے اور جاتے رہے،
نہ ان کی تفصیل مجھے یاد ہے اور نہ انکا بیان کرنا ممکن ہے لیکن یہ بات مجھے اچھی طرح
یاد ہے کہ مجھے مرحوم ڈاکٹر حفیظ اللہ، محمد مقبول اور غلام احمد مختار کے علاوہ ان بہت سے
بدنصیبوں کی یاد آئی کہ جو ۱۹۶۶ء میں فوکر فرینڈشپ کے حادثے میں جاں بحق ہو گئے تھے۔
میں اپنے تجربے اور تخیّل کی مدد سے یہ سوچ رہا تھا کہ زندگی اور موت کے اِس آخری لمحے
میں ان پر کیا گذری ہوگی۔ بے بسی اور بے کسی کے اس عالم میں میں نے کئی بار سورۂ فاتحہ
پڑھ کر اپنے دل کو یہ اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ اللہ تعالیٰ وہی کرے گا جو ہم سب
کے حق میں بہتر ہوگا، لیکن بے سود، دلِ ناتواں موت کے خوف سے اس زور سے دھڑک
رہا تھا کہ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ یہ جہاز کی آواز ہے یا دل کے دھڑکنے کی، بجلیاں
چمک رہی تھیں، اولے گر رہے تھے، چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا اور جہاز کا
کپتان جہاز کو بجلیوں کی زد سے بچانے کے لئے جہاز کو کبھی اوپر اور کبھی نیچے لے جا رہا
تھا۔ میری دائیں جانب بیٹھے ہوئے ایک ادھیڑ عمر کا انگریز اور اس کی تنومند بیوی بظاہر
بڑے اطمینان سے صورتحال کا مشاہدہ کر رہے تھے، لیکن ان کے چہرے پسینے سے تر اور
ان کی پیشانی موت کے اندیشے سے سکڑ گئی تھی۔ انگریز ہو یا ہندوستانی، گورا ہو یا کالا، امیر
ہو یا غریب، موت ہی نہیں، موت کا اندیشہ بھی سب کو یکساں بنا دیتا ہے۔ ڈمپل کپاڈیہ
جس نے اپنے قہقہوں سے آسمان سر پر اُٹھا لیا تھا، ایک کونے میں دبکی پڑی بھگوان کو
یاد کر رہی تھی۔ ایک فلم ڈائرکٹر کی نوجوان بیٹی اپنے باپ کو بار بار بلا رہی تھی کہ "ڈیڈی
یہاں میرے پاس آکر بیٹھو۔" موت کے اندیشے نے باپ کی ہمّت چھین لی تھی اور وہ بیٹی
کی چیخ و پکار کے باوجود اپنی جگہ سے نہیں ہلا، موت اتنی بے رحم اور بے مروّت ہے کہ اسکا

اندیشہ بھی انسان کو وحشی بنانے کیلئے کافی ہے۔

پانچ بجے کے قریب موت کے اندھیرے چھٹنے لگے اور امید کی ایک ہلکی سی کرن نمودار ہوگئی۔ جہاز کی کھڑکی سے نیچے، بہت نیچے زمین نظر آرہی تھی، اور لگتا تھا کہ اب کچھ ہی دیر بعد جہاز نیچے اُترے گا، زمین، پیاری زمین سے فضا کتنی حسین اور رومانٹک معلوم ہوتی ہے، لیکن فضا کی بلندیوں میں بے کسی اور بے بسی کا احساس کس درجہ شدید ہوتا ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں کہ جو اس تجربے سے گذرے ہوں کہ جس سے ہمیں گذرنا پڑا۔ زمین کو دیکھ کر بے بسی کا احساس فوراً ہی مٹنے لگا اور اس کے ساتھ ہی جہاز کے مائیکروفون پر یہ اعلان ہوا کہ چند ہی لمحوں میں ہمارا جہاز دلّی کے ہوائی اڈے پر اُترے گا، لیکن ایسا نہ ہوا اور اس اعلان کے ۴۰ منٹ بعد تک ہم فضا میں ہی تیرتے رہے۔ اس وقفے کے دوران موت کے سائے کچھ دُھندلے ہوگئے تھے۔ لیکن اندیشہ ہائے دور دراز نے چالیس منٹ کے اس مختصر سے وقفے کو چالیس گھنٹوں سے بھی زیادہ طویل بنا دیا اور شام ساڑھے چھ بجے جب ہمارا جہاز دہلی کی بجائے آگرہ کے ہوائی اڈے پر اُترا تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہم موت کی وادی سے صحیح وسلامت لوٹ آئے ہیں۔ جہاز کے کپتان مسٹر کا چرو جب کیبن سے باہر آئے تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اڑھائی گھنٹے کی اس مسافت میں بوڑھے ہوگئے ہیں۔ میں نے اور دوسرے مسافروں نے اس نازک مگر کامیاب پرواز پر انہیں مبارکباد دی تو انہوں نے بتایا کہ جہاز رانی کے اپنے بیس سالہ کیریئر میں یہ اپنی نوعیت کا دوسرا تجربہ ہے، اس سے پہلے انہیں نائیجیریا میں اس قسم کے موسم سے دو چار ہونا پڑا تھا۔ ڈمپل کپاڈیہ کی ہم سفر مسز بقیحہ نے انکشاف کیا کہ وہ تین سال تک ایئر ہوسٹس رہی ہیں۔ اور انہوں نے کبھی اس قسم کا خطرناک سفر نہیں کیا ہے۔ فلم ڈائرکٹر جے اوم پرکاش کا کہنا تھا کہ وہ پچھلے بارہ سال میں سینکڑوں بار ہوائی جہاز سے سفر کر چکے ہیں لیکن اتنا تکلیفدہ تجربہ انہیں کبھی نہیں ہوا۔ مسز گاندھی کے صاحبزادے راجیو گاندھی جو اس جہاز سے سفر کر رہے تھے نے بتایا کہ صورتحال اتنی سنگین اور سنجیدہ نہیں تھی کہ جتنا آپ سمجھتے ہیں مسٹر گاندھی انڈین ایئر لائنز میں CO-PILOT ہیں۔ اور ایک گھنٹے کے اس بحران میں ایک بار

بھی ان کے چہرے سے تردّد اور پریشانی ظاہر نہیں ہوئی۔ کپتان کا چہرہ ایک نہایت ہی تجربکار اور ہوشیار جہاز راں ہیں۔ انہوں نے اس نازک صورت حال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ گرد و غبار کا یہ طوفان بدقسمتی سے برق آلود ELECTRONIC تھا اور اس طوفان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جہاز کا رابطہ راڈار سے کٹ جاتا ہے، اور ہم آپس میں نام و پیغام نہیں کر سکتے۔ دلّی پہنچ کر جب ہم اُترنا چاہتے تھے تو ہمیں بتایا گیا کہ وہاں ۴۰ میل فی گھنٹے کی رفتار سے DUST-STORM چل رہا ہے اور ایئرپورٹ پر بالکل کچھ نظر نہیں آتا۔ اس لئے ہمیں آگرہ جاکر وہاں اُترنا پڑا۔

رات آگرہ کے کلارک شیراز میں گذار کر دوسرے دن علی الصبح ہم وائی کاؤنٹ سے دہلی کیلئے روانہ ہو گئے، کیونکہ ہمارا کیراول شدید ژالہ باری کی وجہ سے اس درجہ متاثر ہوا تھا کہ اسے مرمت اور ملاحظے کے بغیر پرواز کی اجازت نہیں دی گئی۔

"آئینہ" کے بہت نوجوان (بلکہ بزرگ بھی) قارئین اس بات سے مایوس ہوں گے کہ میں نے اس طویل روداد میں ڈمپل کپاڈیہ کا سرسری ہی ذکر کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ زندگی اور موت کے اس ڈرامے میں وہ ہیروئن نہیں، محض ایک ایکسٹرا تھی اور جب ہیروئن ایکسٹرا کا رول ادا کر رہی ہو تو حاشیہ آرائی کی زیادہ گنجائش نہیں ہوتی، ویسے ڈمپل بہت ہی سمپل لڑکی ہے۔ بڑی بھولی اور معصوم، چاکلیٹ اور چیونگ گم کی حد درجہ شوقین، ہر وقت چیونگ گم چباتی رہتی ہے۔ اتنی کم عمر اور بھولی بچی سے شادی کر کے راجیش کھنّہ نے بہت بڑا ظلم کیا ہے۔

(۲۳ رمئی ۷۳ء)

کچھ "بک آف فالج" کے متعلق

پچھلے ہفتے سری نگر کی شاہراہوں پر بدتمیزی، غنڈہ گردی، لاقانونیت اور تشدد کے جو شرمناک مظاہرے دیکھنے میں آئے۔ ان کا سب سے افسوسناک اور تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ یہ ساری "شرانگیزیاں" حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں کی والہانہ محبت اور بے پناہ عقیدت کے نام پر روا رکھی گئی۔ کسی کتاب، اخبار یا رسالے میں رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خیالی تصویر کی اشاعت سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہونا قدرتی بات ہے، لیکن اپنے مجروح جذبات کی نمائش میں ہلڑ بازی، تخریب کاری اور بے ہودگی کا مظاہرہ کرنے والے حضور کے تئیں اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کی بجائے ان کی شان میں بے ادبی اور گستاخی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ شیخ صاحب نے بجا فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر تشدد اور تخریب کی کارروائیاں کرنے والے یقیناً ان کے منصب اور پیغام سے بے بہرہ ہیں۔

اس "دو روزہ ہلڑ بازی" کا ایک اطمینان بخش پہلو یہ ہے کہ عامۃ المسلمین نے نہ صرف یہ کہ اس کا ساتھ نہیں دیا بلکہ بحیثیت مجموعی احتجاج اور رنج و غم کے اِن "اخلاق سوز" مظاہروں پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی کیا۔ یہی وجہ ہے کہ بے پناہ جذباتی امکانات اور "خطرناک ممکنات" کے باوجود اس ایجی ٹیشن کا دائرہ سکول اور کالج کے ان نوخیز طالب علموں اور "کچے" ذہن کے ان نوجوانوں تک ہی محدود رہا کہ جن کے گھر کی رونق کسی نہ کسی ہنگامے پر موقوف ہوتی ہے، یہ مسلمانوں کی ذہنی بلوغت اور

ان کی سیاسی بصیرت کی نشانی ہے کہ وہ اب ہر آواز کو بانگِ درا اور ہر پروانہ کو بالِ جبریل سے منسوب نہیں کرتے، لیکن سڑکوں پر پتھراؤ کرنے والے، راہ گیروں کی مار پیٹ کرنے والے، غیر ملکی سیاحوں کو ہراساں اور پریشان کرنے والے، سکولوں کی کھڑکیاں توڑنے والے، دو کانوں کے شیشے چکنا چور کرنے والے، سفید چمڑی والے ہر اجنبی کو انگریز سمجھنے والے، شہر کے کاروبار کو معطل کرنے والے اور بھری محفل کو درہم برہم کرنے والے یہ کمسن نوجوان بھی تو ہمارے ہی لختِ جگر ہیں۔ اس لئے ۲۲ر اور ۲۳ر مئی کو اس شہر میں جو کچھ بھی ہوا، اسکی براہِ راست ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے کہ جنہوں نے ایک جائز احتجاج کو ایک ناجائز اور نامعقول ہنگامے میں بدلتا دیکھ کر بھی خاموشی اختیار کی۔ جو بروقت کاروائی اور صحیح قسم کی رہنمائی سے اس فساد کو روک سکتے تھے۔ لیکن جو دُور سے تماشا دیکھتے رہے۔ افسوس، صد افسوس! کہ اس بے اعتنائی، بے نیازی اور لاپرواہی کے نتیجے میں پانچ گھروں کے چراغ بجھ گئے۔ پانچ ادھ کھلی کلیاں مسلی گئیں، کئی خاندانوں میں صفِ ماتم بچھ گئی اور درجنوں سینے زخمی ہو گئے۔ دکانوں کے ٹوٹے ہوئے شیشے جُڑ سکتے ہیں، سکولوں کی ٹوٹی کھڑکیاں بھی دوبارہ بن جائیں گی۔ پتھروں اور لاٹھیوں کے زخم بھر جائیں گے، لیکن اس بے جا تشدّد، بے مقصد ہنگامہ آرائی اور بے معنی ایجی ٹیشن کے دوران کھوئی ہوئی پانچ قیمتی زندگیاں لوٹائی نہیں جاسکتیں۔ اُن ماؤں، باپوں اور بہنوں اور بھائیوں کے زخم بھرے نہیں جاسکتے کہ جن کے لختِ جگر اُن سے ہمیشہ کے لئے چھن گئے!

"بک آف نالج" نام کی کتاب میں حضور آنحضرتؐ کی فرضی تصویر کے خلاف احتجاج اور ناراضگی کا اظہار قابلِ فہم ہے، لیکن اس احتجاج کو پتھراو اور ٹکراؤ کا بہانہ بنانے والے بر خود غلط نوجوانوں سے پوچھنا چاہوں گا کہ اس کتاب پر ریاستی حکومت کی طرف سے پابندی عائد کئے جانے کے بعد ہنگامہ آرائی اور ہلڑ بازی کا کیا جواز تھا؟ ۱۸۸۹ء میں شائع شدہ اس کتاب کو بنیاد بنا کر غیر ملکی سیاحوں کے ساتھ نازیبا اور ناشائستہ سلوک کرنے میں انہوں نے اسلام، قرآن اور رسول کے کس فرمان کی تعمیل

کی ہے ؟ حضور صلعم کے نام پر فتنہ فساد بپا کرکے اُنہوں نے رحمۃ للعالمین کے کس پیغام کی تبلیغ اور تشہیر کی ہے ؟ ایک غیر مسلم مصنف کی ترتیب دی ہوئی کتاب پر اپنے غم و غصّے کے اس مہذّب اظہار سے انہوں نے اسلام کی عزّت اور مسلمانوں کی شہرت میں کونسا اضافہ کیا ؟ اس کتاب پر تمام ملک میں پابندی عائد کئے جانے سے کیا اسلام ہر اندرونی اور بیرونی خطرے سے محفوظ ہوگیا ؟ اس کتاب کو ملک کی تمام لائبریریوں سے نکال باہر کرانے کے بعد کیا مسلمانوں کے تمام مسائل حل ہوگئے ؟ اور اگر بک آف نالج میں حضورؐ کی خیالی تصویر کی موجودگی، اسلام اور مسلمانوں کی عزت اور غیرت کے لیئے ایک چیلنج ہے، تو پھر صرف ہندوستان میں اس کتاب پر پابندی عائد کرنے سے کیا ہوگا ؟ اس کتاب کو تو دنیا بھر کی لائبریریوں سے نکال کر جلا دینا چاہیئے تاکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی عزّت بحال ہوسکے۔ اس سلسلے میں ہمارے جوشیلے نوجوانوں کا کیا پروگرام ہے ؟ میرے نوجوان دوست، مجھے معاف کریں گے کہ حضور کے نام پر پتھر اور لاٹھی اُٹھا کر راہ گیروں کو پیٹنے سے اُنہوں نے اسلام کی کوئی خدمت نہیں کی ہے اور نہ پیغمبرِ اسلام کی، اُنہوں نے اپنے طرزِ عمل سے صرف یہ ثابت کیا ہے کہ تعلیم، تہذیب اور ترقی کے اس دور میں بھی مسلمانوں میں ایسے بے علم، جاہل اور تنگ نظر لوگ موجود ہیں کہ جو مسلمان کہلانے کے باوجود اسلام اسلام کی روح اور داعی اسلام کے پیغام سے قطعی بے بہرہ ہیں۔ 'بک آف نالج' کا مصنّف مسلمان نہیں ہے۔ اس لئے وہ اگر غیر ارادی طور پر حضور کی شان میں گستاخی کا مرتکب ہوتا ہے تو اُسے معاف کیا جانا چاہیئے، لیکن اُن مسلمانوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے کہ جو صبح سے شام تک ایکبار نہیں ہزار بار خدا اور اس کے رسول کی توہین کا جرم کرنے کے باوجود مسلمان کہلانے پر مُصر ہیں ؟ محمدؐ کے نام پر ایجی ٹیشن کرنے والے ان سینکڑوں نوجوانوں میں کتنے ایسے نوجوان ہوں گے کہ جو ان کے صحیح منصب اور مرتبے سے واقف ہیں ؟ کتنے ایسے ہیں جو ان کی تعلیمات اور ان کے بتائے ہوئے رستے پر چلتے ہیں اور کتنے ایسے ہیں کہ جو اسلام کی تبلیغ اور اشاعت کے سلسلے میں اپنے فرائض

انجام دیتے ہیں؟ میری اس بات کو مبالغہ پر محمول نہ کیجئے کہ ایجی ٹیشن کرنے والے
"معصوموں"، میں ۹۹٪ ایسے لوگ تھے کہ جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے بارے میں
اتنا بھی معلوم نہیں کہ جتنا 'بُک آف نالج' کے مصنف آرتھر کو معلوم ہے۔ اگر وہ حضور
کی تعلیمات، ان کے فلسفے سے آشنا ہوتے تو وہ اپنے رنج وغم کے اظہار میں کبھی اخلاق
اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے، احتجاج کرنے والوں کو شاید اس بات
کا علم نہیں کہ حضورؐ نے خوشی اور ماتم، دونوں ہی میں ضبط و توازن برقرار رکھنے
کی سخت ہدایت کی ہے۔ ان کی اپنی زندگی اخلاق، مروّت، محبّت، شفقت، حلم،
انکسار اور تہذیب اور شائستگی کی ایک ایسی مثال تھی کہ اِس دورِ جاہلیت میں
اسلام کی ہمہ گیر مقبولیت اور کامیابی بہت سے مفکّروں کی نگاہ میں اُن کی بے پناہ
شخصیت اور غیر معمولی کردار کا نتیجہ تھی۔ سکولوں کی کھڑکیاں، دوکانوں کے شیشے اور
فرنگیوں کی ہڈّی پسلی توڑنے والے ان نوجوانوں کو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ حضورؐ
پر پتھر برسا کر ان کے جسم کو لہو لہان کرنے والوں کے حق میں بھی ان کی زبان سے صرف
دُعا ہی نکلتی تھی۔ اُن کے ہم وطن، دوست، احباب، عزیز و اقارب اور دُشمن جب
حضورؐ کی شان میں گستاخی کرتے، انہیں سخت جسمانی اذیتیں دیتے اور ان کی
راہوں میں کانٹے بچھاتے تو حضورؐ بارگاہِ ایزدی میں یہ دُعا کرتے "یا اللہ! انہیں
معاف کر دے، کیونکہ انہیں معلوم نہیں کہ یہ کیا کر رہے ہیں؟ صبر و رضا، وسعتِ
قلبی، اعلیٰ ظرفی اور بلند نگہی کی ان ہی خصوصیات کی بنا پر حضورؐ کو رحمۃ" للعالمین
کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور صد حیف کے اُن کے نام لیوا، آج ایک دقیانوسی کتاب
کو بہانہ بنا کر اپنوں کی بیزاری اور غیروں کی دل آزاری کا سامان بہم کرتے ہیں۔
اور ستم ظریفی یہ کہ اس ساری حماقت کو "عشقِ رسول" کا نام دیا جاتا ہے۔ کیا سوچا
ہو گا ان مغربی سیّاحوں نے ہمارے مذہب اور ہمارے پیغمبر کے بارے میں کہ جب
بلاوجہ اور بغیر کسی اشتعال کے انہیں سڑکوں پر پیٹا گیا؟ کیا ہم اس رسول کی امت
کہلانے کے حق دار ہیں، کہ جو اپنے جسم پر زخم کھا کر بھی زخم دینے والوں کے حق میں

دُعائے خیر کیا کرتا تھا؟ کیا اپنے رسول کی تعلیمات اور ہدایات کی خلاف ورزی کر کے ہم خود توہینِ رسول کے مرتکب نہیں ہوئے ہیں؟ ہمارے جوشیلے نوجوانوں کو ان سوالات کا جواب دینا ہی پڑے گا!

چند سال قبل چراغ بیگ نے 'توہینِ قرآن' کے سلسلے میں یہ بات کہی تھی، کہ قرآن ایک نظامِ زندگی، فلسفۂ حیات اور نظامِ فکر کا نام ہے اور اس کی توہین ہو ہی نہیں سکتی۔ بالخصوص وہ لوگ اس کی توہین کر ہی نہیں سکتے کہ جو اس فلسفۂ اور نظامِ فکر پر ایمان نہیں رکھتے، لیکن جو لوگ ایمان رکھنے کے بعد اس پر عمل نہیں کرتے وہ کسی حد تک اس کی توہین اور تذلیل کا باعث بن سکتے ہیں۔ بالکل یہی بات توہینِ رسول پر بھی صادق آتی ہے۔ حضور کی خیالی تصویر شائع کرنے اُن کی زندگی پر سخت قسم کی تنقید کرنے یا ان کی عظمت کو کم کرنے کی مضحکہ خیز کوششوں سے نہ حضور کی توہین ہو سکتی ہے اور نہ ان کے مرتبے میں کمی آسکتی ہے۔ وہ روشنی کا ایک ایسا مینار ہیں کہ جس نے جہالت، لاعلمی، لاقانونیت اور حیوانیت کے گھرے اندھیرے میں دنیا کو علم اور انسانیت، امن، اخلاق، شرافت اور تہذیب کا راستہ دکھایا۔ یہ روشنی عرب سے نمودار ہو کر ساری دنیا میں پھیل گئی اور جب تک دنیا میں انسانیت، امن، اخلاق، شرافت اور تہذیب کی اقدار باقی رہیں گی، ان کی عظمت اور ان کا تقدّس نہ صرف قائم رہے گا بلکہ اس میں اضافہ بھی ہوتا رہے گا۔" مجھے اس بات سے کبھی کوئی تشویش لاحق نہیں ہوتی کہ کچھ غیر مسلموں نے حضور کی توہین کی ہے، لیکن میں اس بات پر سخت شرمندہ ہوں کہ حضور کے نام لیواؤں کی اکثریت اپنے قول و فعل اور کردار و گفتار سے حضور کی توہین کا باعث بنتی ہے۔ آرتھرلی اور اس نوع کے مصنفین اور مؤلفین کے خلاف احتجاج کرنے کی بجائے ہمارے نوجوانوں کو اپنے نفس اور اس معاشرے کے خلاف احتجاج کرنا چاہیئے کہ جو اسلام کی تمام خوبیوں سے پاک اور دنیا بھر کی خرافات سے بھرا پڑا ہے۔ ہمیں حقیقت کو خرافات سے الگ کرنے کی کوشش

کرنا ہوگی۔

'مِک آف نالج' پر پابندی عائد کرانے سے ہم نے نہ کوئی قلعہ جیتا ہے اور نہ کوئی ملک تسخیر کیا ہے، زیادہ سے زیادہ اپنے مجروح جذبات کی تسکین کی ہے، لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ دنیا بھر میں ایک نہیں ہزاروں 'مکس آف نالج' بکھری پڑی ہیں اور ہم کہاں تک ان کتابوں پر پابندی عائد کراتے رہیں گے؟ ہمیں اس قسم کی کتابوں اور رسائل کے متعلق زیادہ متوازن اور مثبت رویّہ اختیار کرنا چاہیئے، اور ان کے خلاف اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے میں ضبط اور توازن سے کام لینا ہوگا۔ ابھی چونکہ تمام دنیا پر مسلمانوں کی حکومت قائم نہیں ہوئی ہے (اور مستقبل قریب میں اس کا کوئی اندیشہ نظر بھی نہیں آتا) اس لئے ہمارے نوجوانوں کو سری نگر میں بیٹھ کر تمام دنیا کی حکومتوں کے لئے فرمان جاری کرنے کے شغل سے باز آنا چاہیئے۔ اور میں اپنے ان دوستوں کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اس قسم کی 'ہا ہو' سے نہ اسلام کی توقیر میں اضافہ ہوتا ہے اور نہ مسلمانوں کی عزّت میں۔ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ اس سے ساری دنیا میں مسلمان طعنوں اور تضحیک کا نشانہ بنتے ہیں۔ غیر مسلموں پر حضورؐ کی تصویریں شائع کرکے مسلمانوں کی دل آزاری کا الزام دینے والے نوجوانوں کو شاید اس بات کا علم نہیں کہ ایران اور مصر جیسے ممالک میں حضورؐ کی فرضی تصویریں عام بکتی ہیں، اس لئے ہمیں امریکہ، جرمن، فرانس اور برطانیہ سے آئے ہوئے ہپیوں کی بجائے ایران، مصر اور دوسرے عرب ممالک سے آئے ہوئے ان مہمانوں کی مرمّت کرنا چاہیئے تھی کہ جن کے ہاں حضور کی خیالی تصویریں کھُلے عام بکتی ہیں۔ میں اپنے جوشیلے نوجوانوں کو مشورہ دوں گا کہ وہ مصر اور ایران کے بازاروں میں ان تصویروں کی فروخت کے خلاف بھی ایک پُر امن مظاہرے کا انتظام کریں تاکہ ان ممالک کو بھی ہمارے جذبات کی شدّت کا احساس ہوسکے۔

'مِک آف نالج' کا مصنف چونکہ پچاس ساٹھ برس قبل ہی اس دارِ فانی سے

کوچ کر گیا ہے، اس لئے اُسے پھانسی کی سزا نہیں دی جا سکتی، میری تجویز یہ ہے کہ اس کے بدلے اننت ناگ کالج کے اس طالب علم کو پھانسی کی سزا دی جائے کہ جس نے سب سے پہلے اِس کتاب کے اسی صفحے پر نگاہ ڈالنے کا جُرم کیا کہ جس پر آنحضرتؐ کی خیالی تصویر شائع ہوئی ہے۔ اس طالب علم کے ان دو ساتھیوں کو بھی عمر قید کی سزا دینی چاہیئے، کہ جنہوں نے اس کتاب کو جلانے کی بجائے اسے اتنی تشہیر دی کہ لاکھوں مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے۔ اب رہی بات 'ٹک آف نالج، کی تو جس کتاب سے نوجوانوں کے ذہن اِس درجہ معطل اور ماؤف ہو جائیں کہ وہ اپنا توازن کھو بیٹھیں، اس لئے اس کتاب کو ٹک آف نالج کی بجائے ٹک آف نالج کہنا چاہیئے اور اس کے تمام نسخے جمع کر کے جلا کر راکھ کر دینے چاہیئے۔

(۳۱ مئی ۷۳ء)

باغِ نسیم میں بادِ سموم

چراغ بیگ یہ کہہ کر کسی راز کا افشار نہیں کر رہا ہے کہ کشمیر یونیورسٹی کے لئے ایک عرصے سے ایک عدد وائس چانسلر کی تلاش ہو رہی ہے اور ابھی تک ملک بھر میں کسی ایسے موزوں اور مناسب شخص کا سراغ نہیں مل سکا ہے کہ جو صاحب علم ہونے کے ساتھ ساتھ عمل اور انتظام کی صلاحیتیں بھی رکھتا ہو اور پھر کشمیر یونیورسٹی کی وائس چانسلری پر بھی آمادہ ہو۔ جو لوگ علم و عمل دونوں میں یکتا ہیں، وہ کشمیر یونیورسٹی کا نام سُنتے ہی کانوں میں اُنگلیاں دبا دیتے ہیں۔ اور جن کے پاس نہ علم ہے اور نہ عمل، وہ بھی کشمیر یونیورسٹی سے وابستہ ہو کر اپنی شہرت اور نیک نامی کو نقصان پہنچانے کیلئے تیار نہیں، یہی مسئلہ جمّوں یونیورسٹی کو در پیش ہے۔

یوں تو ہماری ریاست میں تیل خاکی سے لے کر روغنِ بادام تک ہر چیز نایاب ہے لیکن وائس چانسلروں کی نایابی ہماری عزّت، شہرت اور غیرت کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ اور ہمیں اس کا مقابلہ کرنے سے پہلے ان اسباب و علل کا جائزہ لینا ہوگا کہ جن کی بنا پر ہماری یونیورسٹی کا مرتبہ اتنا گر گیا ہے کہ صاحبانِ علم و فضل کی تو بات ہی نہیں، پبلک اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر بھی اس "عزّت افزائی" کو ذلّت و رسوائی سمجھ کر ٹھکرا دیتے ہیں۔ یہ ہماری تعلیمی اور تہذیبی زندگی کا سب سے بڑا سانحہ ہے!

ملک بھر کی یونیورسٹیوں میں جو بد نظمی، بے راہ روی اور افراتفری پھیلی ہوئی ہے

اُس کو نگاہ میں رکھتے ہوئے کشمیر یونیورسٹی کا حال احوال زیادہ بُرا نہیں۔ بلکہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ دلّی، لکھنؤ، الٰہ آباد، بنارس، علی گڑھ کے مقابلے میں کشمیر یونیورسٹی کا ماحول پُر فضا ہی نہیں پُر امن بھی ہے۔ ابھی حال ہی میں لکھنؤ یونیورسٹی کے منچلوں نے تو یونیورسٹی کی عمارت کو نذرِ آتش کر کے بدمعاشی، بدکرداری اور بیہودگی کے مقابلے میں اپنے ملک کی ہی نہیں، دنیا بھر کی یونیورسٹیوں کو شکست دے دی ہے۔ اس پس منظر میں کشمیر یونیورسٹی کا ماحول یقیناً پُر امن بھی ہے اور باعثِ رشک بھی، کیونکہ ہمارے ہاں کے طالب علم عمارتیں جلانے کی بجائے شیشے توڑنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور وہ بھی گاہے گاہے، لیکن اس کے باوجود اگر کشمیر یونیورسٹی کا معیار وقار اور اعتبار سب کچھ مشکوک ہے۔ تو اس کے اسباب جاننے کے لئے مزید کچھ جاننا پڑے گا اور میں آج اس صفحے کو اسی تلاش اور تشخیص کی نذر کر رہا ہوں۔

کشمیر یونیورسٹی کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ اپنے قیام سے لے کر اب تک اسے آصف اصغر علی فیضی کے سوا کوئی قابلِ ذکر اور عظیم المرتبت وائس چانسلر نصیب نہیں ہوا۔ کے۔ این۔ پانیکر بہت بڑے عالم، مورخ اور زمانہ شناس بزرگ تھے لیکن بدقسمتی سے وہ اپنی زندگی کے اُس دور میں یہاں وائس چانسلر بن کر آئے کہ جب آدمی تھک تھکا کر آرام اور عافیت کی زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے علم وفضل، مرتبے اور عظمت کے باوجود یونیورسٹی پر اپنی شخصیت کی چھاپ ڈالنے میں ناکام رہے۔ وہ آرام کرنے آئے تھے آرام کر کے چلے گئے۔ آصف اصغر فیضی کے دل میں یونیورسٹی تعمیر کرنے کا جذبہ ہی نہیں جنون بھی تھا۔ وہ کشمیر یونیورسٹی کو ایک مثالی یونیورسٹی بنانے کے لئے بے چین اور بے قرار تھے اور ان کی خواہش تھی کہ یہ درس گاہ صرف ڈگریاں تقسیم کرنے کی مشین بن کر نہ رہے بلکہ ذہنی تربیت، فکری آزادی اور قومی شخصیت کی تعمیر کا سب سے مؤثر اور فعال ادارہ بنے، لیکن بدقسمتی سے فیضی صاحب یہاں اس وقت تشریف لائے جب بخشی صاحب اپنے اقتدار کے عروج پر تھے۔ بخشی صاحب میں بہت سی خوبیاں تھیں، لیکن یونیورسٹی کی اہمیت، تحقیق و تجسّس کی افادیت اور قومی زندگی

یں یونیورسٹی کے مقام اور مرتبے کو سمجھنا مرحوم کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ یونیورسٹی اور پنچایت گھر، وائس چانسلر اور حلقہ پریذیڈنٹ میں فرق نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے فیضی صاحب کے ساتھ ان کی نہ نبھ سکی۔ اور بے چارے فیضی اپنے علم وفضل اور اپنے خوابوں کا پٹارہ لے کر ایک دن یہاں سے چل دیئے۔ اس کے بعد جتنے بھی وائس چانسلر صاحبان آئے اُن میں سے کسی پر دانش وری کی تہمت بھی نہیں لگائی جاسکتی، بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے قضا و قدر کے مالکوں کے دل میں کبھی اس یونیورسٹی کو صحیح بنیادوں پر تعمیر کرنے کا خیال پیدا ہی نہیں ہوا۔ اور میرے پاس اس امر کی تحریری شہادت موجود ہے کہ خود جواہرلال نہرو بھی کشمیر یونیورسٹی کو علم و دانش، تحقیق و تربیت اور ذہنی تعمیر کا ایک باوقار ادارہ بنانے کے لیۓ کوشاں نہیں تھے، ان کے لئے کشمیر کا "سیاسی کھیل" یہاں کے تعلیمی نظام سے زیادہ اہم اور سنجیدہ تھا۔ یونیورسٹی کے تئیں اربابِ اقتدار کا یہی رویہ علم و دانش کی اس درسگاہ کے زوال اور رسوائی کا باعث بن گیا ہے بخشی صاحب کے لئے یونیورسٹی، میڈیکل کالج، انجینیرنگ کالج ملازمین مہیا کرنے کے وسیلے تھے، اس لئے انھوں نے ان تمام اداروں میں سارے جہاں کا کچرا بھرلیا۔ جو کمی رہ گئی تھی، وہ صادق صاحب مرحوم نے اپنے دورِ اقتدار میں پوری کردی۔ اب رہے قاسم صاحب تو ان کو نالہ مار کی سیاست سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ یونیورسٹی جیسے بیکار اور بے مصرف اداروں کی دیکھ بھال میں اپنا وقت ضائع کریں۔ نتیجہ یہ کہ یونیورسٹی ایک لاولد اور لاوارث بچّے کی طرح مقصد سے ناواقف، مستقبل سے بے نیاز اور منزل سے ناآشنا اپنے سفر پر گامزن ہے۔

یونیورسٹی، نہ مکتب ہے اور نہ مدرسہ، یہ اسکول اور کالج سے بھی مختلف ہے اور جو لوگ یونیورسٹی کی تعریف سے واقف نہیں، وہ اس کو بنانے اور چلانے کے اہل بھی نہیں ہوسکتے۔ مکتب، مدرسے، اسکول اور کالج طالب علموں کو یونیورسٹی تک پہنچنے کے لیۓ تیار کرتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے تعلیمی نظام میں ان کی اہمیت کچھ کم نہیں ہے لیکن یونیورسٹی کا تصور تعلیمی نظام تک ہی محدود نہیں، پوری زندگی پر حاوی ہوتا ہے۔

یہاں روایت کا خاتمہ اور بغاوت کا آغاز ہوتا ہے ۔ یہاں یقین کا اندھیرا کم اور گمان کا اُجالا زیادہ ہوتا ہے ۔ یہاں تعلیم کو علم اور اعتقاد کو آگہی کا درجہ حاصل ہوتا ہے ۔ یہاں ہر استاد طالب علم اور ہر شاگرد اپنا استاد نظر آتا ہے ۔ جہاں جغرافیائی بندھن ٹوٹ کر تاریخی رشتوں کا تسلسل سمجھ میں آجاتا ہے اور فرد اپنی ذات کے طلسم سے آزاد ہو کر کائنات میں کھو جاتا ہے ۔ یونیورسٹی کا ماحول کچھ بھی ہو اس کا مقصد یہی ہے کہ اُس چار دیواری میں سانس لینے والا تعصبات کی قید اور توہمات کی زنجیروں سے آزاد ہو کر صرف علم اور عقل پر اعتبار کرنا سیکھ لے ۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی دنیا میں یونیورسٹی کو سماجی انقلاب ، سیاسی تبدیلیوں اور ذہنی نشو ونما کے اہم ترین مراحل میں مرکزی حیثیت حاصل ہے ۔ اور مغربی ممالک میں بجا طور پر یونیورسٹیاں قومی زندگی کا اہم ترین جزو ہیں ۔ برطانیہ میں تو آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں کو برطانوی پارلیمنٹ سے بھی زیادہ محترم ، مقدس اور اہم سمجھا جاتا ہے ۔ علم و دانش کی یہ درس گاہیں ذہنوں کو وسعت ، فکر کو بالیدگی ، شعور کو پختگی اور شخصیت کو نکھارتی ہیں ۔ اور اس طرح نوجوانوں کو اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے اور اپنے فرائض نبھانے کے اہل بنا دیتی ہیں ۔ یونیورسٹی کا ماحول ، وہاں کی زندگی صرف یونیورسٹی میں تعلیم پانے والے طالب علموں کو ہی نہیں ، پورے شہر ، سماج بلکہ سارے ملک کی زندگی کو متاثر کرتی ہے اور اسی لئے یونیورسٹی کی تعمیر میں ایک مقصد اور ایک آئیڈیل ہونا چاہیئے ۔ بد قسمتی سے کشمیر میں یونیورسٹی قائم کرنے والوں کے سامنے نہ کوئی مقصد تھا اور نہ کوئی آئیڈیل اور یہی وجہ ہے کہ گزشتہ ۲۴ برسوں سے ہمارے ہاں "یونیورسٹی" تو ہے لیکن مدرسے اور مکتب سے بھی بد تر ، نہ یہاں علمی اور ادبی سرگرمیوں کی کوئی روایت ہے اور نہ تحقیق کا ماحول ، نہ روایت کا احترام اور نہ بغاوت کا حوصلہ ، نہ پانے کی لگن اور نہ کھو جانے کا سلیقہ ، ملک بھر کی یونیورسٹیوں میں بدنظمی اور افراتفری کے باوجود طالب علموں کی ایک کثیر تعداد سنجیدہ تحقیقی اور تعلیمی موضوعات پر اپنی توجہ صرف کر رہی ہے ۔ ہر یونیورسٹی میں علمی مسائل اور ادبی مباحث پر سمینار منعقد ہو رہے ہیں ۔ مقالے لکھے جا رہے ہیں ، میگزین شائع

ہو رہے ہیں۔ ملک کے درپیش مسائل پر مباحثے ہو رہے ہیں۔ اور لائبریریوں میں سینکڑوں
طالب علم صبح سے شام تک مطالعے میں محوِ نظر آتے ہیں۔ یہ سب کچھ محدود پیمانے پر
ہو رہا ہے اور جتنا ہونا چاہیئے تھا اتنا نہیں ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود کچھ نہ
کچھ ہو رہا ہے۔ اس کے مقابلے کشمیر یونیورسٹی کو دیکھئے تو یہاں قبرستان کی سی
خاموشی ہے۔ نہ کوئی علمی مباحثہ ہے اور نہ ادبی مناظرہ۔ خدا خدا کر کے اس سال اقبال کی یاد
میں ایک ہفتہ منانے کا پروگرام تیار ہوا تھا۔ طالب علموں کے ادبی ذوق میں یک لخت
کچھ ایسا اُبال آگیا کہ یہ پروگرام شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا اور اقبال کی یاد
منانے کے لئے دور دور سے آئے ہوئے دانشور اور مقالہ نگار اپنی خیر منا کر چلے گئے۔ کئی
سال سے یونیورسٹی کے اہتمام سے کوئی "توسیعی تقریر" نہیں ہوئی ہے۔ اور یونیورسٹی کے
ایک بہت بڑے ذمہ دار افسر نے چراغ بیگ کو بتایا کہ "ہم اس قسم کی کوئی تقریر یا
تقریب منعقد کر کے یونیورسٹی کے "پُرامن" ماحول کو خراب کرنے کا خطرہ RISK مول
لینے کے لئے تیار نہیں۔" دوسرے الفاظ میں کشمیر یونیورسٹی امتحان لینے اور ڈگریاں
بانٹنے کی ایک مشین بن کر رہ گئی ہے۔ اور کسی علمی، ادبی، تحقیقی، تنقیدی، تعمیری موضوع
پر اظہارِ خیال کا موقع فراہم کرنا یونیورسٹی کے مقاصد اور نصاب میں شامل نہیں۔ یہی
وجہ ہے کہ اس یونیورسٹی سے ایم۔ اے اور پی، ایچ، ڈی کی ڈگریاں حاصل کرنے والوں
کو دنیا تو کیا اپنی بھی کچھ خبر نہیں ہوتی، کیوں نہ ہو، جب یونیورسٹی کے اربابِ اختیار نے
امتحانات کو اتنا آسان اور "ماڈرن" بنا دیا ہے کہ پڑھے لکھے بغیر عالم فاضل بننا پہلے
دشوار تھا، اب دشوار نہیں۔ یونیورسٹی لائبریری سے وابستہ ایک صاحب نے مجھے بتایا
کہ یونیورسٹی لائبریری سے استفادہ اُٹھانے والے طالب علموں کی تعداد کسی حالت میں بھی
دو فیصد سے زیادہ نہیں، اور لائبریری ریڈنگ روم میں زیادہ تر اُلّو بولتے نظر آتے ہیں۔
ایک اور ذمہ دار افسر نے بتایا کہ یونیورسٹی کی طرف سے لائبریری سے استفادہ کرنے
کے خواہشمند طالب علموں کے لئے شہر سے نسیم باغ تک ایک خاص بس کا اہتمام کیا گیا تھا۔
لیکن کسی طالب علم کو اس رعایت سے مستفید ہونے کی توفیق نہ ہوئی۔ تو پھر یہ سروس بند کر دی گئی۔

جو بات طالب علموں پر صادق آتی ہے اس کا اطلاق کم و بیش یونیورسٹی میں پڑھانے والے اساتذہ کرام پر بھی ہوتا ہے اور اگر میرے یہ کرم فرما مجھے معاف کر دیں تو میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ طالب علموں میں علم و ادب، تحقیق اور مطالعے کے ذوق و شوق کا فقدان دراصل اساتذہ کی نالائقی، ناکامی اور نامرادی کا نتیجہ ہے۔ ہماری یونیورسٹی میں کتنے ایسے استاد ہیں کہ جو طالب علموں کے ذوق کی تربیت اور ان کی شخصیت کی تعمیر کا سلیقہ رکھتے ہیں؟ ہماری یونیورسٹی میں تیار ہونے والے ان دانشوروں کے متعلق ہی اقبال نے کہا تھا ؎

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسوں میں
نہ تراشِ آذرانہ نہ ادائے کافرانہ

اقبال ہی کے الفاظ میں یہ کتاب خواں تو ہیں مگر صاحبِ کتاب نہیں۔ اور جب تک ہماری یونیورسٹی کتاب خوانوں کی بجائے صاحبِ کتاب پیدا نہیں کرتی، اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے اور یہ اس ریاست کی کتنی بڑی بدقسمتی ہے کہ حکمرانوں اور سیاستدانوں دونوں کی نظر میں یونیورسٹی کو نالہ مار اور سری نگر میونسپلٹی سے بھی کم اہمیت حاصل ہے۔ اب رہے ہماری یونیورسٹی کی آن بان اور شان پڑھانے والے طالب علم اور طالبات سو اُن کے حق میں یہ دُعا کرتا ہوں کہ ؎

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

جب تک چراغ بیگ کی یہ دعا قبول نہیں ہوتی، ہماری یونیورسٹی کے لئے کوئی صاحبِ نظر وائس چانسلر ملنا ممکن نہیں اور تعجب نہیں کہ ہمیں اس منصبِ جلیل کے لئے ٹینڈر طلب کر کے کم سے کم ٹینڈر دینے والے کی خدمات حاصل کرنی پڑیں۔ اور اس طرح باغِ نسیم میں بادِ سموم کے جھکڑ چلتے رہیں۔

(۱۵ رجون ۷۳ء)

کمپنی کی مشہوری

یہ ابھی چند سال پہلے کی بات ہے کہ ادبی فورم اور سوسائٹیاں سکولوں اور کالجوں میں تعلیمی پروگرام کا ایک ناگزیر حصہ سمجھی جاتی تھیں اور چراغ بیگ کے زمانے میں تو ایس، پی، کالج میں ایک نہیں، کئی فورم تھے جو ہر ہفتے کسی نہ کسی موضوع پر مباحثے یا مناظرے کا اہتمام کرتے۔ بڑی بڑی آنکھوں اور خوبصورت بالوں والے ایک پروفیسر ٹی، این، بھان، اِن تمام ادبی سرگرمیوں کے روحِ رواں تھے اور میں نے اپنی پہلی افسانوی تخلیق 'پیار کی ہار' اُن ہی کی صدارت میں پڑھکر سُنائی تھی۔ اس بات کو صرف پندرہ سال ہوگئے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ کئی یُگ بیت گئے ہوں۔ اب نہ کالجوں میں ادبی مباحثے ہوتے ہیں اور نہ افسانوں کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔ نہ مشاعرے ہوتے ہیں اور نہ مناظرے، غالباً اس قسم کی سرگرمیوں کو تضیع اوقات سمجھ کر طالب علموں کو ان سے دور رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ فکری جمود اور ادبی انحطاط کے اس ماحول میں جب امر سنگھ کالج (سری نگر) میں ایک ادبی محفلِ مذاکرہ میں شرکت کا دعوت نامہ ملا، تو بڑی خوشی ہوئی۔ ۲۳ جون کو ساڑھے چار بجے شام جب کالج پہنچے تو ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہم شادی کی تقریب میں شرکت کے لئے آئے ہیں۔ چاروں طرف بڑی گہما گہمی تھی۔ طالب علم مہمانوں کا استقبال کرنے کے لیے سڑک کے دونوں طرف مؤدبانہ انداز میں کھڑے تھے اور پرنسپل محمد یوسف صاحب اپنے ہونٹوں پر ایک دلکش مُسکراہٹ اور سر پر ایک عدد پگڑی سجائے بالکل دولہا نظر آرہے تھے۔ چشم بد دور کسی ادبی محفل کے لئے

ایسا انتظام اور اہتمام پہلی مرتبہ دیکھنے میں آرہا تھا۔ چند ہی منٹ بعد یہ غلط فہمی دور ہوگئی۔ محفلِ مذاکرہ کا افتتاح جناب شیخ محمد عبداللہ اور اس کی صدارت وزیر اعلیٰ سید میر قاسم کرنے والے تھے۔ اور یہ ساری تیاری ان ہی کی آمد کے سلسلے میں تھی۔ ایک ادبی اجتماع میں شرکت کے لئے اتنی بڑی سیاسی توپیں جمع کرنے کا کیا مقصد تھا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی، لیکن ادبی نشست کا اہتمام میرے لئے بجائے خود اتنی بڑی بات تھی کہ میں نے یہ سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی کہ محفلِ مذاکرہ کے آغاز میں پرنسپل صاحب نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور پروفیسر ٹی، این، بھان نے کالج کی ادبی سرگرمیاں کا جائزہ لیتے ہوئے ادبی اور تاریخی مباحث کی اہمیت کا ذکر کیا۔ اس کے بعد جونہی شیخ صاحب اپنی افتتاحی تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوگئے کالج کے اطاعت گذار، تابعدار، فرمانبردار اور مہمان نواز طالب علم ہاتھوں میں کولڈ ڈرنکس کی بوتلیں لئے ہوئے ہال میں داخل ہوگئے۔ اور مہمانوں کی تواضع شروع ہوگئی۔ بوتلوں کے ٹکراؤ، میزبانوں کے اہتمام اور مہمانوں کی پیاس، ان تینوں عناصر نے ملکر محفل کا رنگ ہی بدل دیا اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہم کسی مقامی سینما میں 'انٹرول' کا وقفہ گذار رہے ہیں۔ شیخ صاحب نوجوانوں کو صداقت اور شجاعت کا درس دے رہے تھے، لیکن نوجوان کولڈ ڈرنک پی اور پلا رہے تھے۔ اس لئے سامعین میں سے اکثر لوگ شیخ صاحب کی تقریر نہ سُن پائے مد منتظمین کی خدمت میں گذارش ہے کہ آئندہ جب وہ اس قسم کی کوئی مجلس منعقد کریں تو محفل شروع ہونے سے پہلے یا اس کے ختم ہونے کے بعد مہمانوں کی خاطر تواضع کیا کریں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس محفلِ مذاکرہ کا مقصد ادب، تحقیق اور تاریخ کی خدمت سے زیادہ "اپنی کمپنی کی مشہوری" تھا۔ ورنہ بیک وقت شیر کشمیر اور میرِ کشمیر کو مدعو کرنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟

محفلِ مذاکرہ کا پہلا مقالہ جناب ڈاکٹر اکبر حیدری نے پڑھا۔ اور اس کا موضوع تھا "چک اور حبہ خاتون"۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ تاریخی مطالعہ ایک دلچسپ افسانہ ثابت ہوا۔ اور اس میں انہوں نے تخلیق کی بجائے تعریف اور تنقید کی بجائے تدبیر سے کام لیا تھا۔

نتیجہ یہ کہ اپنے آدھے گھنٹے کے مقالے میں وہ ایک آدھ نئی بات بھی نہ کہہ پائے۔ اُنھوں نے "تاریخ حسن" کے صفحات کے صفحات نقل کر دئے تھے۔ صرف اس احتیاط کے ساتھ کہ چک خاندان کی بُرائیاں بھی خوبیاں نظر آئیں۔ حیدری صاحب جب اپنا طویل مقالہ ختم کر کے بیٹھ گئے، تو کچھ لوگ یہ پوچھنے لگے کہ وہ 'حبہ خاتون' کیا ہوئیں؟ کیونکہ اس مقالے میں ایک بار بھی ان کا نام نہیں آیا تھا۔ اس مرحلے پر معلوم ہوا کہ حیدری صاحب کا مقالہ ختم نہیں ہوا ہے بلکہ اس کا انٹرول ہو گیا ہے۔ پہلے وزیر اعلیٰ کی صدارتی تقریر ہو گی اور پھر مقالے میں حبہ خاتون کی تلاش شروع ہو گی۔ وزیر اعلیٰ نے اپنی صدارتی تقریر میں یوسف چک اور حبہ خاتون کی بجائے اپنی ناسازیٔ طبع اور گورنر بھگوان سہائے کے اعزاز میں ان کی طرف سے دی گئی الوداعی تقریب میں شرکت کا ذکر کیا۔ اور چل دئے۔ ان کے ساتھ ہی مرزا محمد افضل بیگ اور دوسرے کئی سمجھ دار لوگ بھی نکل گئے، لیکن ہم بیٹھے رہے اور پھر بہت دیر تک اپنی حماقت پر ماتم کرنے کے بعد چلے آئے۔ حیدری صاحب کا انٹرول کے بعد والا مقالہ بھی بہت مایوس کن اور مضحکہ خیز تھا۔ اس کے خاتمے پر جب کشمیری زبان کے مشہور افسانہ نگار اختر محی الدین نے فاضل مقالہ نگار سے ان کے کچھ بیانات اور نتائج کی وضاحت چاہی تو نہ صرف پرنسپل محمد یوسف بلکہ وزیر تعلیم مسٹر عبد الغنی لون نے اختر صاحب کو اس قسم کی "شر انگیزیوں" سے باز رہنے کی تلقین کی۔ لون صاحب نے اختر محی الدین سے مخاطب ہو کر کہا کہ "سوالات پوچھنے کی اسی عادت سے طالب علموں میں بے راہ روی بڑھ جاتی ہے"۔ مطلب یہ کہ ہر بات سُن لو۔ اور جو سُنو، اس پر اپنی رائے ظاہر کرنے سے پرہیز کرو، کیوں کہ اس سے نقصِ امن کا اندیشہ ہے۔ زندہ باد لون صاحب، اس ریاست کے لئے آپ ہی جیسا وزیر تعلیم موزوں اور مناسب ہے!

ادبی محفلوں اور مباحثوں میں اگر سُننے والوں کو سُنانے والے سے کسی بات کی وضاحت کا حق حاصل نہیں، تو پھر اس قسم کی محفلیں منعقد کرنے کا مقصد

کیا ہے ؟ ایسی مجلسوں میں پڑھے جانے والے مقالات کو سننے کے لئے شیخ
صاحب ، قاسم صاحب اور بیگ صاحب کی بجائے علمی اور ادبی موضوعات سے
دلچسپی رکھنے والے لوگوں کو بُلانا چاہیئے ۔ اور جب اس قسم کے لوگوں کو بُلایا
جائے تو پھر تبادلۂ خیال کی آزادی ہونا چاہیئے ۔ تاکہ سُننے اور سُنانے والے دونوں
کی بصیرت اور بصارت میں اضافہ ہو ۔ امرسنگھ کالج کی محفلِ مذاکرہ اس اعتبار
سے ناکام رہی اور اس کی ناکامی کا پرنسپل محمد یوسف اور پروفیسر ٹی ، ایس ، بھان
سے زیادہ چراغ بیگ کو دُکھ ہے ۔

(۳۰ ؍ جون ۷۳ ۶)

چرسبانِ کشمیر کا سپاسِ عقیدت

شیر کشمیر کی خدمت میں!

پچھلے ماہ "شود گانِ تکیہ گاؤ کدل نے جناب شیخ محمد عبداللہ کو اپنے ہاں ایک خصوصی تقریب پر مدعو کرکے ان کی خدمت میں ایک استقبالیہ ایڈریس پیش کیا۔ اور شیخ صاحب نے ایک دلچسپ اور مختصر سی تقریر میں اس کا جواب دیا۔ ہمیں اگرچہ بہ نفس نفیس اس تقریب میں شرکت کی سعادت حاصل نہیں ہوسکی۔ تاہم ہمارے نمائندے نے تخئیل کی مدد سے اس "تاریخی اجتماع" کی تحریری رپورٹ مرتب کی ہے جو قارئین "آئینہ" کی نظر کی جاتی ہے (ادارہ)

قائدِ اعظم! ہم آپ کے بیحد مشکور ہیں کہ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود آپ یہاں قدم رنجہ ہوئے، ہم فقیروں کے پاس آپ کی تواضع کے لیے صرف ایک ہی چیز ہے، لیکن آپ چونکہ اس سے شغل نہیں فرماتے، اس لیے ہم یہ چیز آپ کی خدمت میں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ آپ کی تشریف آوری ہمارے لیے باعثِ عزت بھی ہے اور وجہ مسرت بھی، اور ہم امید رکھتے ہیں کہ آپ

آئندہ بھی کبھی کبھی فقیروں کی خبر لینے کے لیے ہمارے تکیے پر آیا کریں گے۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ہم نے ریاست کے تمام چرسیوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کرنے کے لیے "آل جموں وکشمیر انجمن چرسیاں" کا قیام عمل میں لایا ہے۔ اور ہم عنقریب ہی اس تاریخی مقام پر جہاں ہم آپ کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔ ریاست کے تمام چرسیوں کا ایک عظیم الشان کنونشن منعقد کر رہے ہیں۔ اس کنونشن کی صدارت کے لیے ہم نے شاہنشاہِ چرسیاں پنڈت رچرڈ نکسن کو دعوت نامہ بھیجا ہے۔ وہ اگر کسی وجہ سے تشریف نہ لا سکے تو پھر آپ کو ہی یہ بوجھ اُٹھانا پڑے گا۔

جناب شیر کشمیر! آپ جانتے ہیں کہ ہم فقیروں نے اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی اس کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ اور ہمارے لیے دولت، ثروت، طاقت اور عزت کوئی حقیقت نہیں رکھتے! ہم نہ کسی حکومت کو خاطر میں لاتے ہیں اور نہ کسی حاکم سے مرعوب ہوتے ہیں۔ ہم اپنی دنیا کے بادشاہ ہیں اور ہمیں کسی سے کوئی غرض نہیں۔ ہم شاہی میں گدائی اور گدائی میں شاہی کے قائل ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ تنظیمات اور تضادات سے بھرپور اس دنیا میں ہم انفرادیت برقرار رکھ سکے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہم نے اس ریاست کو آزاد کرنے کی جدوجہد میں کوئی حصّہ نہیں لیا۔ لیکن ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم نے بغیر کسی جدوجہد کے اپنے آپ کو آزاد کر لیا ہے۔ اور ہم ساری دنیا کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ ہمارے راستے پر چل کر اپنے آپ کو آزاد کرے ہم آپ کو کیوں کر بتائیں کہ چرس کے ایک دو کش لگانے سے ہی غلامی کی زنجیریں کس طرح چھنا چھن کٹ جاتی ہیں اور انسان اپنے آپ کو شہنشاہِ چین سمجھنے لگتا ہے۔ اس وقت آپ کے سامنے جو چرسی حضرات بیٹھے ہیں انہیں آپ معمولی حضرات نہ سمجھئے، ان میں سے کوئی پنڈت نکسن ہے، تو کوئی مولوی کوسی جن، کوئی سکندر بت شکن ہے، کوئی مہاراجہ ہری سنگھ، غرض شخص اپنی دھن میں مست اور اپنی مستی میں اپنی ہستی بھول چکا ہے، اور یہ ایک معمولی سا کرشمہ ہے اس نعمتِ خداداد کا جسے آپ لوگ چرس اور

ہم آب حیات کہتے ہیں! اے کاش! ہماری ہی طرح ساری دنیا اس آب حیات سے فیض یاب ہو کر جھوٹے بندھنوں کو توڑ کر ٹوٹے دلوں کو جوڑ سکتی بمقام شکر ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے ملکوں میں چرس کی اہمیت اور عظمت کو بڑی تیزی کے ساتھ سمجھا جا رہا ہے اور ہماری برادری میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس اور جرمنی سے آئے ہوئے ہزاروں چرسی، جنہیں عرفِ عام میں ہپی کہا جاتا ہے۔ اس امر کی شہادت ہیں کہ ہمارا پیغام منصور اور گاؤ کدل کے تکیوں سے نشر ہو کر واشنگٹن، لندن، پیرس اور برلن تک پہونچ چکا ہے۔ دنیا رفتہ رفتہ ہمارے ہی دکھائے ہوئے راستے پر گامزن ہو رہی ہے اور وہ دن دور نہیں کہ جب مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک چرسیوں کا ہی راج ہوگا۔

محترم شیخ صاحب! ایک طرف جہاں ساری دنیا میں چرسیوں کا زور بڑھتا جا رہا ہے تو دوسری طرف اس ریاست میں ہم چرسیوں کے ساتھ شدید ناانصافیاں ہو رہی ہیں۔ ہمیں نہ ملکی معاملات میں نمائندگی دی جاتی ہے اور نہ روزمرّہ کی زندگی سہولیات بہم ہیں جان بوجھ کر ہمارا سماجی رتبہ گرانے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہم نے آزادی کی جنگ میں کوئی عملی حصّہ نہیں لیا، لیکن یہ قوم کیا خواجہ عمر بٹ مرحوم کو بھول سکتی ہے کہ جس نے اپنی عمر کا بیشتر حصّہ آزادی کی جنگ میں صرف کیا۔ اور آپ سے بہتر یہ بات کون جا سکتا ہے کہ مرحوم ہماری برادری کے ایک معزز اور محترم رکن تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ تحریک حریت کے دوران اکثر چرس گاہیں قومی رہنماؤں کے لیے پناہ گاہوں کا کام دیتی رہیں، اور بعض رہنما کبھی کبھی اپنا غم غلط اور اپنا دم صحیح کرنے کے لیے دو ایک کش بھی لگا لیا کرتے تھے۔ چرسیوں اور چرس گاہوں کی ان ہی خدمات کے پیش نظر آپ نے اپنی کابینہ میں ہماری برادری کے ایک صاحب کو بھی شامل کر لیا تھا لیکن ۱۹۵۳ء میں آپ کی گرفتاری کے بعد سے اب تک کوئی

معتبر اور مصدقہ چرس نوش کابینہ میں نہیں لیا گیا ہے حالانکہ گفتار اور کردار کے اعتبار سے موجودہ کابینہ کے اکثر وزیر چرسی ہی معلوم ہوتے ہیں، ہم آپ کی وساطت سے وزیر اعلیٰ سید میر قاسم سے گزارش کرتے ہیں کہ ہماری خدمات اور مشکلات کے پیشِ نظر ہمیں باضابطہ طور پر کابینہ میں نمائندگی دی جائے۔ تاکہ اُن کی کابینہ کے نقلی چرسی، ہم اصلی چرسیوں کو بدنام کرنے کا باعث نہ بنیں۔

عظیم رہنما! جب سے یہ ملک آزاد ہو گیا ہے ہمیں طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور اس ملک کے حاکم ہم فقیروں کی زندگی کو اجیرن بنانے میں کوئی دقیقہ فردگزاشت نہیں کر رہے ہیں۔ شہر میں بجلی نہیں ہے تو ہمیں اس کا کوئی غم نہیں، کیونکہ ہم میں سے ہر چرسی کے اندر ایک جنریٹر لگا ہوا ہے، جس سے ہم روشنی حاصل کرتے ہیں، شہر میں پانی نہیں ہے تو ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہم شرابِ معرفت سے اپنی پیاس بجھا لیتے ہیں۔ ملک میں خوراک نہیں تو ہمیں اس کی کیا غرض، ہم تو اپنا لہو پی کر زندہ رہیں گے، کپڑا نہیں ہے تو ہماری بلا سے، ہم لباسِ فطرت پہن کر بھی جی لیں گے۔ لیکن ہمیں چرس ہی مہیّا نہ ہو تو ہم کیوں کر جئیں گے۔ ہمارے لیے تو یہی چیز بجلی ہے اور پانی بھی، غذا بھی ہے اور لباس بھی، اور ستم ظریفی یہ کہ ہمیں اس شے سے محروم کرنے کے لیے طرح طرح کے قواعد اور قوانین بنائے گئے ہیں۔ سوچیے کہ ہم اس دنیا سے مانگتے ہی کیا ہیں۔ "اک گونہ بے خودی دن رات"، لیکن یہ دنیا والے جو کسی کو خوش، مطمئن اور آسودہ نہیں دیکھ سکتے، ہمیں دو کش لگانے کے لیے چٹکی بھر چرس دینے پر بھی آمادہ نہیں، اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں چرس کی کوئی کمی نہیں۔ اور کم از کم اس میدان میں یہ ریاست خود کفیل ہے۔ آپ کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ اس شہر کے اکثر امرار و شرفار، وزرار، اس شے لطیف کی تجارت کی بدولت ہی امیر، شریف اور وزیر بن گئے ہیں اور بہت سے خونخوار اس بوٹی کی کرامت سے "دین دار" بھی ہو گئے ہیں۔ کچھ لوگ چرس کے کاروبار میں غیر معمولی منافع کما کر

حج بیت اللہ کے لیے جاتے ہیں۔ اور کچھ خرّانٹ بھی ہوتے ہیں کہ جو یہ سوغات لے کر حج پر جاتے ہیں اور اس طرح نہ صرف آنے جانے کا خرچہ نکال لیتے ہیں۔ بلکہ درجنوں گھڑیاں، ٹرانسسٹر اور اب ٹیلی ویژن سیٹ لے کر لوٹتے ہیں، یعنی جو چیز ہمارے لیے شجر ممنوعہ قرار پائی ہے وہ اوروں کے لیے بیک وقت دین و دنیا میں بزرگی اور برتری حاصل کرنے کا ذریعہ بن گئی ہے۔ کیا غضب ہے کہ چرس کے تاجروں کو تو وزیروں اور امیروں کی صف میں جگہ ملے، اور ہم فقیروں کو جو اس شے لطیف کے سہارے اس دنیا کی بدصورتی کو خوب صورتی میں بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نفرت اور حقارت کی نگاہوں سے دیکھا جائے شراب پینے والے بدمستوں کے لیے بیرونی ممالک سے اعلیٰ سے اعلیٰ شراب درآمد کی جائے اور چرس پینے والے فقیروں کو رتی رتی بھر چرس کے لیے ترسایا جائے۔ کلبوں میں بیئر اور وہسکی پی کر بے ہوش ہونے والے شریف کہلائیں، اور تکیوں میں بیٹھ کر چرس پینے والے باہوشوں کو بے خود قرار دیا جائے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ یہ کہاں کی شرافت، کہاں کی انسانیت اور کہاں کا قانون ہے۔ ہم جمّوں و کشمیر کے چرسی ان قانونی پابندیوں اور اخلاقی ضابطوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہیں۔ ہمیں چرس پینے کے اپنے بنیادی حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا اور حکومت کو ہر شہر اور بڑے قصبے میں چرس کی فیئر پرائس دوکانیں کھولنا چاہئیں تاکہ چرس کی ناجائز تجارت بھی رک جائے اور ہم فقیروں کی مشکل بھی حل ہو جائے۔

عظیم رہنما! جس طرح اس ریاست کے مزدوروں طالب علموں، تاجروں اور کسانوں کو آپ سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں، اسی طرح اس ریاست کے چرسی بھی آپ کی ذات بابرکات سے بہت سی اُمیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں اپنا کھویا ہوا منصب اور مرتبہ بحال کرنے میں مدد دیں۔ اس ریاست میں ہر سال ہزاروں کی تعداد میں بیرونی ممالک سے ہپّی اور

ہپیاں وارد ہوتی ہیں اور ان میں سے زیادتر لوگ امریکہ سے آتے ہیں۔ ان کم بختوں نے اپنی ازلی بے شرمی اور بے حیائی سے ہم چرسیوں کا نام ندنام کر دیا ہے۔ یہ لوگ ننگ دھڑنگ شہر کے بازاروں میں پھرتے ہیں اور شاہراہوں پر جنسی فعل کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ہماری اطلاع یہ ہے کہ کچھ "ہپینیں" اتنی خوبصورت اور جاذب نظر ہوتی ہیں کہ ان پر بیک وقت سارا شہر عاشق ہو جاتا ہے۔ اکثر "ہپی" عفونت اور گندگی کے چلتے پھرتے اشتہار نظر آتے ہیں۔ اور اس طرح باہر سے آئے ہوئے ان چرسیوں نے ہماری عزت، شہرت اور شرافت کو سخت نقصان پہونچایا ہے۔ ہم خاندانی لوگ چرس کو معرفت اور نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور اسی لیے سڑکوں اور شاہراہوں کی بجائے تکیوں (چرس کدہ بروزن مے کدہ) پر اپنا وقت (بلکہ اپنی زندگی) صرف کرتے ہیں۔ ہم ہر طرح کی بے شرمی اور بے حیائی کے خلاف ہیں اور صرف بے خودی کے طلب گار ہیں۔ ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ ریاست میں بیرونی ممالک سے آنے والے ہپیّوں کے داخلے پر پابندی عائد کی جائے۔ اس کا فوری فائدہ یہ ہو گا کہ کم از کم اس شہر میں چرس کی بلیک مارکیٹ ختم ہو جائے گی۔ اور ہمیں ایک بار پھر سستے داموں اپنا راشن ملتا رہے۔ کیونکہ امریکی چرسی اپنی دولت کا سہارا لے کر ہم غریبوں کی محبت کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ہم آپ کی وساطت سے اس ریاست کے وزیر اعلیٰ سید میر قاسم سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ شہر اور دیہات کے اصلی چرسیوں کی ایک فہرست تیار کروانے کا حکم دیں اور اس کے ساتھ ہر تکیے کو رجسٹر کروانے کی ہدایت جاری کر دیں۔ اس کے بعد اصلی چرسیوں کو باقاعدہ راشن کارڈ دیئے جائیں اور ہر تکیے کو اس سے وابستہ چرسیوں کی تعداد کے مطابق ماہانہ چرس کا کوٹہ الاٹ کیا جائے۔ وزیر اعلیٰ سے گزارش ہے کہ وہ ہر ماہ اپنا کچھ وقت کسی تکیے پر بھی گزارا کریں۔ تاکہ انہیں دنیاوی مصروفیات اور سیاسی مشغولیات کو بھلا کر اپنی عاقبت سنوارنے

کا بھی موقع ملے، ان کی اطلاع کے لیے یہ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی کابینہ اور کانگریس کے کئی سرکردہ اور برگزیدہ اراکین اکثر شام کو ہمارے ہاں آتے رہتے ہیں، ان میں سے بعض لوگ تو خاندانی چرسی ہیں اور بعض چرس کے راستے ہی وزارت کے منصب تک پہنچے ہیں۔

محترم شیخ صاحب! آپ نے ہم فقیروں کے پاس آنے کے لیے اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ وقت نکالا۔ اس کے لیے ہم چرسی آپ کے بے حد مشکور اور ممنوں ہیں یہ خطبۂ استقبالیہ ختم کرنے سے پہلے ہم آپ کی خدمت میں ایک گزارش کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ گاؤکدل کی اس چرس گاہ (شودہ پنڈت) پر شہر کا ایک رئیس خواجہ غلام حیدر خاں ناجائز طور پر دست اندازی کر رہا ہے۔ اس نے اس کی زمین کو اپنے تصرّف میں لایا ہے اور مزید رقبہ پر بھی قبضہ کرنا چاہتا ہے یہ صورت حال ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ اس لیے ہم آپ سے ملتمس ہیں کہ آپ اس معاملے میں ذاتی مداخلت کر کے ہمارے حقوق کی حفاظت کریں۔ ورنہ ہم براہ راست اقدام کرنے پر مجبور ہوں گے۔ خواجہ غلام حیدر خاں کو معلوم ہونا چاہیئے، کہ ہم اکیلے نہیں ہیں۔ ہمارے رشتہ دار ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ امریکہ، فرانس، برطانیہ اور جرمنی میں ہمارے برادری کے لوگ ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔ اگر ضرورت پڑی تو ہم غلام حیدر خاں کا مقابلہ کرنے کے لیے چرسیوں کے شہنشاہ امریکہ کے صدر پنڈت نکسن سے بھی رجوع کریں گے۔ ہماری گزارش ہے کہ آپ ہماری یہ وارننگ غلام حیدر خاں اور اندرا گاندھی تک پہنچا دیں۔ آخر میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ یہ خطبۂ استقبالیہ ہم سب چرسیوں نے مل کر تیار کیا ہے۔ اور اس عالم میں تیار کیا ہے کہ جب ہم دنیا و مافیہا سے بالکل غافل تھے۔ اس لیے اگر اس میں کسی قسم کی گستاخی یا کوتاہی ہوئی ہو تو ہم سب کو معاف کر دیجیئے کہ ہمیں کچھ علم نہیں ہے کہ ہمیں کیا کہنا چاہیئے تھا اور کیا کہہ گئے۔ ہمارے ہی بارے میں چچا غالب رحمن کے متعلق

تازہ ترین تحقیقات کی رو سے یہ معلوم ہوا ہے کہ چرس کے شیدائی تھے، کہہ گئے ہیں کہ ؎

ہم وہاں ہیں کہ جہاں سے ہم کو بھی ہماری خبر نہیں ہوتی

ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمام نوجوانوں، قومی رہنماؤں اور مذہبی راہبروں کو چرس کی عادت اور علت سے محفوظ رکھے، تاکہ چرس کی قیمتوں میں اضافہ کا کوئی اندیشہ باقی نہ رہے۔ والسلام

ہم ہیں آپ کے تابعدار
چرسیانِ کشمیر
بذریعہ چرسیان ـــــ گاؤ کدل

شیخ صاحب کی تقریر

محترم چرسی بھائیو اور بزرگو!

میں آپ کا مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی ہے اور مجھے آپ کے مسائل سے براہِ راست آگاہ ہونے کا موقع ملا ہے۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ میری آمد پر یہاں بینڈ باجے کا بھی انتظام کیا گیا ہے اور جس طرح سیاسی اور سماجی جلسوں میں سپاسنامے پڑھے جاتے ہیں اسی طرح آپ نے بھی دنیاوی رسوم و رواج کا التزام کیا ہے۔ حالانکہ اصل چرسیوں کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ انہیں دنیا و مافیہا کا کوئی غم نہیں ہوتا اور وہ نہ صرف اس سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ بلکہ اس کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں وہ اتنے کاہل، بے خود اور لاپرواہ ہوتے ہیں کہ وہ بڑے سے بڑے بادشاہوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے، چہ جائیکہ بینڈ باجے اور سپاسناموں کا اہتمام کریں۔ چرسیوں کے متعلق میں نے ایک لطیفہ یہ سنا ہے کہ جب ان سے

کہا گیا کہ چرس پی کر تم لوگ پل صراط کو پار نہیں کر سکتے۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ کیا ضروری ہے کہ ہم پل کے اس پار جائیں، ہم اس پار ہی رہیں گے۔ مطلب یہ کہ انہیں صرف اپنی بے خودی سے غرض ہوتا ہے اور بس۔ آپ کے بینڈ باجے اور سپاسنامے سے کم از کم یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آپ خود بھی اصل چرسی نہیں ہیں اور جس طرح آجکل دودھ، ہلدی، مٹی کے تیل اور کپڑے دھونے کے صابن میں ملاوٹ ہوتی ہے۔ اس طرح چرسیوں میں بھی ملاوٹ پیدا ہوگئی ہے اور خالص دودھ کی طرح خالص چرسیوں کا ملنا بھی محال ہے۔ بہرکیف یہ معلوم نہیں کہ آپ لوگوں نے مجھے یہاں کیوں مدعو کیا ہے جب کہ مجھے زندگی میں کبھی آپ کے مشاغل میں آپ کا ساتھ دینے کی توفیق نہیں ہوئی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میرے ایک بہت ہی عزیز ساتھی اور ہم سفر خواجہ عمر بٹ مرحوم کو اس سے خاص مس تھا۔ اور وہ اکثر صوفیانہ کلام اور موسیقی سے لطف اندوز ہونے کے لیے یہاں آیا کرتے تھے۔ غالباً آپ نے ان ہی کے توسط سے مجھے یاد کیا ہے۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے اس وقت مرحوم کی بہت یاد آرہی ہے۔ وہ بہت نیک، مخلص اور سچے آدمی تھے، جہاں تک ان مسائل کا تعلق ہے کہ جو آپ نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں ابھارے ہیں۔ میرا ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں یہ حکومتِ وقت سے متعلق ہیں۔ اور آپ کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ موجودہ حکومت میں آپ کے بھائی بندوں کی ایک اچھی خاصی تعداد برسرِ اقتدار ہے اور وہ یقیناً آپ کی مشکلات کو اپنی مشکلات سمجھیں گے۔ میں آپ سے گزارش کروں گا کہ آپ اس سپاسنامے کی ایک کاپی وزیرِ اعظم اور وزیرِ اعلیٰ کو ضرور بھیجدیں۔

(۱۵-۲۳-جولائی ۱۹۷۳ء)

چند تاریخی اور تنقیدی لطیفے

سخت مصیبت کا عالم ہو یا شدید گھرے رنج والم کا ماحول، انسان ہنسنے اور ہنسانے کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کر ہی لیتا ہے اور غالبًا اسی مسخرے پن نے ابنِ آدم کو دشوار سے دشوار تر حالات میں زندہ رہنے کا حوصلہ عطا کیا ہے۔ ہر دور کا مزاحیہ ادب اور طنزیہ نگارشات، دراصل اُس دور پر بہترین تنقید کی حیثیت رکھتی ہیں اور یہی بات اُن لطیفوں پر بھی صادق آتی ہے کہ جو ادب کی بجائے 'نوکِ ادب' کی ذیل میں آتے ہیں اور جو ضبطِ تحریر میں تو نہیں آتے لیکن ہر شخص کی نوکِ زبان پر ہوتے ہیں۔ جنگ کا زمانہ ہو یا تشدّد کا دَور، قحط کا دَور دَورہ ہو یا فراوانی کا عالم، آمروں کی فرمانروائی ہو یا جمہوریت کی ہنگامہ آرائی لطیفے باز کسی دَور میں بھی لطیفے تراشنے سے باز نہیں آتے۔ آجکل ہر چیز کی قلّت ہے دیا سلائی سے لے کر ایٹم بم تک کوئی چیز بازار میں دستیاب نہیں، سخت مصیبت کا عالم ہے اور عوام و خواص دونوں ایک ایسی مصیبت میں مبتلا ہیں کہ اِس سے پہلے دیکھنے یا سننے میں نہیں آئی ہے لیکن کمیابی اور نایابی کے اِس دَور میں بھی ہنسنے والے نہ صرف ہنستے ہیں، بلکہ اوروں کو بھی ہنساتے ہیں۔ اس سلسلے میں چراغ بیگ نے اس ہفتے دو ایسے لطیفے سُنے کہ جو بظاہر لطیفے ہیں لیکن اصل میں دورِ حاضر پر بہترین تنقید کا درجہ رکھتے ہیں۔ آئیے آپ بھی اِس "تنقیدِ عالیہ" سے محظوظ ہو جائیے۔

مچھلی کا حق

ایک شخص صبح ہی صبح گھر سے گوشت خریدنے کے لئے نکلا، سارا بازار چھان مارا۔ گوشت نہ ملنا تھا نہ ملا۔ ناچار سبزی خریدنے کے لئے سبزی فروشوں کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ سبزی بھی بازار سے غائب ہے۔ بیچارہ سخت پریشان کہ گھر کس منہ سے جائے۔ اور بیوی سے کیا کہے، اس پریشانی کے عالم میں ایک دریا کے کنارے بیٹھ کر سوچنے لگا کہ سوکھے چاول تو کھائے نہ جائیں گے کیوں نہ ایک عدد مچھلی پکڑ لی جائے۔ خوش قسمتی سے عین اسی وقت ایک مچھلی اُچھل کر سطح آب پر آگئی اور اُس بندۂ خدا نے ایک آدھ گھنٹے کی محنت اور اپنی تمام صلاحیتوں کو داؤ پر لگا کر ایک مچھلی کو اپنے دام میں گرفتار کر لیا۔ زندہ مچھلی کو خوش خوش گھر لے گیا اور بڑے فخر سے بیوی کی خدمت میں پیش کیا کہ اسے ذرا اچھی طرح تل لو، تاکہ مزہ آجائے، بیوی مچھلی دیکھتے ہی چلائیں کہ مچھلی تلنے کے لئے تیل چاہیئے اور گھر میں کل سے تیل کا ایک قطرہ بھی نہیں، بے چارہ مرد یہ بڑی خبر سن کر سخت پریشان ہوا اور تیل کی تلاش میں چل دیا۔ کچھ دیر بعد تیل لے کر آیا تو اس کے چہرے پر سخت کوفت اور تکان کے آثار نظر آرہے تھے۔ بیوی سمجھ گئی کہ بے چارے کو نہ معلوم کتنی دیر لائن میں کھڑے ہو کر یہ نعمت ملی گئی ہوگی۔ اس لئے ہمدردی اور محبت کے لہجے میں بولی کہ بس اب آپ آرام کیجئے میں پانچ منٹ میں مچھلی تل کر لاتی ہوں، پھر کھانا کھائیں گے۔ مرد نے اطمینان کا سانس لیا، لیکن ایک منٹ کے اندر اندر بیوی لوٹیں اور کہا کہ گھر میں مٹی کا تیل بھی تو نہیں، مچھلی کس پر تلوں۔ بے چارے مرد کی کمر دکھ رہی تھی لیکن مرتا کیا نہ کرتا، مٹی کے تیل کی تلاش میں نکل گیا۔ شام تک در بدر پھرتا رہا، لیکن مٹی کا تیل کہیں نہ ملا۔ نا اُمید ہو کر گھر لوٹا اور بیوی سے کہا کہ مچھلی کہاں ہے، اُس نے کہا وہ تو مر گئی ہے اور اب اُس سے بو آنے لگی ہے۔ مرد نے کہا، ادھر لاؤ میں اُسے واپس دریا میں پھینک دیتا ہوں۔ اور یہ کہکر وہ مچھلی کو ہاتھ میں لے کر دریا کی جانب چل دیا اور سخت مایوسی اور

غصّے کے عالم میں مُردہ مچھلی کو اُس جگہ پھینک دیا جہاں سے اُسے پکڑا تھا۔ مُردہ مچھلی نے پانی میں گرتے ہی ایک ڈبکی لگائی اور ایک لمحے کے بعد سطحِ آب پر اُچھل کر بڑے زور سے "قائم وزارت، زندہ باد، اندرا گاندھی زندہ باد" کا نعرہ بُلند کیا۔

دستِ شفا

کہتے ہیں کہ ابھی حال ہی میں ولایت سے ایک خاتون ہندوستان آئیں اور اس نے وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی، ولایت سے آنے والوں کو چونکہ وزیرِ اعظم سے ملاقات کا وقت حاصل کرنے میں کوئی دقّت پیش نہیں آتی اس لیئے خاتون کو فوراً ہی وزیرِ اعظم کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ رسمی تکلّفات کے بعد ولایتی خاتون نے مسز گاندھی سے کہا کہ میری گردن پر ایک خطرناک قسم کا پھوڑا ہے۔ اور میں یوروپ کے بڑے بڑے ڈاکٹروں سے مایوس ہو کر اب آپ کے پاس آئی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ آپ اس کا علاج کر دیں۔ مسز گاندھی بہت خوش ہوئیں کہ ہندوستانی ڈاکٹروں کی شہرت اب یوروپ تک پھیل گئی ہے اور وہاں سے لوگ اپنا علاج معالجہ کرانے کے لیئے ہندوستان آتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ بے فکر رہیئے، دہلی کے آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں بڑے اعلیٰ قسم کے ڈاکٹر ہیں۔ میں ابھی ڈاکٹروں کو بُلوا کر آپ کا معائنہ کرواتی ہوں۔ "جی نہیں، اس کا علاج کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں۔ میں بڑے بڑے ڈاکٹروں کا علاج کروا چکی ہوں۔ اس کا علاج صرف آپ کر سکتی ہیں۔" ولایتی خاتون نے بڑی لجاجت کے ساتھ کہا۔ "خاتون میں نہ ڈاکٹر ہوں، نہ طبیب، میں اس کا علاج کیونکر کر سکتی ہوں؟" مسز گاندھی کو ولایتی خاتون کی ضد پر غصّہ آنے لگا۔

"ناراض نہ ہو جائیے وزیرِ اعظم، میرے حال پر رحم کیجیئے، میری گردن کے اس تکلیف دہ اور لاعلاج پھوڑے پر اپنا دستِ شفقت پھیریئے، کیونکہ میں نے سُنا ہے کہ آپ اور آپ کی حکومت جس چیز کو بھی ہاتھ لگائیں وہ غائب ہو جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے

کہ آپ کا ہاتھ لگتے ہی یہ پھوڑا بھی غائب ہو جائے گا۔" ولایتی خاتون نے مسز گاندھی کی خوشامد کرتے ہوئے کہا۔

کھیئے اشیائے ضروری کی نایابی اور مسز اندرا گاندھی کے سوشلزم پر اس سے بہتر تبصرہ ہو سکتا ہے۔ اب اس دور کی جمہوریت پر بھی ایک طنز ملاحظہ کیجئے یہ لطیفہ مجھے صدر ہسپتال کے ایک "ماہر دندان" عرف دانتوں کے ڈاکٹر نے سنایا ہے اور میں اسے من و عن آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

جُرمِ لب کُشائی

یہ غالباً چار سال پُرانا قصّہ ہے اور ان دنوں محاذ رائے شماری کے صدر میرزا محمد افضل بیگ نشاط باغ کے قریب ایک بنگلے میں نظر بند تھے، ان کے دانتوں میں تکلیف تھی اور ان کی درخواست پر دانتوں کے ایک معالج کو وہاں بھیجا گیا تھا۔ معالج نے بیگ صاحب کے دانتوں کا معائنہ کرتے ہوئے کہا کہ "پورا مُنہ کھول لیجیئے"، تو بیگ صاحب نے برجستہ جواب دیا "مُنہ کھولنے کی پاداش میں ہی تو یہاں نظر بند ہوں۔ اب یہاں بھی مُنہ کھولوں تو نہ معلوم کہاں لے جائیں گے۔"

رائی کا پہاڑ ـــــ آپ بیتی

غلط بیانی، مبالغہ آمیزی، اختراع اور سنسنی خیزی میں ہندوستان کے اخبارات اور خبر رساں ایجنسیوں کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اخبارات اور عوام کے درمیان اعتبار کی خلیج Credibility gap بڑھتی جا رہی ہے۔ بنگلہ دیش کی جدوجہد آزادی کے ابتدائی ایّام میں ہمارے اخبارات اور ہماری خبر رساں ایجنسیوں نے اپنے دفاتر کے ائرکنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر ایسی ایسی خبریں گھڑیں کہ ساری دنیا ہمارے خبر رسانوں اور اخبار نویسوں کی "تخلیقی اُپج" کی داد دینے پر مجبور ہو گئی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ان دنوں تمام ملکی اخبارات نے نہ صرف پاکستانی جنرل ٹیکا خان کی موت کی خبر شائع کی بلکہ مرنے

سے پہلے ٹیکا خاں اور اس کے قاتل کے درمیان ایک عدد فلمی مکالمہ بھی اختراع کیا۔
پھر دو دن کے وقفے کے بعد شیخ مجیب الرحمٰن کے بیٹے کو قتل کرنے کی خبر شائع ہوئی۔
اور ٹھیک آٹھ دن تک ہندوستانی اخبارات اس شدت کے ساتھ ٹیکا خان اور شیخ
مجیب کے صاحبزادے کے قتل کی خبریں شائع کرتے رہے کہ چراغ بیگ جیسے شکی
مزاج نے بھی ان خبروں پر اعتبار کر لیا۔ پھر چند دن بعد ٹیکا خان نے غیر ملکی اخبار
نویسوں کو ایک انٹرویو دیا اور ہندوستانی اخبارات کو چار و ناچار یہ انٹرویو شائع
کرنا ہی پڑا۔ شیخ مجیب کے صاحبزادے کے متعلق آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ آجکل
بنگلہ دیش کی فوج میں ایک اہم عہدے پر فائز ہیں۔ یہ تو رہی جگ بیتی۔

"آئینہ" کی پچھلی اشاعت میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ ۱۸ ستمبر کی رات کو دفتر "آئینہ"
میں دفعتاً آگ نمودار ہوئی جس سے دفتر کی چھت جل گئی اور کچھ قیمتی فائل اور مسودے
ضائع ہو گئے فائر بریگیڈ کی بروقت امداد سے آگ کو پھیلنے سے روک دیا گیا اور اس طرح
ادارہ "آئینہ" ہی نہیں ریذیڈنسی روڈ کا سارا محلّہ ایک خطرناک سانحے سے بچ گیا۔ لیکن
دوسرے دن ملک کے تمام اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ تسنیم احمد شمیم کا رہائشی مکان
اور "آئینہ" کا دفتر مکمل طور پر تباہ ہو گئے ہیں اور بمبئی، دہلی، کلکتہ، مدراس، لکھنؤ
غرض ملک کے کونے کونے سے مدیر "آئینہ" کے نام تعزیت اور ہمدردی کے تار اور خطوط
موصول ہونے لگے اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

اظہارِ افسوس کرنے والوں میں سب سے دلچسپ اور حقیقت پسندانہ خط وزیر
اعظم شریمتی اندرا گاندھی کا ہے۔ مسز گاندھی نے آگ کے سانحے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے
یہ اُمید ظاہر کی ہے کہ خبر مبالغہ آمیز ہوگی اور اتنا نقصان نہیں ہوا ہوگا کہ جتنا اخبارات
سے ظاہر ہوتا ہے۔ مسز گاندھی کا اندازہ بالکل صحیح ہے اور وہ چونکہ اس ملک کے
اخبارات، اخبار نویسوں اور خبر رسانوں کی صداقت اور دیانت کے متعلق کسی شک
و شبہ میں مبتلا نہیں ہیں اس لیے اُنہوں نے بغیر کسی تامل کے اس خبر کو مبالغہ آمیز قرار
دیا۔ خود ان کے بارے میں ہندوستان کے قومی پریس نے جو جو مبالغہ آرائیاں کی ہیں

اُن کے پیشِ نظر اخبارات کے تئیں ان کی بے اعتمادی اور بے اعتباری کا رویّہ بجا معلوم ہوتا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ آگ کے متعلق خبر بھیجنے والے نمائندے نے موقعۂ واردات پر جانے کی زحمت گوارا ہی نہیں کی۔ قیاس غالب ہے کہ اس نے رات میں فائر بریگیڈ کی آواز سن کر ٹیلی فون پر دریافت کیا ہوگا کہ آگ کہاں لگی ہے۔ کسی نے اُسے دفتر "آئینہ" کا نام بتا دیا ہوگا اور اس کے ساتھ ہی اس کی تحقیق ختم اور تخلیق شروع ہو گئی۔ اُس نے اپنے بستر میں بیٹھے بیٹھے یہ اندازہ کر لیا کہ اگر آگ لگی ہے تو پھر پھیل بھی جائے گی اور پوری امارت کے تباہ ہونے کا بھی امکان ہے لیکن صرف دفتر میں آگ لگنے کا واقعہ "خبر" نہیں بن سکتا تھا اس لئے کیوں نہ مدیر "آئینہ" کی رہائش گاہ کی تباہی کا مرچ مصالحہ بھی ڈال دیا جائے۔ اور یوں اُس نے اپنی کھڑکی سے باہر جھانکے بغیر کھٹاک سے خبر بھیج دی اور دوسرے دن تمام اخبارات نے یہ خبر شائع کر کے مدیر "آئینہ" کے دوست، احباب اور "آئینہ" کے پرستاروں کو سخت پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ اور شمیم صاحب کے نام ایسے ایسے خط آنے لگے کہ انہیں واقعی اپنے آپ سے ہمدردی ہونے لگی۔ بقول شمیم صاحب خود انھیں اخبارات ہی کے ذریعہ گھر اور دفتر میں آگ کی اطلاع مل گئی۔ بعض دوستوں نے صبر وضبط اور مشیّتِ الٰہی اور حالات کا مقابلہ کرنے کے موضوعات پر ایسے ایسے درد انگیز خط لکھے ہیں کہ چراغ بیگ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ اب ان احباب کو کون بتائے کہ آگ سے دفتر "آئینہ" کو بہت ہی معمولی نقصان پہنچا ہے اور خبر رسانوں اور اخبار نویسوں نے مبالغہ آمیزی اور دروغ گوئی کی اپنی روایات کا احترام کرتے ہوئے اِس معمولی سے حادثے کو ایک غیر معمولی سانحہ بنا کر پیش کر دیا ہے۔

(۳۰ ستمبر ۷۳ء)

شفا خانہ نہیں پاگل خانہ

صدر ہسپتال سری نگر میں ڈاکٹر شیخ محمد اختر کی المناک موت پر مجھے افسوس تو ہوا لیکن حیرت بالکل نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس ذبح خانے میں ہر روز ایک نہ ایک اختر ڈاکٹروں کی لاپرواہی، نرسوں کی بے رحمی، تیمارداروں کی غفلت شعاری اور ادویات کی خطرناکی کے سبب جانِ عزیز سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ صدر ہسپتال کے ایم، بی، بی ایس ایم، ایف۔ ڈی، ایس۔ آر، سی، ایس۔ ایم، آر، سی، پی اور اسی طمطراق کی دوسری ڈگریاں رکھنے والے عزت مآب ڈاکٹر صاحبان مجھے معاف کریں گے کہ مجھے ہسپتال میں مرنے والوں کی بڑھتی ہوئی تعداد دیکھ کر نہیں، زندہ بچ کر نکل جانے والوں کی سخت جانی پر حیرت ہوتی ہے۔ اور یہیں پر میں خدا کی خدائی اور اس کی قدرت پر ایمان لاتا ہوں۔ کہ جس کو وہ رکھے اس کا صدر ہسپتال کے ڈاکٹر بھی بال بیکا نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر شیخ محمد اختر پہلے نوجوان نہیں ہیں کہ جو دارو کے بے ہوشی کے غلط استعمال سے جاں بہ حق ہوئے۔ اس سے پہلے ظہور شالی نام کا ایک نوجوان بھی رعناواری ہسپتال میں ان ہی حالات میں داعیٔ اجل کو لبیک کہنے پر مجبور کیا گیا۔ اسی طرح درجنوں گمنام اختر اور ظہور بے قضا ڈاکٹروں کی ناتجربہ کاری اور مجرمانہ غفلت شعاری کی بھینٹ چڑھ گئے۔

اور اب ہم لوگ ان سانحات اور حادثات کے اس درجہ عادی ہو گئے ہیں کہ جب تک کوئی ڈاکٹر اپنے ہم پیشوں اور ہم عصروں کے تیغِ ستم کا نشانہ نہ بنے، ہمیں حیرت نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر شیخ محمد اختر کی موت پر جو واویلا ہوا ہے وہ ہر لحاظ سے بجا ہے لیکن

اگر صدر ہسپتال سرینگر کے بے رحم جلادوں کو ان کی بے رحمی، بیدردی، سرد مہری، بے التفاتی اور بے نیازی کا احساس دلانا مقصود ہے تو محکمۂ صحت کے موجودہ ڈھانچے میں کچھ بنیادی تبدیلیاں کرنا پڑیں گی۔ ہمارے ہاں انسان دوست، تجربہ کار، اپنے کام میں ماہر ڈاکٹروں کی کمی نہیں، لیکن یہ فرض شناس اور محنتی ڈاکٹر سیاست اور حکومت کی مصلحتوں کا شکار ہو کر بے کار اور بے مصرف بنا دیئے گئے ہیں۔ جب تک صحت عامہ کو سیاسی کھڈ پنچوں اور صدر ہسپتال کو منظورِ نظر اور نالائق ڈاکٹروں کے تسلط سے آزاد نہیں کیا جاتا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی اخترِ زندگی کے آسمان سے ٹوٹ کر موت کی گہرائیوں میں ڈوبتا رہے گا۔

صدر ہسپتال کی موجودہ حالت دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پچھلے پچیس برسوں میں یہ ادارہ بتدریج ذلیل ہو کر اب اس سطح پر آگیا ہے کہ جہاں اس کے مزید گرنے کا اندیشہ نہیں باقی نہیں ہے۔ آپریشن تھیٹر ہوں یا ڈاکٹروں کے کمرے، مریضوں کے وارڈ ہوں یا تیمارداروں کے کپڑے، باورچی خانہ ہو یا ڈسپنسری، ہر چیز سے غلاظت اور گندگی کی عفونت آرہی ہے اور ہسپتال کی حدود میں داخل ہوتے ہی صحت مند آدمی بھی اپنے آپ کو بیمار محسوس کرنے لگتا ہے۔ کسی وارڈ میں جاکر مریضوں کے بستروں کی حالت دیکھئے تو یہ محسوس ہوگا کہ آپ کسی ہسپتال میں نہیں شاید بالواقع بیگر ہوم میں داخل ہو گئے ہیں۔ اس کثیف اور خبیث ماحول میں بیمار کو اس کی تندرستی تو کیا ملے گی، ہاں کچھ نئی بیماریاں لگنے کا اندیشہ ضرور ہے۔ مختصر یہ کہ سری نگر کا صدر ہسپتال تہذیب، انسانیت اور سری نگر شہر کے ماتھے پر ایک ایسا کلنک ہے کہ اسے جہلم کا سارا پانی بھی نہیں دھو سکتا۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ اس شفاخانے کو پاگل خانے کا نام دے کر دماغی امراض کے کسی مشہور معالج کو اس کا نگراں مقرر کیا جائے کہ جو مریضوں کے بجائے ڈاکٹروں کی دماغی حالت درست کرانے کی طرف توجہ دے۔

(۷ راکتوبر ۷۳ء)

رزم گاہِ عید گاہ

عید الفطر سے دو روز قبل جب مغربی ایشیا میں سولہ روزہ خونریز لڑائی کے بعد عربوں اور اسرائیلیوں نے جنگ بندی کی اپیل پر عمل کرتے ہوئے اپنی توپوں کے دہانے خاموش کر دیئے تو سری نگر کی ڈیڑھ سو مسجدوں میں لاکھوں مسلمان عربوں کی فتح و نصرت اور اسرائیلیوں کی ہزیمت کی دُعائیں مانگ رہے تھے۔ ابھی ایک ہفتہ پہلے واعظانِ قوم، رہنمایانِ ملّت اور نوجوانانِ وطن کا جوشِ شہادت انہیں محاذِ جنگ پر اپنے مسلمان بھائیوں کے دوش بدوش جامِ شہادت نوش کرنے کے لئے بے چین کر رہا تھا، اور شیخ محمد عبداللہؒ میرزا افضل بیگ اور مولوی محمد فاروق اسرائیلیوں کے خلاف اپنی دُعاؤں کی طیّارہ شکن توپیں داغ کر بزعمِ خود عربوں کی زبردست امداد کر رہے تھے۔ جمعۃ الوداع کے دن خاص طور پر مسلمانانِ کشمیر نے عرب افواج کی کامیابی اور اسرائیل کی پسپائی کی دُعائیں مانگ مانگ کر عرشِ عظیم کو ہلا دیا، اور پھر صرف ایک دن کے وقفے کے بعد عید الفطر کی نماز کے دوران سری نگر کی عید گاہ میں اسرائیلیوں کو بد دُعائیں دینے والے مسلمان آپس میں اِس بے حیائی اور بدتمیزی سے لڑے کہ عید گاہ کا وسیع میدان صحرائے سینائی کا سا منظر پیش کرنے لگا۔ ایک خدا، ایک رسولؐ، ایک کتاب، اور ایک کلمے پر ایمان رکھنے والے مسلمان ایک دوسرے سے اس طرح گتھم گتھا ہو گئے کہ خدا کی پناہ۔ اُس منبر پر کہ جہاں سے چند لمحے قبل آیاتِ کریمہ کی تلاوت ہوئی تھی اور مسلمانوں کی سُرخ روئی کی دُعائیں مانگی گئی تھیں، پتھروں اور جوتوں کی وہ بارش ہوئی کہ اس پر کندہ کلمۂ طیبہ کی عبارت بھی اس کی زد میں آ گئی رسول اللہ

کے نام پر کٹ مرنے والے مسلمان آج بے تحاشا ان کے اعلانِ رسالت پر سنگباری کر رہے تھے اور عربوں کی خاطر اپنا خون بہانے کا دعویٰ کرنے والے بڑی بے دردی کے ساتھ ایک دوسرے کا خون بہانے میں مصروف تھے۔ افسوس اور تعجب کی بات یہ ہے کہ بے حیائی اور بے غیرتی کے اس رقصِ بے ہنگام کا کوئی جواز نہیں تھا!

پروگرام اور اعلان کے مطابق نمازِ عید ٹھیک صبح کے گیارہ بجے شروع ہوئی، تیس ہزار سے زائد لوگوں نے بڑے اطمینان کے ساتھ نماز ادا کی اور خطبۂ اوّل کے بعد خطبۂ دوئم شروع ہوا ہی تھا کہ ایک طرف سے شور اُٹھا، کچھ لوگ زور زور سے چلّا رہے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے سو ڈیڑھ سو افراد پر مشتمل ایک ٹولی منبر پر حملہ آور ہو گئی۔ مجمع میں بھگدڑ مچ گئی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہوا؟ حملہ آوروں نے سب سے پہلے مائیکروفون کی تاریں کاٹ دیں اور اس کے بعد منبر پر پتھراؤ شروع کیا۔ چند لمحوں کے بعد میری سمجھ میں صرف اتنی بات آگئی کہ قریب کی مسجد میں مولوی محمد فاروق کا وعظ سننے والے نمازیوں کو یہ شکایت ہے کہ خلافِ دستور انہیں اطلاع کئے بغیر نماز شروع کی گئی اور اس طرح وہ نمازِ عید کی چند تکبیریں ادا کرنے کی سعادت سے محروم ہو گئے۔ اتنی سی بات پر اتنا بڑا ہنگامہ، بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی، لیکن فساد بڑھتا جا رہا تھا اور اب جوتوں اور پتھروں کی میزائلوں کے علاوہ لاٹھیوں کا بھی آزادانہ استعمال ہو رہا تھا۔ ایک جانب سے مولوی محمد فاروق کے عقیدت مند اُنہیں منبر کی طرف لے جا رہے تھے۔ اور جب وہ منبر پر کھڑے ہو کر کچھ کہنے لگے تو چاروں طرف سے پتھر اور جوتے برسنے لگے، اور وہ کچھ کہے بغیر نیچے آگئے۔ عیدگاہ کا میدان ایک کارزار میں بدل گیا۔ اور سینکڑوں لوگ یہ جانے بغیر کہ اصل بات کیا ہے، جوتم پیزار میں مصروف تھے۔ مولوی صاحب کے چاہنے والے انہیں ایکبار پھر منبر پر لے آئے، ان کا مطالبہ تھا کہ پہلی نماز کو کالعدم تصوّر کر کے دوسری نماز پڑھائی جائے لیکن میرواعظ صاحب اس سے متفق نہیں تھے۔ پتھروں، جوتوں، گالیوں اور لاٹھیوں سے لڑی جانے والی یہ جنگ تقریباً ایک گھنٹے تک

جاری رہی، اور اس میں دو سو سے زائد افراد زخمی ہو گئے۔

اس "جنگِ عید گاہ" کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمان بالعموم اور کشمیر کے مسلمان بالخصوص ذہنی طور پر کتنے پسماندہ اور تنگ نظر ہیں کہ عید الفطر جیسی پُرمسرت تقریب پر بھی بغیر کسی معقول وجہ اور جواز کے اس طرح باہم دست و گریباں ہو جاتے ہیں کہ ساری دنیا کو اُن پر ہنسنے کا موقع ملتا ہے۔ دوئم یہ کہ یہ لوگ جو خدا کے دربار میں دوسروں کی فتح و نصرت کے لئے دستِ سوال دراز کرتے ہیں۔ ان کا اپنا کردار کیا ہے۔ اور وہ کس منہ سے دربارِ خداوندی میں دوسرے لوگوں کی سفارش کرتے ہیں، سوچیئے اور ایک لمحے کے لئے سوچیئے، دنیا کہاں سے کہاں پہنچی لیکن کشمیر کا مسلمان عید کی نماز میں تاخیر اور عجلت کے سوال پر ایک دوسرے کا خون بہانے کا بہانہ چاہتا ہے۔ اور مولوی صاحبان اسے روکنے اور ٹوکنے کی بجائے اپنے حقیر ترین مفادات کے لئے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ مان لیجئے کہ فاروق صاحب کا وعظ سُننے والوں کی شکایت درست تھی۔ تب بھی کیا ایماندار، مہذّب اور شائستہ مسلمانوں کو یہ زیب دیتا تھا کہ وہ اس معمولی سی فروگذاشت کے لئے مائیکروفون توڑ ڈالیں، منبر و محراب پر پتھراؤ کریں اور لاٹھیوں سے سینکڑوں بے گناہ انسانوں کو مجروح کریں؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس ساری ہنگامہ آرائی پیچھے سیاسی مقصد کارفرما تھے، ہوسکتا ہے کہ یہ صحیح ہو لیکن جب بھی اس جرم کی شدّت اور نوعیت میں کمی نہیں ہو گی۔ اور میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گا کہ بیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں جب دنیا چاند کو فتح کر کے زہرہ و مریخ پر کمندیں ڈال رہی ہے، کشمیر کا مسلمان جہالت، لاعلمی، تعصّب اور تاریکی کے سمندر میں غوطہ کھا رہا ہے۔ اور جو بات کشمیر کے مسلمان کے بارے میں صحیح ہے، وہ بحیثیت مجموعی ملک کے دوسرے حصّوں میں رہنے والے مسلمان پر بھی صادق آتی ہے۔ وہ بھی روایت، تنگ نظری اور ناعاقبت اندیشی کے بھنور میں پھنسے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ماضی کی شان و شوکت کو اپنے حال اور مستقبل کا سرمایہ سمجھ کر اس حقیقت کو بھولے ہوئے ہیں کہ دنیا میں صرف باعمل، بلند کردار اور بلند نگاہ رکھنے والی قومیں فتح یاب ہوئی ہیں۔ اور یہ

خصوصیات اگر مکہ معظمہ میں رہنے والے مسلمانوں کی بجائے تل ابیب کے یہودیوں میں پائی جائیں تو اللہ تعالیٰ کروڑوں مسلمانوں کی دُعاؤں اور دُہائیوں کے باوجود فتح و کامرانی کا جھنڈا اسرائیلیوں کے ہاتھ میں دے گا۔ مسلمانوں کے سیاسی اور مذہبی انتشار کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ وہ عید کا مقدّس اور مذہبی تہوار بھی ایک ساتھ نہیں منا سکتے، سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس زمانے میں بھی مسلمانوں نے عید کا چاند دیکھنے اور عید کی تاریخ مقرر کرنے کا کوئی اصول یا طریقہ وضع نہیں کیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ کچھ لوگوں نے ۲۸ ر اکتوبر کو عید منائی اور کچھ نے ۲۹ کو۔ لکھنؤ شہر میں شیعوں نے ایک دن عید منائی اور سنّیوں نے دوسرے دن، جو لوگ خوشی میں ایک دوسرے کا ساتھ نہیں دے سکتے وہ غم میں ایک دوسرے کا ہاتھ کیا بٹائیں گے۔ مجھے معاف کیجیے کہ میں مسلمانوں کے مستقبل سے مایوس ہوں اور اپنی تمام تر رجائیت کے باوجود مجھے کشمیری مسلمان اور ہندوستانی مسلمانوں کی نجات کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ ہم لوگ سفر کرتے کرتے اب چودھویں صدی میں پہنچ گئے ہیں، ابھی ہمارے اور آج کے زمانے کے درمیان پانچ صدیوں کا فاصلہ ہے اور یہ فاصلہ طے کرنے کے لئے ہمیں روشنی اور آواز کی رفتار سے بھی تیز سفر کرنا پڑے گا۔ لیکن کیا ہم میں اس رفتار سے آگے بڑھنے کی طاقت، صلاحیت اور خواہش ہے؟ طاقت اور صلاحیت کی بات تو رہنے دیجئے، ہم میں خواہش بھی نہیں ہے، اور یہ زوال کی خطرناک منزل ہے کہ جہاں پہنچ کر قومیں تاریخ کے سمندر میں اس طرح ڈوب جاتی ہیں کہ پھر ان کی قسمت پر کوئی آنسو بہانے والا بھی نہیں رہتا۔ عیدگاہ کے میدانِ کارزار میں دادِ شجاعت دینے والے پہلوانوں سے میری گذارش ہے کہ وہ اپنے حال کی روشنی میں اپنے مستقبل کا اندازہ کرلیں۔ علمائے دین اور رہنمایانِ قوم کو اگر اپنی جیبیں بھرنے سے فرصت ہو۔ تو انہیں ایک لمحے کے لئے یہ سوچنا چاہیئے کہ انہوں نے اپنی خود غرضی اور ناعاقبت اندیشی سے ملّتِ اسلامیہ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔

مسلمانو! کیا تم اب بھی نہیں سمجھوگے وقت قریب آرہا ہے کہ
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

(۷ر نومبر ۷۳ء)

اقبال نمائش یا آزاد نمائش؟

۲۷ر اکتوبر کو سرینگر میں سیّاحوں کے استقبالیہ مرکز پر اقبال کے فن، اُن کی شخصیت اور زندگی سے متعلق جس تصویری نمائش کا افتتاح ہوا، وہ اِس ملک میں اپنی نوعیت کی پہلی نمائش ہے۔ ملک کی تقسیم کے بعد اقبال سرکاری سطح پر ہمارے لئے شجرِ ممنوعہ قرار پائے تھے۔ اور غیر سرکاری سطح پر ان کا "سوشل بائیکاٹ" کیا گیا تھا۔ اُنھیں فرقہ پرست، تنگ نظر، مسلم لیگی، رجعت پسند اور اسی قسم کی بے ہودہ مغلظات سے نواز کر ملک بدر کر دیا گیا اور ان پر پاکستان بنانے کا الزام عائد کر کے اُنھیں ہندوستان کی "شہریت" سے محروم کر دیا گیا۔ اُدھر پاکستان نے شاعرِ پاکستان اور شاعرِ اسلام کہہ کر اُن کی وہ پذیرائی کی کہ ہندوستانی فرقہ پرستوں کے تمام شکوک اور شبہات یقین میں بدل گئے اور وہ اقبال کو شاعر اور فلسفی کی بجائے "پاکستانی جاسوس" سمجھنے لگے۔ ٹھیک ۲۶ برس بعد اس ملک کے حکمرانوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ اقبال ہماری مشترکہ تہذیب اور ہمارے تمدنی ورثے کا ایک ایسا دُرِ نایاب ہے کہ جس کی تخلیق میں کئی صدیاں صرف ہوتی ہیں، خود اقبال کے الفاظ میں ؂

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

سرکاری سطح پر اقبال صدی کی تقریبات کا اہتمام اس احساس کی پیداوار اور سرینگر میں اقبال نمائش کا افتتاح انہی تقریبات کا ایک حصّہ ہے۔ اقبال کی پیدائش سے اُن کی موت

تک سینکڑوں تصویروں پر مشتمل یہ تصویری نمائش مرکزی محکمۂ اطلاعات کا ایک قابلِ تعریف کارنامہ ہے۔ اس میں اقبال کی بعض نادر تصویریں اور تحریریں شامل ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس کی تنظیم و تزئین میں اردو کے مشہور شاعر جگن ناتھ آزاد نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ اس نمائش کے متعلق میں صرف یہ کہنے پر اکتفا کروں گا کہ اقبال کی شخصیت اور اُنکی شاعری سے مانوس ہر انسان کو ان کی زندگی کا یہ تصویری پیکر ضرور دیکھنا چاہیئے۔ لیکن اس نمائش کی افتتاح کے سلسلے میں ۲۷ اکتوبر کو جو حماقتیں اور بے ہودگیاں سرزد ہوئی ہیں ان کی طرف اشارہ کئے بغیر یہ تبصرہ مکمّل نہیں ہوگا۔ اور جس طرح اس نمائش کی دستاویزی اہمیت اور اس کی ترتیب و تشکیل کیلئے جگن ناتھ آزاد مبارکباد کے مستحق ہیں، اُسی طرح افتتاحی تقریب کے بازاری پن اور بے ہودگیوں کی ذمہ داری بھی مسٹر آزاد کے سر رہے گی !

جگن ناتھ آزاد میرے بہت اچھے" دوست ہونے کے علاوہ اُردو کے مشہور شاعر بھی ہیں۔ اقبال کی شخصیت ان کے فلسفے اور شاعری پر اُنہیں خاصا عبور حاصل ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس "شاہین بچے" کو "صحبتِ زاغ" خراب کرگئی ہے ! تیس چالیس سال سے مشاعروں میں اپنا کلام پڑھتے پڑھتے ان کا ذہن اور دہن دونوں ہی بُری طرح متاثر ہو گئے ہیں۔ وہ ہر محفل کو مشاعرہ سمجھ کر اُسے لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس کوشش میں محفل کی سنجیدگی اور اس کا وقار لوٹ لیتے ہیں۔ اقبال نمائش کی افتتاحی تقریب میں شیخ صاحب مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے مدعو تھے اور ان کے علاوہ ڈائس پر گورنر مسٹر جھا، وزیر اعلیٰ سید میر قاسم، مرکزی وزیر اطلاعات شری آئی۔ کے۔ گجرال اور کلچرل اکاڈمی کے سیکریٹری محمد یوسف ٹینگ بھی جلوہ افروز تھے۔ لیکن تقریب کو "کنڈکٹ" کرنے کا فرض جگن ناتھ آزاد بہ نفسِ نفیس انجام دے رہے تھے۔ اور افسوس یہ ہے کہ موصوف نے اس انتہائی سنجیدہ اور پُروقار تقریب کو "نمائش گاہ" کے مشاعرے کی طرح ہی "کنڈکٹ" کیا۔ ایک گھنٹے کی اس تقریب میں آزاد صاحب نے چھ بار بے چارے سامعین سے خطاب کیا، اُن کا بس چلتا تو وہ سٹیج پر لگے ہوئے مائیکروفون سے چمٹ جاتے، ہر مقرر کی تقریر سے پہلے اور اس کے بعد وہ ایک عدد

تقریر جھاڑتے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مسخرے پن کی کیا ضرورت تھی۔ شیخ صاحب تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔ اور انہیں سب سے آخر میں یا کم از کم انڈکمار گجرال کے خطبۂ افتتاحیہ سے پہلے بولنا چاہیئے تھا۔ لیکن ان کی تقریر سب سے پہلے ہوئی۔ اور شیخ صاحب کا تعارف آزاد صاحب نے کچھ اس انداز سے فرمایا کہ جیسے ذوق بہادر شاہ کے دربار میں قصیدہ پڑھ رہے ہوں۔ ایک شاعر دوسرا محکمۂ اطلاعات کا ملازم! آزاد صاحب کو قصیدہ گوئی کی لت پڑ گئی ہے، اور میں ان سے مؤدبانہ گزارش کروں گا کہ وہ ہر مجلس اور ہر محفل میں اپنی شخصیت کے اس پہلو کو نمایاں کرنے سے احتراز کریں۔

شیخ صاحب اپنی تقریر لکھ کر لائے تھے اور اس میں انہوں نے اقبال سے اپنے ذاتی تعلقات کے علاوہ ان کی کشمیر سے وابستگی کا تفصیل سے ذکر کیا تھا۔ انہوں نے بجا طور پر یہ شکایت کی کہ اقبال اور کشمیر کے موضوع کو اس نمائش میں قطعی نظر انداز کیا گیا ہے۔ ہال میں روشنی کا انتظام انتہائی ناقص تھا جس کی وجہ سے شیخ صاحب کو اپنی تقریر پڑھنے میں بڑی دقّت پیش آئی۔ ان کی تقریر کے بعد فوراً بعد آزاد صاحب نے شیخ صاحب کی تقریر پر ایک مختصر سا تبصرہ ارشاد فرمایا، یہ ان کی تیسری تقریر تھی۔ گورنر ایل، کے، جھا کو کسی بیوقوف یا بیوقوف کے بچّے نے یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ انگریزی کے بجائے اردو میں تقریر کریں۔ اس عقل مند نے اُس بیوقوف کا مشورہ مان کر اُردو زبان میں اقبال کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اور سامعین کو یوں لگا کہ جھا صاحب شاعر اقبال کی نہیں، بوٹ مینز ایسوسی ایشن کے اقبال چاپری کی تعریف کر رہے ہیں۔ جھا صاحب کی تقریر کے بعد جگن ناتھ آزاد نے ایک اور تقریر کی۔ اور پھر قاسم صاحب نے اپنا خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا۔ ایسی تقریب میں اظہارِ خیال فرمانے سے پہلے صدرِ مجلس کو تھوڑی سی تیاری اور محنت کرنا چاہیئے۔ لیکن قاسم صاحب نے اس کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ اس لئے ان کی تقریر بڑی بے ربط اور کسی حد تک مہمل ثابت ہوئی۔ وہ بار بار اقبال کا یہ شعر پڑھ رہے تھے ؎

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں\
تو اقبالؔ اُس کو سمجھاتے مقامِ کبریا کیا ہے

ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ انہیں اقبالؔ کا صرف یہی ایک شعر یاد ہے۔ حالانکہ وہ فارسی میں ایم، اے ہیں۔ قاسم صاحب کی تقریر کے بعد ایک ایسی بدتمیزی دیکھنے میں آئی کہ اس کیلئے اکاڈمی کے سکریٹری محمد یوسف ٹینگ اور جگن ناتھ آزاد دونوں کو نوکری سے برخاست کر دینا چاہیئے۔ افتتاحی تقریب کی کاروائی روک کر اس بات کا اعلان کیا گیا کہ اب اس تقریب پر میرواعظ مولانا فاروق کا ایک پیغام پڑھکر سُنایا جائے گا۔ اور محمد یوسف ٹینگ نے سیّد میر قاسم سے باضابطہ اجازت حاصل کر کے مولوی صاحب کے نام سے لکھا ہوا ایک پیغام پڑھکر سُنایا۔ جس میں اقبالؔ سے زیادہ جگن ناتھ آزاد کی تعریف کی گئی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ آزاد صاحب نے اپنی "کمپنی کی مشہوری" کے لئے فاروق صاحب سے زبردستی داد وصول کی ہے۔ ورنہ ان کے پیغام کی کیا اہمیت اور جواز تھا۔ یہ کوئی سیاسی تقریب تو تھی نہیں۔ شیخ صاحب وہاں اس لئے تھے کہ ان کے اقبالؔ سے ذاتی مراسم تھے۔ اور اقبالؔ کا کشمیر کی سیاسی تحریک سے گہرا تعلق رہا ہے۔ لیکن مولانا فاروق سے پیغام وصول کرنے کی کیا تک تھی؟ اس بیچارے کو اقبالؔ کے فکر و فن اور اس کی شخصیت کے بارے میں کیا معلوم کہ اس سے خصوصی پیغام حاصل کر کے سامعین کی بصیرت میں اضافہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ دراصل جگن ناتھ آزاد اقبالؔ کے نام پر اپنی شہرت اور اپنے ذاتی تعلقات بڑھانا چاہتے ہیں۔ اور اس مقصد کے لئے وہ وزیروں کے علاوہ سیاسی لیڈروں کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ جگن ناتھ آزاد کے اصرار کے باوجود محمد یوسف ٹینگ نے یہ پیغام کیوں پڑھ کر سُنایا اور قاسم صاحب نے صدرِ جلسہ کی حیثیت سے اس کی اجازت کیوں دی؟ اگر آزاد صاحب کے لئے اپنی دُکان چلانے کی خاطر پیغامات حاصل کرنا ضروری تھا تو اقبالؔ کے فکر و فن پر اپنی رائے ظاہر کرنے کے لئے مفتی جلال الدّین، غلام رسول نازکی، محمد امین کچھ، رحمٰن راہی، ابنِ مہجور، غلام حسن بیگ عارف کو کیوں زحمت نہیں دی گئی۔ یہ حضرات مولوی محمد فاروق کے مقابلے میں اقبالؔ کو بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔ جگن ناتھ آزاد محکمۂ اطلاعات میں ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن آفیسر ہیں، اور انہیں مقامی سیاست میں حصّہ لینے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

سیّد میر قاسم کی تقریر کے بعد آزاد صاحب نے ایکبار اور سامعین کو اپنے زرّیں خیالات سے نواز کر مسٹر گجرال کو اپنی افتتاحی تقریر کرنے کی دعوت دی۔ گجرال بہت اچھے مقرر ہیں اور انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں بڑی عمدگی کے ساتھ اپنے خیالات ادا کر سکتے ہیں۔ اُنھوں نے بڑی شستہ اور بامحاورہ اُردو میں اقبالؔ کی فنّی عظمت اور ان کی ادبی اہمیت پر ایک بصیرت افروز تقریر ارشاد فرمائی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اُنھوں نے تقریر سے پہلے اچھّی خاصی محنت کی ہے۔

محمد یوسف ٹینگ نے اپنی استقبالیہ تقریب میں سپیر (کولگام) نامی گاؤں میں اقبال کی ایک شایانِ شان یادگار تعمیر کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ وہ گاؤں ہے کہ جہاں اقبال کے آباو اجداد رہتے تھے۔ قاسم صاحب نے اپنی تقریر میں وعدہ کیا کہ اقبال کے آبائی گاؤں میں ایک شایانِ شان یادگار مرکزی حکومت کے اشتراک سے تعمیر کی جائے گی۔

جلسے کی کاروائی کے دوران جگن ناتھ آزاد کے علاوہ کشمیر ہائی کورٹ کے سابق جج جسٹس شہمیری نے بھی اپنے کرتب دکھائے۔ وہ شیخ صاحب کی تقریر کے فوراً بعد ڈائس پر حملہ آور ہوئے اور خیرِ بے تحاشا اقبالؔ کے اشعار لہک لہک کر پڑھنے لگے۔ شہمیری صاحب کی اس مداخلتِ بے جا سے جگن ناتھ آزاد کی پیدا کی ہوئی بوریت کسی حد تک کم ہو گئی مگر صرف کسی حد تک۔

آزاد صاحب نے تقریب کے اختتام پر ایک اور تقریر کی جس میں اُنھوں نے اپنی تعریف کے علاوہ محکمہ اطلاعات کے اعلیٰ اور ادنیٰ افسروں اور کلچرل اکاڈمی کا شکریہ ادا کیا، کہ جنھوں نے اس نمائش کو کامیاب بنانے میں ان کی مدد کی تھی، میرے بار بار یاد دلانے پر بھی اُنھوں نے کشمیر یونیورسٹی کے ان اساتذہ کا نام نہیں لیا کہ جنھوں نے واقعی اس نمائش کی ترتیب و تنظیم میں رات دن ایک کیا تھا۔ آزاد صاحب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ نمائش دراصل کشمیر یونیورسٹی کے اہتمام سے منعقد ہو رہی تھی۔ اور آخری مرحلے پر بعض سیاسی وجوہات کی بنار پر یونیورسٹی کی جگہ یہ کام اکاڈمی کے سپرد ہوا۔ ان میں ظرف اور شرافت ہوتی تو وہ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن اور ڈاکٹر حبیب اللہ حامدی کا نام ضرور لیتے۔ لیکن نمائش کی افتتاح سے لے کر اس کے خاتمے تک انہیں صرف اس بات کا فکر لگا ہوا تھا کہ کہیں دوسرا شخص اس

سے وابستہ نہ ہو اور یہ بلاشرکتِ غیرے ان کے نام سے منسوب اور ممنون ہو، حد یہ ہے کہ اُنھوں نے نمائش میں آویزاں اقبال کے اس شجرۂ نصب پر بھی اپنا نام لکھا ہوا ہے کہ جو محمد دین فوق نے مرتب کیا تھا اور جو ان کی کتاب تاریخِ اقوامِ کشمیر میں چالیس سال پہلے شائع ہو چکا ہے۔ میری اطلاع ہے انہیں اس نمائش کے سلسلے میں گجرال صاحب کا نام لینا بھی گوارا نہیں تھا۔ اور وہ چاہتے تھے کہ عوامی توجہ ان کی ذات پر مرکوز ہو۔ حالاں کہ اس نمائش کے اہتمام کا سہرا گجرال صاحب اور مرکزی حکومت کے سر رہنا چاہیئے کہ جن کی وسعت قلبی اور فراخ دلی نے اس نمائش کو ممکن بنایا۔ ایک اندازے کے مطابق اس نمائش پر ہزار روپیہ خرچ ہوا ہے اور یہ روپیہ آزاد صاحب نے اپنی جیب سے نہیں مرکزی حکومت کے خزانے سے وصول کیا ہے۔ بہرکیف! اقبال نمائش آزاد صاحب کی صلاحیتوں اور کوتاہیوں کی بھی نمائش ہے۔

(۷ر نومبر ۷۳ء)

یہ سب رنگا سوامی ہیں

کشمیر کو ساری دُنیا جنّتِ بے نظیر کہتی ہے، اور جہانگیر نے نہ معلوم رندی و سرمستی کے کس لمحے میں اسے "فردوس برروئے زمین" قرار دے کر شاعرانہ مبالغے کی حد کر دی۔ مذہبی کتابوں اور واعظوں کی لچھے دار تقریروں میں جس جنّت کی تصویر پیش کی جاتی ہے۔ اس میں ضرورت ہی نہیں، عیّاشی کا ہر سامان (بمعہ حور و قصور) میسّر رہتا ہے، لیکن جنّتِ کشمیر میں دودھ ملائی تو کیا دیا سلائی تک دستیاب نہیں ہوتی اور اب رفتہ رفتہ ہوا بھی اتنی کثیف ہوتی جا رہی ہے کہ سانس لینا دوبھر ہو گیا ہے۔ غالبًا اِسی لئے جنّت کے ساتھ "بے نظیر"، کی صفت استعمال کی جاتی ہے۔ اس "جنّت"، کی سب سے بڑی خصوصیت اور انفرادیت یہ رہی ہے کہ اس میں میزبانوں کے مقابلے میں مہمانوں کو، رعایا کی بجائے حکمرانوں کو، مالکوں کی جگہ پاسبانوں کو، اور دوستوں سے زیادہ دشمنوں کو عزّت و احترام اور قدر و منزلت کا مقام حاصل رہا ہے۔ پُرانے زمانے میں بادشاہ ہوا کرتے تھے پھر مہاراجوں کا دور آیا اور ۱۹۴۷ء کے بعد جب مہاراجے بھی بھاگ گئے تو زمام اقتدار "دلیسیوں"، کے ہاتھ میں آ گئی۔ زندگی بھر غیروں کو "مائی باپ" کہنے والے یک لخت "مائی باپ"، بن گئے۔ مگر صدیوں کی غلامی نے ان میں ایک ایسا شدید احساس کمتری پیدا کیا تھا کہ حکمراں بننے کے بعد بھی ان کے دلوں سے احساسِ محکومی ختم نہیں ہوا۔ اور آزادی کے ۲۷ سال بعد بھی یہ احساس کسی نہ کسی شکل میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ باہر سے آیا ہوا سیاح ہو یا صحافی، مہتر ہو یا افسر، سیاستداں ہو یا سمگلر، ہمارے ہاں کے حکمران اُس سے اس درجہ

مرعوب اور متاثر ہو جاتے ہیں کہ اس کی راہ میں آنکھیں بچھانے لگتے ہیں۔ یہ کمزوری سب سے زیادہ بیرونی صحافیوں کے سامنے نمایاں ہو جاتی ہے اور پچھلے بیس بائیس برسوں کے دوران ملک کے بہت سے چالاک، عیّار، بے ایمان اور بے آبرو صحافیوں نے اس کمزوری سے اتنا فائدہ اُٹھایا ہے کہ کشمیر کو "صحافیوں کی جنت" کے نام سے یاد کیا جانے لگا ہے۔ صحافیوں کی خاطر تواضع، دیکھ بھال، سیر و تفریح اور عیش و عشرت پر اس ریاست میں جتنا روپیہ پچھلے بیس پچیس برسوں میں خرچ ہوا ہے اتنا روپیہ ہم نے صحت عامہ پر خرچ کیا ہوتا تو اس وقت ریاست کے ہر گاؤں میں ایک ایک ڈسپنسری قائم ہوتی۔ ہمارے لئے بیرونِ ریاست سے آیا ہوا ہر صحافی "گورنر" کی حیثیت رکھتا ہے اور ہمارے حکمراں اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کسی بھی حد تک جانے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ چاہے اس صحافی کی قیمت اور قابلیت دو کوڑی سے زیادہ نہ ہو۔ صحافیوں کی اس خاطر مدارات پر ۹ راگست ۱۹۵۳ء کے بعد غیر معمولی توجہ دی گئی اور خدا بخشے، بخشی صاحب کو کہ اُنھوں نے اپنے دورِ اقتدار میں اس بدعت کو فنونِ لطیفہ کا درجہ عطا کیا تھا۔ اُس زمانے میں انگریزی، اردو، تامل، تلگو، مراٹھی، ملیالم ہر زبان کے اخبار نویس کشمیر سے دلچسپی لینے لگے تھے۔ اور بخشی صاحب کی مہربانی اور میزبانی کی داستانیں اطراف و اکناف میں پھیلی ہوئی تھیں۔ انگریزی اخبار نویسوں پر خاص نظرِ عنایت تھی۔ اور ان کی "دیکھ بھال" میں مرحوم ذاتی دلچسپی لیتے تھے۔ اُردو کے اخبار نویسوں کے لئے یہی کیا کم تھا کہ بخشی صاحب انھیں 'شرفِ مہمانی' بخشتے تھے، وہ بے چارے مروّت کے مارے زندگی بھر اپنے میزبان کو دُعائیں دیتے رہتے۔ خاطر تواضع اور ذاتی توجّہ کی یہ ٹیکنیک بخشی صاحب کے لئے بے حد مفید، مؤثر اور کار آمد ثابت ہوئی۔ پورے دس سال تک مُلک بھر میں اُن کا ڈنکا بجتا رہا۔ اور ملک کے بڑے بڑے صحافیوں نے اُنھیں رُستمِ ہند، مردِ آہن، مردِ مومن، حاتم طائی اور بدشاہ ثانی کے خطابات سے نوازا۔ جب بھر کوئی سرپھرا اخبار نویس حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا تو اس کے حلق میں "گوشتابے" اُتار کر اُس کی نظر کمزور اور فکر مفلوج کردی جاتی، اور

اُسے چاروں طرف خالدِ کشمیر زندہ باد کے نعرے سُنائی دیتے۔ بخشی صاحب ان پالتو اخبار نویسوں میں "ہندو" مدراس کے ایک نامہ نگار کے، رنگا سوامی کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ یہ حضرت جنوبی ہندوستان سے شائع ہونے والے اس اخبار کے شمالی ہندوستان میں نمائندہ خصوصی تھے اور ان کا ہیڈ کوارٹر دہلی میں تھا۔ نہ جانے کس نیک ساعت میں کے، رنگا سوامی کی بخشی صاحب سے ملاقات ہوئی، اور اس کی تقدیر جاگ اُٹھی۔ اب وہ ہر دوسرے تیسرے روز سرینگر کے نیڈوز ہوٹل میں دکھائی دینے لگا، اور صبح و شام بخشی صاحب کے دربار میں اس کی حاضری لگنے لگی۔ "ہندو" مدراس میں بخشی صاحب کی مدح میں کئی مراسلے چھپے اور سوامی جی نے دل کھول کر اپنی نگارشات کی قیمت وصول کرنا شروع کی۔ وہ رفتہ رفتہ بخشی صاحب کے ذاتی دوست بن گئے اور بخشی صاحب جو دوست تو دوست، دشمنوں پر بھی جان چھڑکتے تھے، رنگا سوامی پر بالکل عاشق ہو گئے۔ ان دنوں جانکی ناتھ زتشی محکمۂ اطلاعات کے ڈائریکٹر تھے اور ایک اطلاع کے مطابق اُنھوں نے ہی سب سے پہلے مدراس کے سوامی کو کشمیر کی قضا و قدر کے مالک سے متعارف کرا دیا تھا۔ "اپنی دریافت" کی اس کامیابی پر زتشی صاحب بھی مسرور اور شاداں نظر آرہے تھے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے "ہندو" مدراس کے سوامی ESTABLISHMENT میں سب سے با اثر اور با رسوخ آدمی بن گئے۔ وہ اب اور لوگوں کی سفارش کرتے اور اپنے قبیلے کے دوسرے ساتھیوں کو بخشی صاحب سے متعارف کرتے۔ یہ ان ہی دنوں کی بات ہے کہ رنگا سوامی کی صاحبزادی کو سرینگر کے میڈیکل کالج میں سیٹ بھی مل گئی اور سوامی جی سے بخشی صاحب سے ذاتی تعلقات کی بنا پر وہ ہوسٹل میں رہنے کی بجائے بخشی صاحب کے گھر رہتی تھی۔ گہرے تعلقات اور دوستی کا یہ سلسلہ برابر اُس وقت تک قائم رہا کہ جب تک بخشی صاحب ریاست کے وزیر اعظم رہے۔ اس کے بعد قدرتی طور پر تعلقات میں وہ حدّت اور شدّت نہ رہی اور شری رنگا سوامی نے رفتہ رفتہ کشمیر کے نئے حکمرانوں سے ناطہ جوڑا۔ اسی دوران میں وہ "ہندو" مدراس ریٹائر ہو گئے۔ اور اُنھوں نے خواجہ غلام محمد صادق کو اپنے شیشے میں اُتار لیا۔ صادق صاحب اُنہیں مختلف

اخبارات میں مضامین لکھنے کے لئے غالباً پندرہ سو روپیہ ماہوار مشاہرہ دینے لگے۔ اور رنگا سوامی کا قلم اب ان کی مدح میں گھسنے لگا۔ صادق صاحب کی وفات کے بعد وہ قاسم صاحب کی شرن میں آگئے اور آجکل وہ بڑے زوروں سے ان کے گیت گا رہے ہیں۔ رنگا سوامی کی کہانی میں نے کچھ تفصیل سے بیان کی ہے۔ اس کے لئے آپ سے معافی کا خواستگار ہوں، لیکن اس کی وجہ سوامی جی کا وہ تازہ ترین مراسلہ ہے، جو مدراس سے شایع ہونے والے انگریزی ہفت روزہ "دی رائزنگ سن" کی ۲۶ر اکتوبر کی اشاعت میں شایع ہوا ہے۔ اب آپ اس مشہور صحافی کے پس منظر سے اچھی طرح واقف ہیں، آئیے اس پس منظر میں ان کے تازہ ترین ارشادات ملاحظہ کیجئے۔ "کیا کشمیر کا تصفیہ ہونا چاہیئے" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

"جب بخشی غلام محمد اقتدار میں تھے تو انہوں نے وادی میں انتہا پسندوں اور علیحدگی پسندوں کا ہوّا کھڑا کر دیا تھا تا کہ مرکزی لیڈروں کو یہ احساس ہو جائے کہ کشمیر میں اس کا برسر اقتدار رہنا، ریاست کا ہندوستان کا حصہ بنے رہنے کے لئے ضروری ہے۔ انہوں نے کبھی اپنے کسی ساتھی کو دہلی جانے اور وہاں ذاتی تعلقات قائم کرنے کی اجازت نہیں دی۔ دہلی والے صرف کشمیر کو مسٹر بخشی غلام محمد کی نگاہوں سے ہی دیکھ سکتے تھے۔ اور ریاست میں کچھ لوگوں کا دعویٰ یہ تھا کہ اگر دہلی کشمیر کے اندرونی حالات سے اچھی طرح واقف رہنا چاہتی ہے تو ان کا اقتدار کے بڑے بڑے منصبوں پر فائز رہنا ضروری ہے۔ یہ سب خود غرضانہ باتیں تھیں۔ اور ان کی وجہ سے کشمیر کی وادی آج چوبیس سال سے باقی ملک سے الگ تھلگ ہے۔"

میں رنگا سوامی کے تجربے اور تجزیے دونوں سے متفق ہوں، لیکن جو بات آج سوامی جی کو بائیس برس بعد نظر آئی ہے وہ بائیس برس قبل بھی اظہر من الشمس تھی، لیکن اس وقت ان کے حلق پر گشتابے، دماغ پر وہسکی اور نظر پر اقتدار کا غلبہ تھا۔ اس لئے ایک بہت

ہی معمولی اور واضح بات کو سمجھنے اور پھر بیان کرنے میں انہیں پورے بائیس برس لگ گئے۔ اور سب سے تکلیف دہ بات یہ ہے کہ رنگا سوامی پر اس حقیقت کا انکشاف اس وقت ہوا کہ جب بخشی غلام محمد اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ اور مجھے افسوس ہے کہ وہ اپنے دوست اور اپنے مدّاح، رنگا سوامی کے اس تجربے اور تجزیے سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ مجھے سوامی جی سے صرف یہ شکایت ہے کہ یہ حق بات کہنے کے لئے انہوں نے بخشی صاحب کی موت کا انتظار کیوں کیا۔ یہ تو ایسی بات تھی کہ ان کے جیتے جی کہی جاتی تو مزا آجاتا۔ لیکن ہندوستان کے کسی رنگا سوامی میں حق بات کہنے کی ہمت اور جرأت نہیں ہے اور اس کہانی کے بیان کرنے کا صرف یہ مقصد ہے کہ ریاست کے موجودہ حکمرانوں پر یہ بات واضح ہو جائے کہ جن صحافیوں پر آج ان کی بارش کرم ہے اور جن کی دیکھ بھال اور خاطر تواضع پر وہ ہزاروں روپیہ صرف کر رہے ہیں وہ سب رنگا سوامی ہیں۔ اور رنگا سوامی ہی کی طرح وہ ان کے زوال یا موت تک ہی ان کے دوست اور ہمدرد ہیں۔ ادھر کرسی گئی اور ادھر ان کی آنکھیں پھر گئیں۔ ان سب صحافیانِ کرام کو اپنے حلوے مانڈے سے غرض ہے اور یہ ایک وہسکی کی پیگ کی خاطر اپنے قلم کی عصمت، اپنے ضمیر کی آواز اور اپنے پیشے کی آبرو بیچنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔

۱۵ نومبر ۱۹۷۳ء۔

اناسین اور ایٹم بم

خبر ملی ہے کہ سری نگر کے ہسپتالوں اور شہر کے بازاروں میں ادویات کا زبردست قحط پڑا ہوا ہے اور ڈاکٹروں کے نسخے لئے مریضانِ شہر دوائیوں کی تلاش میں در بدر پھر رہے ہیں۔ دودھ، وناسپتی، مٹی کے تیل اور دیگر ضروریاتِ زندگی کے بعد ادویات کے اس قحط نے عام لوگوں کی مصیبتوں میں مزید اضافہ کر دیا ہے اور شہر کے دواساز اور دغاباز اس صورت حال سے بھرپور فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ چراغ بیگ نے جب محکمۂ صحت کے اربابِ اختیار سے ادویات کی اس نایابی کا سبب دریافت کیا۔ تو معلوم ہوا کہ سرکاری دواساز کمپنی "ہندوستان فارموسیوٹیکلز" نے اس بنا پر ادویات کی سپلائی بند کر دی ہے کہ وہ اپنی قیمتوں میں اضافہ کرنا چاہتی ہے اور ابھی سرکار نے اس کی اجازت نہیں دی ہے۔ جب ایک دواساز سے اس سلسلے میں استفسار کیا گیا تو اس نے بڑی سنجیدگی سے یہ دلیل پیش کر دی کہ "ادویات کی تیاری میں جو مصالحہ استعمال ہوتا ہے وہ سب کا سب ایٹم بم کی تیاری میں صرف ہوا ہے اس لئے دوائیاں نایاب ہو گئی ہیں۔" مجھے دواساز کا جواب زیادہ معقول اور حقیقت پسندانہ معلوم ہوا کیوں کہ اس میں اس ملک کے اربابِ اقتدار پر ایک بھرپور طنز ہے۔ یہ حکومت عوام کو اسپرو اور اناسین تک تو مہیا کر نہیں سکتی، لیکن ایٹم بم کی تیاری پر کروڑوں روپے خرچ کر کے اپنی شہرت اور پڑوسیوں کی وحشت کا سامان کر رہی ہے۔

(۷؍جون ۷۴ء)

امن کونسل، مفتی صاحب اور سی، آئی، اے

پچھلے ہفتے سری نگر میں ورلڈ پیس کونسل اور سالیڈرٹی آرگنائزیشن کی سرینگر شاخ کی ایک خصوصی میٹنگ منعقد ہوئی، جس میں پیر غیاث الدّین سابق وزیر، محمد ایوب خان صدر کانگریس، وزیر ٹرانسپورٹ و بجلی غلام رسول کار، مس محمودہ احمد علی سابق پرنسپل اور دینا ناتھ نادم کے علاوہ مفتی بشیر الدّین اور جماعت اسلامی کے کرمانی صاحب بھی شریک ہوئے۔ ورلڈ پیس کونسل اور سالیڈرٹی آرگنائزیشن ایک عالمگیر کمیونسٹ تحریک ہے جو براہِ راست روسی حکومت کی سرپرستی اور اعانت سے جاری ہے۔ اِس لئے اس خصوصی میٹنگ میں مفتی بشیر الدین اور مولینا کرمانی کی موجودگی آپ کو عجیب سی لگے گی، لیکن اس بات کو ذہن میں رکھئے کہ ہمارے ہاں کے مولویوں اور ملاؤں میں اتنی سُدھ بُدھ نہیں کہ وہ یہ فیصلہ کر سکیں کہ انہیں کہاں جانا چاہیئے اور کہاں نہیں۔ انہیں کہیں سے بھی "شرکت کی دعوت ملنا چاہیئے" اور وہ آنکھیں بند کر کے دوڑ پڑتے ہیں کہ ہو نہ ہو وہاں ضیافت کا اہتمام بھی ہو۔ خیر، پیس کونسل کی اس میٹنگ میں وزیر بجلی غلام رسول کار نے یہ کہہ کر بجلی گرادی کہ اِس خصوصی میٹنگ کا مقصد دراصل کچھ دوستوں کیلئے بیرونی سفر پر جانے کے مواقع پیدا کرنا ہے۔ سابق وزیر بجلی پیر غیاث الدّین نے جب کار صاحب کو یقین دلایا کہ اب کی بار انہیں بھی باہر جانے کا موقع عطا کیا جائے گا تو وہ مطمئن ہو گئے۔ دینا ناتھ نادم نے جب یہ انکشاف کیا کہ ریاست میں

سی آئی اے کی سرگرمیاں بڑھ گئی ہیں اور ہمیں ان کا مقابلہ کرنا چاہیئے ۔ تو مفتی بشیر صاحب اور مسٹر کرمانی دونوں ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے، جیسے وہ ایک دوسرے سے کہہ رہے ہوں کہ یہ لوگ تو ہمارے ہی خلاف بات کر رہے ہیں ۔ مس محمودہ احمد علی نے ایک " خالص ترقی پسند تنظیم " میں مفتی صاحب اور کرمانی صاحب کی موجودگی پر اعتراض کے لہجے میں یہ دریافت کیا کہ آیا اس تنظیم کی کوئی نظریاتی بنیاد بھی ہے یا نہیں ؟ اس طرح یہ خصوصی میٹنگ کچھ عامیانہ گفتگو کے بعد ختم ہوگئی ۔ اور اس کی کاروائی کی رپورٹ فوری طور پر ہندوستان میں مقیم روسی سفیر کو بھیج دی گئی ۔

(۷ رجون ۷۴ ء)

عجائب گھر کے عجوبے

ڈپٹی ڈائریکٹر لائبریریز، ریسرچ اینڈ میوزیم ڈاکٹر اکبر حیدری نے یہ سنسنی خیز انکشاف کیا ہے کہ سٹیٹ میوزیم سے چالیس کے قریب نایاب مخطوطے اور دس بیش قیمت مغل تصویریں چرائی گئی ہیں اور اُنھوں نے اعلیٰ حکام کو اس امر کی اطلاع بھی کر دی ہے۔ ابھی حیدری صاحب کے انکشاف کی سیاہی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ میوزیم کے کیوریٹر صاحب نے اس کی تردید میں ایک بیان داغ دیا۔ کیوریٹر مسٹر بھان نے کہا ہے کہ میوزیم سے نہ کوئی مخطوطہ غائب ہوا ہے اور نہ کوئی پینٹنگ، دونوں میں سے ایک حضرت جھوٹ بولتے ہیں۔ اور کون جھوٹ بولتا ہے۔ اس کا فیصلہ کرنا بہت آسان ہے اور وہ یوں کہ وزیرِ تعلیم میوزیم میں جا کر مخطوطوں اور تصویروں کا بہ نفسِ نفیس ملاحظہ کریں، مگر اس میں خطرہ یہ ہے کہ کہیں وزیر موصوف کو ہی میوزیم میں بند نہ کر دیا جائے۔ کیونکہ وہ بھی کچھ کم قابلِ دید شخصیت نہیں ہیں۔

کیوریٹر کے بیان کے مطابق ڈاکٹر اکبر حیدری پر کسی ماتحت ملازم کے حملے کی اطلاع بھی غلط ہے۔ حالانکہ اس حملے کے نتیجے میں حیدی صاحب کی ہڈی پسلی بھی لوٹ گئی ہے۔ اور وہ ابھی تک زیرِ پلاسٹر ہیں۔ میرا خیال ہے کہ بھان صاحب کو بھی " اپنے عہد کا سب سے جھوٹا کیوریٹر" کی سُرخی کے تحت میوزیم کے کسی شوکیس میں سجا دینا چاہیے۔

(۷ ر جون ۶۷ء)

تعلیمی کانفرنس کا آنکھوں دیکھا حال

آئیے! آج آپ کو سیاحوں کے استقبالیہ مرکز پر لے جائیں کہ جہاں ان دنوں "روئے زمین پر سب سے بڑا تماشہ GREATEST SHOW .. EARTH دکھایا جا رہا ہے۔ چراغ بیگ اس تماشے کا آنکھوں دیکھا حال اور کانوں سنا احوال سنائیں گے اور آپ خاموشی سے سُنتے جائیے۔

یہ سیاحوں کا استقبالیہ مرکز ہے اور میں اس مرکز کے مرکزی ہال سے بول رہا ہوں۔ اس ہال میں گورنر ایل کے جھا، شیخ محمد عبد اللہ، وزیر اعلیٰ سید میر قاسم اور چراغ بیگ کے علاوہ میرزا محمد افضل بیگ (محاذ رائے شماری) مولانا محمد فاروق (عوامی ایکشن کمیٹی) شمیم احمد شمیم، سیف الدین قاری (جماعت اسلامی) پروفیسر چمن لال گپتا (جن سنگھ) اور پنڈت جانکی ناتھ (کشمیری پنڈت کانفرنس) بھی تشریف فرما ہیں۔ چراغ بیگ کے دائیں بائیں بھی تقریباً سو سوا فراد بکھرے پڑے ہیں، اور ان کے چہروں پر چھائی ہوئی سنجیدگی سے ان کی اندرونی رنجیدگی مترشح ہے۔ ان میں کچھ کالجوں کے پرنسپل کچھ ریٹائر شدہ پرنسپل چند سابق وزیر، جموں اور کشمیر یونیورسٹیوں کے موجودہ اور سابق وائس چانسلر، آدھ درجن کے قریب پروفیسر، ڈیڑھ درجن کے قریب دانش ور، دو درجن سرکاری افسر اور چالیس پچاس برس قبل ریٹائر شدہ کچھ سرکاری افسر بھی شامل ہیں۔ یہ تمام لوگ اس مرکزی ہال میں اس لئے جمع ہو گئے ہیں کہ انھیں گورنر بہادر شری ایل کے جھا نے جمع ہونے کے لئے کہا ہے، اور گورنر موصوف کا خیال ہے کہ یہ لوگ طالب علموں کی

موجودہ بے چینی اور بے قراری پر سوچ بچار کر کے اِس کو دور یا کم کرنے کے لئے کوئی حل یا تجویز پیش کریں گے۔ جھا صاحب بہت معصوم اور خوش فہم آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ خُدائے ذوالجلال ان کی عزّت اور عصمت کی حفاظت کرے، آمین!

کانفرنس اب شروع ہوتی ہے اور گورنر صاحب اپنا افتتاحی خطبہ پڑھ رہے ہیں۔ چراغ بیگ سمیت سب لوگ پوری توجہ سے جھا صاحب کو سن رہے ہیں لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں کہ جو ان کی بات سمجھ رہے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے خطبے میں کچھ بڑی اچھی باتیں کہی ہیں۔ لیکن اچھّی باتوں میں ایک عیب یہ ہوتا ہے کہ ان میں کوئی ندرت نہیں ہوتی۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ میں نے گورنر صاحب کی یہ تقریر کہیں پڑھی ہے یا ہو سکتا ہے کہیں اور بھی سُنی ہو۔ جھا صاحب کے بعد شیخ صاحب نے مقالہ پڑھا۔ مقالہ مختصر تھا، اِس لئے سامعین نے بڑی دِل چسپی سے سُنا، لیکن سُننے سے زیادہ لوگ شیخ صاحب کو دیکھ رہے ہیں، اور میں یعنی چراغ بیگ ان دیکھنے والوں کو دیکھ رہا ہوں، ایک عجیب سا منظر ہے، "تاریخ، ایک تاریخی کروٹ لے رہی ہے، اور ہم سب پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں"، ابھی چند سال پہلے شیخ عبداللہ کا نام لینا جُرم تھا۔ اور آج شیخ صاحب شمع محفل بنے بیٹھے ہیں: ہر شخص انھی سے مخاطب ہے، اور ہر شخص کی یہی کوشش ہے، کہ وہ شیخ صاحب کو اپنی بات، اپنی ادا، اپنی تحریر اور اگر کچھ نہیں تو اپنی خاموشی سے متاثر کر دے۔ گورنر اور وزیرِ اعلیٰ سے لے کر پیر غیاث الدین اور چیت رام چوپڑہ تک ہر شخص شیخ صاحب کی مدح میں رطب اللسان ہے، اور مجھے فراقؔ کا یہ شعر یاد آرہا ہے۔

دیکھ رفتارِ انقلاب فراقؔ کتنی آہستہ اور کتنی تیز

شیخ صاحب نے اپنے مقالے میں طالب علموں میں بڑھتی ہوئی بے راہ روی پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ طلبا کا استحصال کرنے والے سیاستداں قوم کے دشمن ہیں۔ اُنھوں نے حکومت کی غلط تعلیمی پالیسی کی بھی نکتہ چینی۔ ان کے مقالے کے بعد، مکالمے کا آغاز ہوا، جس میں شمیم احمد شمیم، بلراج پوری، میرزا افضل بیگ،

عبدالسلام ڈار اور گورنر ایل کے جھا نے حصّہ لیا، یہ سب حضرات کیا کہہ رہے ہیں۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ غالباً خود ان لوگوں کی سمجھ میں بھی نہیں آرہا ہے لیجئے! اب کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر مسٹر چشتی نے تکلیف تکلم فرمایا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ میں اس کانفرنس کے لئے کوئی مقالہ نہ لکھ سکا، ان کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کسی نے ان کو مقالہ لکھ کر نہیں دیا۔ کیوں کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لکھنے کی ہی نہیں، سوچنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہیں کشمیر یونی ورسٹی کے لئے ایسا ہی وائس چانسلر ہونا بھی چاہیے، چشتی صاحب کے خیال میں طلبا کی بے چینی اور بے راہ روی کی اصل وجہ ٹرانسپورٹ کی دشواریاں ہیں۔ اور اگر حکومت زیادہ بسیں مہیّا کرے، تو سارے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے، اپنی بیس پچیس منٹ کی طویل تقریر میں چشتی صاحب نے ایک بھی بات ایسی نہیں کی، جس سے یہ اندازہ ہو کہ وہ طالب علموں کے مسائل، ان کی مشکلات یا ان کی نفسیات کے بارے میں کچھ جانتے ہوں، معلوم نہیں کہ قاسم صاحب نے یہ "نمونہ" کہاں سے دریافت کیا ہے؟ کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ وائس چانسلر صاحب انگریزی بھی غلط بول رہے ہیں۔ میں اس بارے میں خود کچھ نہیں کہہ سکتا، کیوں کہ میری اپنی انگریزی بھی کمزور ہے۔ کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحب کی تقریر کے بعد جموں یونیورسٹی کے وائس چانسلر مسٹر شرما نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے اپنی تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان سے پہلے یونیورسٹی میں ہر قسم کی برائی تھی۔ لیکن جب سے انھوں نے چارج سنبھالا ہے، جموں یونیورسٹی میں کسی قسم کی بدنظمی یا بے راہ روی کا کوئی شائبہ بھی نہیں۔ اور تو اور وہاں پچھلے دو سال سے امتحانات میں نقل کی بدعت بھی ختم ہو گئی ہے۔ شرما صاحب کی اس "دیدہ دلیری" پر کانفرنس میں موجود جموں یونیورسٹی کے اساتذہ حیران و ششدر رہ گئے۔ میرے قریب بیٹھے ہوئے ایک جموی دوست نے مجھ سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا، کہ "جموں والوں نے کم از کم جھوٹ بولنے میں تو کشمیریوں کو پچھاڑ دیا ہے"۔

ایک کشمیری استاد نے اپنا ردِ عمل یوں ظاہر کیا کہ " نقل کی بیماری در اصل جموں یونیورسٹی سے ہی شروع ہوئی۔ اور کشمیر کے خوشگوار ماحول اور معتدل آب و ہوا میں اسے پھلنے پھولنے کے زیادہ مواقع ملے ہیں۔" میں نقل اور اسی نوعیت کی دوسری بے ایمانیوں کے بارے میں جموں اور کشمیر کی تفریق کا قائل نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ " ہم چور ہیں" اب تقریروں کا سلسلہ چل پڑا ہے، اور گورنر صاحب نے سردار ہربنس سنگھ آزاد کو دعوتِ فکر دی ہے۔ آزاد صاحب، اُستاد، سیاست دان وزیر سبھی کچھ رہ چکے ہیں۔ اور اب بے چارے ویلیج اینڈ کھادی کمیشن میں کچھ اِس بُری طرح پھنس گئے ہیں، کہ باہر نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ انھوں نے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے اور اپنے من کی پیاس بجھانے کے لئے یہ موقع غنیمت جان کر حکومت کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اور کہا کہ پُورے معاشرے کو آلودہ کرنے میں سب سے زیادہ تباہی اربابِ اقتدار نے برپا کردی ہے اور طالبِ علم جو کچھ کر رہے ہیں، وہ انھوں نے ہم سے اور ہمارے لیڈروں سے سیکھا ہے، آزاد صاحب نے اربابِ حکومت اور اہلِ سیاست کو کھری کھری سنائیں۔ اب میرزا محمد افضل بیگ کو سنیئے۔ ان کی تقریر بڑی زوردار ہے اور وہ بڑی شگفتہ زبان میں بہت سی غیر متعلق باتیں کہہ رہے ہیں وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تعلیمی کانفرنس اور سیاسی اسٹیج میں فرق نہیں کر سکتے ان کے استدلال میں وکالت بھی ہے اور سیاست بھی، وہ لوگ بھی جو ان کے خیالات سے متفق نہیں ہیں، ان کی تقریر سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ یہی بیگ صاحب کا کمال ہے ـــ اب اپنے مرتبے اور منصب کے لحاظ سے مولانا فاروق صاحب کی باری ہے، دیکھئے یہ حضرت، کیا گل کھلاتے ہیں۔

"صدر محترم، مندوبین حضرات اور نوجوان دوستو!" یہ فاروق صاحب کی آواز ہے۔ وہ رُک رُک کر بولتے ہیں۔ یہ ان کا خاص انداز ہے۔ " اس اجتماع میں ابھی تک سب لوگ انگریزی میں بولتے رہے۔ میں اس روایت کو توڑ کر اُردو میں بولنا چاہتا ہوں، اور مجھے اُمید ہے کہ اس بات کے لئے آپ مجھے پاکستانی قرار نہیں دیں گے۔

مولوی صاحب نے بزعم خود بڑی نادر بات کہی۔ لیکن کانفرنس میں موجود سبھی لوگ مولوی صاحب کی اس نادانی پر شرمندہ ہیں، اب مولینا نے اپنی تعریف شروع کر دی۔

"میں صاف بات کرنے کا عادی ہوں میں کسی سے ڈرتا نہیں۔ میں جو کچھ کہتا ہوں، اعلانیہ کہتا ہوں۔ اور اس اجتماع میں چوں کہ ہر شخص کو آزادی سے اپنی بات کہنے کا حق ہے۔ اس لئے میں بھی آزادی سے بات کروں گا۔ کیوں کہ میں کسی سے ڈرتا نہیں"۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ مولوی صاحب بار بار اپنے ڈرنے کا اعلان کیوں کر رہے ہیں! کیا ان کے دل میں کوئی ڈر یا خوف ہے کہ جس کو دور کرنے کے لئے وہ بار بار اپنی نڈرتا اور بہادری پر زور دے رہے ہیں۔ "مجھے افسوس ہے اور میں بڑی صفائی کے ساتھ یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ طالب علموں کا کردار تباہ کرنے، انھیں گمراہ کرنے کے لئے کچھ ایجنسیاں کام کر رہی ہیں۔ اور میں کہتا ہوں کہ ان ایجنسیوں کو ختم کرنا چاہیے کیوں کہ یہ طالب علموں کے کردار کو مسخ کرنے کے لئے کروڑوں روپے خرچ کر رہے ہیں، میں صفائی سے بات کر رہا ہوں۔ میں لگی لپٹی نہیں جانتا۔ فاروق صاحب بڑے جوش میں آکر کہہ رہے ہیں۔

"جی ہاں! ہر ایجنسی پر روگ لگنی چاہیے، سرحد پار کی ایجنسیوں پر بھی"——

شمیم احمد شمیم نے مداخلت کی۔ اور مولینا صاحب کو بڑا تاؤ آیا، کہنے لگے۔ شمیم صاحب تو ہر بات کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ لیکن یہاں چوں کہ ہر شخص کو آزادی سے اپنے خیالات ظاہر کرنے کی اجازت ہے، اِس لئے انھیں میری بات سُننا پڑے گی، چاہے اس سے انھیں کوفت ہی کیوں نہ ہو"۔

اِس کے بعد مولینا صاحب نے طلباء کی اخلاقی تربیت، مذہبی تعلیم اور بلندی کردار پر زور دیتے ہوئے اپنی تقریر کے ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ تقریروں کے بعد اب مقالات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور چوں کہ ان تمام مقالات میں تقریباً ایک ہی بات کو دہرایا گیا ہے، اس لئے میں تمام مقالات اور خیالات کے ذکر سے آپ کی سمع خراشی نہ کروں گا۔ صرف کچھ اہم تجربات، تاثرات اور کیفیات آپ تک

پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ یہ بات میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ کس طرح سب لوگ شیخ صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ان کی بے جا خوشامد میں ایک دوسرے پر سبقت لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن کامریڈ موتی لال مصری اور پیر غیاث الدین نے اِس سلسلے میں حد کر دی۔ ساری دُنیا جانتی ہے کہ ۱۹۵۳ء کے شب خون میں ریاست اور بیرون ریاست کے کمیونسٹوں نے مرکزی رول ادا کیا ہے۔ اور انہی لوگوں نے شیخ صاحب کے خلاف اِس ناپاک سازش کو نظریاتی مواد اور اساس دینے کی کوشش کی لیکن اب چوں کہ ہوا بدل گئی ہے اس لئے ہمارے کامریڈوں کی زبان، ان کا لب ولہجہ اور آہنگ سب کچھ بدل گیا ہے۔ وہ تاریخ کو جھٹلاتے ہی نہیں، اِس کو بھلا دینے کی کوششوں میں بھی مصروف ہیں۔

اس دور کی تمام تر برائیوں کی اصل جڑ ۱۹۵۳ء کا وہ خونیں ڈرامہ ہے کہ جب شیر کشمیر کو ایک خوفناک سازش کا شکار بنا کر گرفتار کیا گیا۔ جن بچّوں نے اپنے محبوب رہنما کی گرفتاری کا یہ منظر دیکھا ہے ان سے ہم یہ کیوں کر توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ ہماری اقدار اور ہماری شرافت پر یقین لائیں۔" یہ موتی لال مصری کا نعرۂ حق تھا لیکن اِسے ادا کرنے کے لئے مصری صاحب کو بیس برس تک خاموش رہنا پڑا۔

سابق وزیر پیر غیاث الدّین نے اپنی تقریر کا آغاز بھی شیخ صاحب کے نام سے کیا اور اس کا خاتمہ بھی شیخ صاحب ہی کے نام نامی سے ہوا، پیر صاحب نے اپنی بیس منٹ کی تقریر میں بہتر بار شیخ صاحب کا، تیس مرتبہ قاسم صاحب کا، دو بار مارکس کا اور ایک بار گاندھی کا نام لیا۔ انھوں نے اپنی حیرت انگیز مارکسی تقریر میں یہ انکشاف فرمایا کہ انھیں علی گڑھ بھیج کر وکالت پاس کرانے سہرا بھی شیخ صاحب ہی کے سر ہے کہ جنھوں نے ان کے بھائی پیر عبد الاحد کو مشورہ دیا کہ "غیاث الدین کو علی گڑھ بھیجو"! یہ حقیقت غیاث صاحب کو ۱۹۵۳ء سے پہلے بھی معلوم تھی۔ لیکن اس کے انکشاف کے لئے انھیں موزوں وقت کی تلاش تھی۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے آج سے بہتر موقع ہاتھ نہ آسکتا تھا۔ غیاث صاحب دس بارہ برس وزیر رہ چکے ہیں۔ آج بھی

حکم اس جماعت کے نائب صدر ہیں۔ لیکن ان کی تقریر سے یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ ہمیشہ "انقلاب زندہ باد" کہتے آئے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی تقریر کے اختتام پر امتحانات کے موجودہ طریقے کو بدل کر اس کی جگہ امریکی طرز امتحان رائج کرنے کا مطالبہ کیا۔ اور جب اس مرحلے پر شمیم احمد شمیم نے مداخلت کر کے یہ دریافت کیا کہ کیا وہ واقعی امریکن طریقۂ امتحان کو پسند کرتے ہیں ؟ تو مارکسی فلسفے کے کانگریسی پیغمبر پیر غیاث الدّین نے اثبات میں اپنا سر ہی نہیں، سارا بدن ہلا دیا۔ اب چائے کا وقفہ ہو گیا ہے، اور جو لوگ تقریریں اور مقالات سُن سُن کر بور ہو گئے ہیں، وہ چائے کی میز پر ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں۔ جن لوگوں کو اندر بولنے کا موقع نہیں ملا ہے۔ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے دل کی بھڑاس نکال رہے ہیں۔ چائے کے وقفے کے بعد اب پھر محفل آراستہ ہو گئی ہے۔ آئیے ایک نظر شرکاء محفل کی ترتیب پر بھی ڈال دیں۔ شیخ صاحب کی داہنی طرف وزیر اعلیٰ سیّد میر قاسم بیٹھے ہیں اور قاسم صاحب کے دائیں طرف بیگم عبد اللہ تشریف فرما ہیں۔ قاسم صاحب نے ہی ۱۹۷۲ء انتخابات میں بیگم عبد اللہ کے ریاست میں داخلے پر پابندی عائد کی تھی۔ اور یہ جو بیگم صاحبہ کے دائیں طرف ایک شریف صورت، شرمیلے اور معصوم صفت انسان نظر آتے ہیں۔ یہ تعلیم کے نائب وزیر، چرار شریف کے عبد القیوم صاحب ہیں۔ یہ وہی حضرت ہیں کہ جنھوں نے ۱۹۷۱ء کے پارلیمانی الیکشن میں بیگم صاحبہ کے انتخابی جلسے پر چرار شریف کے غنڈوں سے حملہ کروا کر مولانا محمد سعید مسعودی کا کمبل اڑوا لیا تھا۔ اور شمیم احمد شمیم کو لاٹھیوں سے زود و کوب کروایا تھا۔ آج سب ایک ہی صف میں، ایک ہی جگہ، شیر و شکر ہو کر بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں ۔۔ اور اس کو انقلاب کہتے ہیں۔

گرلز کالج کی سابق پرنسپل مس محمودہ احمد علی اور موجودہ پرنسپل مسز شملہ مفتی ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھی ہوئی ہیں محمودہ جی، مسز مفتی کو یوں گھور گھور کر دیکھ رہی ہیں کہ جیسے ان کا بس چلتا تو وہ ان کو کچا چبا جاتیں۔ محمودہ جی کا خیال ہے کہ ان کے بعد کالج میں ان کی جگہ خالی رہنا چاہیئے تھی، اور مسز مفتی نے پرنسپل بن کر

ان کے منصب اور مرتبے کی توہین کی ہے۔ محمودہ جی نے ایک مختصر سا مقالہ پڑھا جس میں انھوں نے تعلیم کو زیادہ بامقصد اور متنوع بنانے پر زور دیا۔ مسز شملہ مفتی نے اپنے مقالے میں محمودہ جی پر کچھ ہلکی سی چوٹیں کی ہیں جس کی وجہ سے محمودہ جی سخت تلملا رہی ہیں، اور ان کی آنکھوں سے شرارے پھوٹ رہے ہیں۔ جماعت اسلامی کے سیف الدّین قاری اور شمیم احمد شمیم ایک جگہ تشریف فرما ہیں۔ اور ایک دوسرے سے اس طرح راز و نیاز کی باتیں کر رہے ہیں کہ جیسے بہت گہرے دوست ہوں۔ حالانکہ دُنیا جانتی ہے کہ شمیم صاحب کو جماعت کے لیڈروں سے اور جماعت کے لیڈروں کو شمیم صاحب سے کتنی پرخاش ہے۔ ایک کونے میں بخشی صاحب کے داماد میر نصر اللہ، جو آج کل جموں کے ڈویژنل کمشنر ہیں، پائپ پی رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ ساری کانفرنس بخشی صاحب کے خلاف ہے، کیوں کہ ہر شخص شیخ صاحب کو خوش کرنے کی غرض سے موجودہ نظام کی ساری بُرائیوں کا آغاز ۱۹۵۳ء سے کرتا ہے انھیں اس بات پر حیرت ہے کہ وہ لوگ جو بخشی صاحب کے دور میں ان کی ہر ادا اور پالیسی کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے، آج ان کی ہر بات کو غلط ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ نصر اللہ صاحب چراغ بیگ کے اُستاد ہیں اور شاگرد کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اُستاد کے علم اور اس کی بصیرت میں اضافہ کرنے کی گُستاخی کرے ورنہ میں اُن سے کہتا، کہ تاریخ کے دریا میں افراد تنکوں کی طرح بہہ جاتے ہیں۔ اور ہر شخص کسی نہ کسی مرحلے پر IRRELEVANT اور بے کار ہو جاتا ہے تاریخ آج جو سلوک بخشی صاحب کے ساتھ کر رہی ہے کچھ دنوں کے بعد وہ ہمارے ساتھ یہی کرے گی۔ اس لئے آزردہ ہونے کی ضرورت نہیں۔

خواجہ غلام حسن خاں (سابق چیف انجنیئر) کا مقالہ اور جموں کے چیت رام چوپڑہ کی تقریر سن کر یہ اندازہ ہوا کہ ایک خاص عمر کو پہنچ کر ذہین سے ذہین انسان کا توازن اور اس کی عقل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ خاں صاحب کے بارے میں سُنا ہے کہ وہ اپنے وقت کے بڑے اچھے انجنیئر رہے ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف بھی

ہیں۔ اور بہت سے لوگ ان پر ایمان داری اور دیانت داری کی تہمت بھی عائد کرتے ہیں۔ لیکن وہ آج بھی سو سال پُرانی دُنیا میں رہ رہے ہیں اور ان کا علم، ان کی زبان اور حد سے بڑھی ہوئی انانیت اور خود نمائی، نئی نسل کے لئے ناقابلِ فہم ہے۔ انھیں یقیناً کسی نادان دوست نے اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے کہ وہ اِس دور کے سقراط اور بقراط ہیں۔ وہ اگر میرا مشورہ مانیں تو انھیں ان دنیاوی جھمیلوں میں پڑنے کی بجائے اپنا زیادہ تر وقت یادِ خدا میں صرف کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ان کی تحریر اور تقریر دونوں ہی پر زمین کی چھاپ نہیں آسمان کا سایہ ہے۔ چیت رام چوپڑہ کا خیال ہے کہ وہ نوجوانوں کی اکھڑ کر اور ان کے لب و لہجے میں بات کر کے، اپنے بڑھاپے اور اپنے ذہنی ضعف کو چھپا سکتے ہیں۔ لیکن میں انھیں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ وہ ماضی بعید میں جو کچھ بھی رہے ہوں۔ آج ان کی آواز ایک بے ہنگم ساز بن کر رہ گئی ہے۔ مختصر الفاظ میں وہ اپنا ہم آہنگ کھو چکے ہیں، اور اب وہ اپنی عمر کی اس منزل میں ہیں کہ جہاں اس کی بازیافت ناممکن ہے۔

اساتذہ میں اسلامیہ کالج کے پرنسپل پروفیسر اقبال اور کالج کے پرنسپل رام ناتھ کول کے مقالے بڑی توجہ کے ساتھ سُنے گئے۔ اقبال صاحب نے روحانی تربیت اور مذہبی اقدار کے فروغ پر زور دیا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ کچھ ضرورت سے زیادہ زور دیا۔ اُنھوں نے نوجوانوں کے لئے عام فلموں پر پابندی کا مطالبہ کر کے، انتہاپسندی کا ثبوت دیا۔ وہ غالباً فردوس سینما اور پلیڈیم ٹاکیز کے باہر فلم "بوبی" کے شائقین کا اژدہام دیکھ کر گھبرا گئے ہیں۔ وہ میرا مشورہ قبول کریں، تو انھیں کم از کم ایک بار بوبی دیکھ ہی لینا چاہیئے۔ میں انھیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ ایک بار پھر جوان ہو جائیں گے۔ جماعت اسلامی کے سیف الدین قاری نے اس تعلیمی کانفرنس کو بھی اپنے جماعتی پروپاگنڈے کے لئے استعمال کیا اور طلبا کے سدھار سے زیادہ شیخ صاحب کے وقار کو نقصان پہنچانے پر ہی اپنا زور صرف کیا۔ جماعت اسلامی کے لیڈروں کو اخلاق، انسانیت اور شرافت کا درس دیتے ہوئے بد اخلاقی تعصب، نفرت اور فرقہ واریت

پھیلانے میں جو ملکہ حاصل ہے قاری صاحب نے اس دعویٰ سے بھرپور استفادہ کیا کہ جماعت اسلامی کے مکتب، ضبط ونظم، اخلاقی بلندی اور تعمیر سیرت کے بہترین نمونے ہیں۔ میرے اپنے خیال میں یہ تعصب اور باہمی منافرت پھیلانے کے سب سے بڑے مراکز ہیں۔

کانفرنس کی سب سے دِل چسپ اور طویل تقریر جمّوں کالج کے پرنسپل مسٹر بخشی نے کی، انھوں نے سب سے پہلے اپنے خاندان کی تاریخ بیان کی، پھر اپنی پیدائش کا قصہ سُنایا اور اس کے بعد اپنے کارناموں کی فہرست بیان کرنا شروع کی، وہ ابھی تقریر کر ہی رہے ہیں اور میں چلا آیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان کی تقریر ابھی جاری ہے۔

پچھلی اشاعت میں چراغ بیگ نے قدرے تفصیل کے ساتھ اس سہ روزہ تعلیمی کانفرنس کا احوال سُنایا تھا کہ جس کا اہتمام ریاست کے گورنر ایل کے جھا نے طالب علموں کی موجودہ بے چینی کے اسباب دریافت کرنے کے لئے کیا تھا۔ کانفرنس نے طلباء کی بے چینی دور کرنے کے لئے کچھ کیا ہو یا نہیں۔ اس کا ایک فائدہ ضرور ہوا ہے کہ شہر کے بے کار سیاستدانوں، ریٹائر استادوں اور ازمنہ وسطیٰ سے تعلق رکھنے والے کچھ ذہنوں کو پورے تین دن کے لئے کام مِل گیا بہت سے سرکاری محکموں کے سربراہ جنھیں صرف اس لئے کانفرنس میں مدعو کیا گیا تھا کہ وہ آئی۔ اے ایس ہیں۔ اور ان کی تنخواہ پندرہ سو روپے ماہانہ سے زائد ہے۔ دن بھر کانفرنس ہال میں پائپ، سگار اور سگریٹ پیتے رہے۔ یہ لوگ زیادہ تر گپ شپ میں مصروف رہے۔ لیکن جب جب وزیر اعلیٰ سیّد میر قاسم کسی مسئلے پر زبان کھولتے۔ یہ وفادارانِ ازلی، پوری توجہ اور انہماک سے اِن کے ارشادات عالیہ سُننے کے لئے ہمہ تن گوش نظر آتے۔ ان کی نگاہوں میں اس تعلیمی کانفرنس کی کامیابی اور افادیت کا سب سے بڑا پیمانہ یہ تھا کہ انھیں کتنی مدّت کے لئے وزیر اعلیٰ کے قرب وجوار میں بیٹھنے کا موقع ملتا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ جموں کے ڈویژنل کمشنر میر نصر اللہ اور محکمۂ اطلاعات کے سکریٹری شیخ غلام احمد، جو بنیادی طور پر اُستاد اور حُسن اتفاق سے آئی۔ اے۔ ایس ہیں اور جن کو کانفرنس میں صرف اس لئے مدعو کیا گیا تھا کہ وہ محکمۂ تعلیم سے

سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ پورے تین دن تک بڑی خاموشی مگر باقاعدگی سے کانفرنس میں شریک رہے۔ اور انھوں نے ایک بار بھی اپنے ہونٹوں کو جنبش نہیں دی۔ ایسے لوگوں کو کیوں زحمت دی گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ غالباً ان اعلیٰ افسروں کو ماسٹروں کی اس کانفرنس میں شرکت سے اپنا وہ ماضی یاد آ رہا تھا کہ جسے وہ ہر قیمت پر فراموش کرنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح پلاننگ، مالیات اور یونیورسٹی کے سب سے بڑے ماہر شری نور محمد بھی اپنی خالص افسرانہ حیثیت میں شریک محفل رہے۔ لیکن انھوں نے بھی اپنے لبوں کو ایک بار بھی جنبش نہیں دی۔ محکمہ اطلاعات کے ڈائریکٹر وسکریٹری شری غلام رسول رینزو، اور ہوم سکریٹری شری گھنشیام بھی قاسم صاحب کو اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لئے کانفرنس ہال میں کئی بار تشریف لائے اور چلے گئے۔ میر غلام محمد طاؤس ڈویژنل کمشنر کشمیر کی غیر موجودگی بُری طرح کھٹک رہی تھی۔ انھیں یا تو دعوت نہیں دی گئی تھی یا انھوں نے قبل از وقت یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ یہ کانفرنس محض تضیع اوقات ہوگی ـــ سیاستدانوں میں مولانا محمد سعید مسعودی اپنی عدم موجودگی کی بنا پر بہت نمایاں تھے ان کا شمار بیک وقت معلّموں، دانش وروں اور سیاست دانوں میں ہوتا ہے اور ان کی شمولیت سے یقیناً اس کانفرنس کے وقار میں اضافہ ہوتا۔ دریافت کرنے پر یہ معلوم ہوا کہ انھیں دعوت دی گئی تھی۔ لیکن وہ نہ آئے، افسوس کہ مولینا اپنی زندگی کے آخری دور میں بھی اپنی 'ضد' چھوڑنے پر آمادہ نظر نہیں آتے، کانفرنس کے آخری روز، جموں کے بلبراج مدھوک یعنی شیخ عبد الرحمٰن بھی نظر آئے۔ یہ نقلی شیخ، اصلی شیخ یعنی شیخ محمد عبد اللہ کے خلاف ایک نقلی مورچہ منظم کرنے کے لئے سری نگر تشریف لائے تھے، اور اسی بہانے تعلیمی کانفرنس کا نظارہ بھی دیکھا۔ کانفرنس کے آخری اجلاس میں وزیرِ اعلیٰ سید میر قاسم، شیخ محمد عبد اللہ صاحب اور گورنر جھا نے تقریریں کیں۔ ان تقریروں میں سب سے اچھی تقریر قاسم صاحب کی تھی۔ اس کے بعد گورنر صاحب کی اور پھر شیخ صاحب کی، شیخ صاحب کو کبھی کبھی مختصر تقریر کرنے کا بھی تجربہ کرنا چاہیئے وہ اپنی

ہر تقریر کا آغاز ۱۹۳۱ء سے کرتے ہیں۔ اور پھر ۱۹۵۳ء تک آکر کھو جاتے ہیں۔ آج کل طول طویل تقریریں سننے کی فرصت کسے ہے؟

اب آخر میں آپ کو ایک لطیفہ سنا کر، تعلیمی کانفرنس کا یہ قصہ ختم کرتا ہوں۔

جموں ماڈل اکیڈیمی کے ماڈل اُستاد مسٹر ارون گپتا نے طلبا میں بے چینی کے اسباب، کا ایک سائنسی جائزہ لیتے ہوئے ایک بہت طویل مقالہ تیار کیا تھا۔ مقالہ سُنتے سُنتے جب مسٹر گپتا کے علاوہ سب لوگ اُکتا گئے تو کانفرنس کے چیرمین مسٹر ایل، کے جھانے نوجوان گپتا کو یاد دلایا کہ وہ آدھ گھنٹے سے زیادہ کا وقت لے چکے ہیں، اور انھیں اب اپنا مقالہ ختم کرنا چاہیئے۔

"جناب! اس کانفرنس میں میرے والد بھی شریک ہیں۔ اور میں ان کے وقت میں سے بھی کچھ وقت لے رہا ہوں" بیٹے ارون نے اپنے باپ کی شفقت اور نااہلیت کا فائدہ اُٹھانے کی غرض سے کہا۔ اور کانفرنس میں شریک سارے مندوبین ارون کی اس معصومیت پر کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

"جناب! مجھ سے غلطی ہوئی، کہ میں اپنے چچا کو ہمراہ نہیں لایا کہ مجھے اس کے وقت میں سے بھی کچھ وقت ملتا۔ شمیم احمد شمیم نے برجستہ کہا اور ساری محفل قہقہوں سے گونجنے لگی۔

(۲۳ رجون ۱۹۷۴ء)

خربوزے ہی نہیں تربوز بھی

تازہ ترین اخباری اطلاع یہ ہے کہ حکومت جموں وکشمیر کو بھی ملک کی اقتصادی اور معاشی بدحالی کی خبر مل گئی ہے اور ریاستی حکومت کے لال بجھکڑوں نے ملک کو درپیش موجودہ مالی بحران کا مقابلہ کرنے کی غرض سے چند فوری اقدامات کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان اقدامات اور فیصلہ جات کا مقصد سرکاری اخراجات میں بھاری کمی اور سرکاری افسروں کی عیاشی پر کچھ پابندیاں عائد کرنا ہے۔ اس سلسلے میں اعلیٰ افسروں اور مختلف محکموں کے سربراہوں کو ایک خصوصی سرکلر کے ذریعہ کچھ خصوصی ہدایات دی گئی ہیں۔ اِن خصوصی ہدایات میں سب سے خاص ہدایت یہ ہے کہ افسر لوگ "آئندہ چھ ماہ کے دوران اپنے ماتحت دفاتر میں خالی اسامیوں کو کسی بھی صورت میں پُر نہ کریں" علاوہ اس کے "فی الحال کانفرنسیں منعقد کرنے اور سرکاری دعوتوں کا سلسلہ بھی فوری طور پر بند کر دیا جائے" مزید براں "سرکاری گاڑیوں کے استعمال میں بھی کمی کر دی جائے۔ تاکہ پٹرول پر صرف ہونے والی بھاری رقم میں بھی تخفیف ہو سکے"۔ ہم نے یعنی چراغ بیگ نے یہ سرکلر اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے، لیکن چونکہ یہ شہر کے مقبول عام روزناموں اور مرغوب خاص ہفت روزوں میں نمایاں طور پر شائع ہوا ہے۔ اس لئے ہم آنکھیں بند کر کے اس کے وجود پر ایمان لاتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہمیں ہر ایسی خبر پر اپنا فوری ردِ عمل ظاہر کرنے کا عارضہ لاحق ہو چکا ہے کہ جس کا مقصد عام لوگوں کی آنکھوں میں دُھول جھونک کر انھیں گمراہ کرنا ہوتا ہے اس لئے ہم ایک لمحہ ضائع

کئے بغیر اس خبر کو ریاستی حکومت کی بددیانتی، بے ایمانی اور بدمعاشی قرار دے کر عامۃ الناس کو خبردار کرتے ہیں کہ وہ سرکار کی اس اڑائی ہوئی افواہ سے ہرگز ہرگز متاثر نہ ہوں۔ باوثوق ذرائع کے حوالے سے اڑائی گئی اس افواہ کا مقصد بھولے بھالے عوام کو یہ یقین دلانا ہے کہ ریاستی حکومت کو واقعی ملک کو درپیش مالی بحران اور اقتصادی بدحالی کا احساس ہے، اور وہ عوام کے دکھ درد میں برابر کی شریک ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ شاہی محلات میں دادِ عیش دینے والے وزیروں، خزانۂ عامرہ پر پلنے والے سرکاری سانڈوں اور سرکاری دفتروں میں ہیرا پھیری کرنے والے سرکاری افسروں کو نہ ملک کی تازہ ترین صورت حال کا احساس ہے اور نہ بھوکے ننگے عوام کی بے کسی اور لاچاری کا۔ سرکاری اخراجات میں کمی کا یہ ڈھکوسلہ صرف اس لئے کھڑا کر دیا گیا ہے کہ روزگار ڈھونڈنے والے ان ہزاروں نوجوانوں کو فی الحال چھ مہینے کے لئے ٹال دیا جائے کہ جو چھ سال سے بھی زیادہ عرصے سے دَر دَر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ سرکاری دعوتوں اور کانفرنسوں کا سلسلہ بند ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ سرکار کی ساری کارکردگی کا انحصار اِنہی دعوتوں اور کانفرنسوں پر ہے۔ اور ہر سرکاری دعوت کے بعد چوں کہ کئی دنوں تک سرکاری افسروں کے گھروں پر دعوتوں کا سلسلہ جاری رہنے کا امکان پیدا ہوجاتا ہے۔ اس لئے سرکاری کانفرنسیں شاید بند ہوجائیں لیکن سرکاری دعوتیں بند نہیں ہوسکتیں۔ یہ بات تو میں دعوی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سرکاری گاڑیوں کا پرائیوٹ استعمال کبھی بند ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک تو اس لئے کہ حکومت کا سارا دبدبہ اور شان وشوکت سرکاری گاڑیوں کے دم قدم سے قائم ہے۔ اور اگر ایک دن کے لئے بھی سرکاری گاڑیوں کی پھُوں پھاں رُک جائے تو سرکار کا دبدبہ اور سرکاری افسروں کا "رعب داب" ختم ہوجائے دوئم یہ کہ جو لوگ سرکاری گاڑیوں کا پرائیوٹ استعمال روکنے کی طاقت اور صلاحیت رکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ ان کا استعمال اور استحصال کرتے ہیں، اس لئے وہ سب کچھ کرسکتے ہیں

اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہیں مار سکتے۔ سرکار اگر واقعی چاہے، تو انتظامیہ کی اہلیت اور کارکردگی متاثر کئے بغیر اپنے اخراجات میں کچھ نہیں تو تیس سے چالیس فیصد کمی کر سکتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایک بددیانت حکومت اس قسم کی حماقت کا ارتکاب کرے کیوں؟ اولاً ہر محکمے میں ضرورت سے زیادہ افسر اور ہر افسر کے ماتحت ضرورت سے زیادہ عملہ تعینات ہے۔ ثانیاً ہر افسر کو سرکاری ٹیلی فون، سرکاری فرنیچر اور جہاں جہاں ممکن ہو سکے، سرکاری گاڑی کی سہولیات میسّر ہیں۔ اور چونکہ ریاستی حکومت کے بڑے بڑے راجوں مہاراجوں نے "شاہ خرچی" کی شاہانہ روایات قائم کر رکھی ہیں۔ اس لئے اعلیٰ اور ادنیٰ افسروں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ قناعت سادگی اور کارکردگی کو اپنا شعار بنائیں۔ احمقانہ بھی ہے اور مضحکہ خیز بھی۔ یہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے لیکن انتظامیہ میں خربوزے کو دیکھ کر خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ ہی نہیں، تربوزہ، ناشپاتی، کھیرا، آڑو، شفتالو سبھی رنگ، پکڑتے ہیں۔ جب چھوٹے افسر، بڑے افسروں کو، بڑے افسر وزیروں کو، چھوٹے وزیر، بڑے وزیروں کو اور بڑے وزیر سب سے بڑے وزیر کو سرکاری املاک اور سہولیات سے بھرپور استفادہ کرتے دیکھتے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں، کہ وہ اس کے مقابلے میں ایک دوسرے کو مات دینے میں ہر جائز و ناجائز ذریعہ بروئے کار نہ لائیں اگر ریاستی حکومت صرف سرکاری ٹیلی فونوں اور سرکاری گاڑیوں کے ناجائز استعمال ہی پر روک لگا سکے، تو چراغ بیگ کو یقین ہے کہ ہر سال ریاست کو بارہ سے پندرہ لاکھ روپے کی بچت ہوگی۔ لیکن حکومت پرواہ کرے تو کیوں؟ مرکز سے بہر حال پیسہ آئے گا۔ اس لئے کنجوسی اور مکھی چوسی کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اور ویسے بھی کشمیر کی حکومت، دوسری ریاستی حکومتوں کے مقابلے میں زیادہ فیاض اور مہمان نواز واقع ہوئی ہے۔ یہاں باہر سے آئے ہوئے ایک ایک اخبار نویس کی مہمان داری پر بارہ بارہ، پندرہ پندرہ ہزار روپے خرچ کرنے کی روایت ہے۔ جن لوگوں کو کوئی باہر منہ لگانے کے لئے بھی تیار نہ ہو

وہ یہاں مہینوں کے لئے سرکاری مہمان بن جاتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں بمبئی کے ایک ترقی پسند ادیب امیر خسرو کی کھال بیچنے کے لئے کشمیر تشریف لائے تو انھیں سرینگر سے پندرہ سو میل دور پرنگ کے مقام پر سرکاری مہمان بنا کر رکھا گیا۔ مہمان موصوف کے سرینگر آنے جانے پر تین چار ہزار روپے سے کم پٹرول کیا خرچ ہوا ہوگا۔ ایک اور ترقی پسند شاعر بھی کچھ "مال" بیچنے آئے تھے۔ انھیں بھی سرکاری مہمان ہونے کا شرف بخشا گیا۔ اِسی طرح کی فضولیات پر تو آئے دن ہزاروں روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے۔ لیکن بے روزگار، بے وسیلہ نوجوانوں کی ملازمت دینے کے لئے حکومت کے پاس پیسہ نہیں۔ مختصر یہ کہ جہاں وزیروں یا ان کے قرابت داروں، سرکاری افسروں یا ان کے رشتے داروں کا سوال ہے۔ ریاستی حکومت کے پاس وسائل کی کوئی کمی نہیں۔ لیکن جونہی اس ریاست کے بے روزگار اور بے کار نوجوانوں کا مسئلہ درپیش آئے۔ حکومت کو مالی اور اقتصادی بحران کا خیال آجاتا ہے۔ لیکن ہم یعنی چراغ بیگ اربابِ حکومت کو خبردار کرتے ہیں کہ بھوکے ننگے عوام کو اب زیادہ دیر تک ان کھلونوں سے بہلایا نہیں جا سکتا۔

(۳۰ جون ۱۹۷۴ء)

"آئینہ" کے دس سال

آج کے دن "آئینہ" اپنی اشاعت کے دس سال مکمل کر کے گیارہویں برس میں قدم رکھ رہا ہے۔ ایک چھوٹے سے اخبار کے لئے دس سال تک زندہ رہنا اتنی بڑی بات ہے، کہ ہم نے اس موقع پر ایک جشن منانے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن کچھ دشواریوں کی وجہ سے یہ پروگرام اب اگلے سال کے ملتوی کر دیا ہے۔ ارادہ تھا کہ دس سالہ سالگرہ کے موقع پر "آئینہ" کا ایک ضخیم نمبر شائع کیا جائے گا، جو گزشتہ دس برسوں کے دوران "آئینہ" میں شائع ہونے والی نگارشات کا انتخاب ہو، مضامین کے انتخاب اور ترتیب کا مرحلہ طے ہو گیا تو معلوم ہوا کہ خاص نمبر کی ضخامت پانچ سو صفحات سے بھی بڑھ رہی ہے اور اس کے لئے دو سو رم سے بھی زیادہ کاغذ درکار ہوگا۔ اخباری کاغذ کی نایابی اور ہوش ربا گرانی کے اس دور میں بیک وقت اتنا کاغذ بہم کرنا، ہماری طاقت سے باہر تھا اس لئے مجبور ہو کر ہم نے یہ منصوبہ اگلے سال تک ملتوی کر دیا۔ کتابت کا کام شروع ہو گیا ہے اور ساتھ ہی نیوز پرنٹ جمع کرنے کا بھی، اور توقع ہے کہ تین چار ماہ کے اندر اندر یہ ضخیم نمبر کتابت اور طباعت کے مراحل طے کر کے قارئین "آئینہ" کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔

"آئینہ" کی اشاعت کے دس سال پورے ہو جانے کے ساتھ ہی ایک عہد کا خاتمہ اور دوسرے عہد کا آغاز ہوتا ہے، یکم جولائی ۱۹۶۴ء کو جب اس اخبار کا پہلا شمارہ شائع ہوا، تو اس وقت بخشی غلام کا دس سالہ دورِ ختم

ہو چکا تھا، اور خواجہ غلام محمد صادق ایک نئی اُمید اور نئی صبح کا عنوان بنکر طلوع ہوئے تھے۔ آج جب "آئینہ" اپنی زندگی کے دس سال مکمل کر رہا ہے، کشمیر کی سیاسی تاریخ ایک نئے انقلاب کا خیر مقدم کرنے کے لئے سنگھار کر رہی ہے۔ مجھے اطمینان ہے کہ اس نئے انقلاب کے رونما ہونے میں اس اخبار نے بھی اپنا حقیر حصّہ ادا کیا ہے اور جب کشمیر کی سیاسی اور صحافتی تاریخ لکھی جائے گی تو مورخوں کو قدم قدم پر "آئینہ" سے استفادہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوگی۔ میرے لئے یہ بات بھی کچھ کم باعثِ مسرّت نہیں کہ "آئینہ" ایک چھوٹا اخبار ہونے کے باوجود، بڑے بڑے اخباروں سے زیادہ بارسوخ معتبر اور مقبول جریدہ ہے اور اس کی اہمیت اور مقبولیت میں بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ "آئینہ" کی بات کو بڑی توجہ اور سنجیدگی سے سُنا جاتا رہا ہے اور اپنی اشاعت کے دس برسوں میں اِس اخبار نے نوجوانوں اور دانشوروں کی ایک پوری نسل کو متاثر کر دیا ہے۔ مجھے اپنے قارئین اور اپنے قدردانوں سے کوئی شکایت نہیں۔ یہ الگ سوال ہے کہ انھیں مجھ سے بہت سی شکایات ہوں گی۔

(۷، جولائی ۱۹۷۴ء)

عبدالسلام ایتو (مرحوم)

کشمیر کی جنگِ آزادی کا ایک سپاہی گمنامی اور کسمپرسی کے عالم میں سفرِ آخرت پر روانہ ہوگیا ہے اور اس سانحے کا سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ اس غریب کو اپنے وطن کی خاک بھی نصیب نہ ہوسکی، عبدالسلام ایتو دیالہ گام ضلع اننت ناگ کا ایک معمولی کسان تھا، جسے روشنیٔ طبع نے "خراب" کر دیا تھا، اور جو ہر معاملے اور ہر مسئلے میں اپنی ایک رائے رکھتا تھا۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز کی صحبت نے اُسے اور "تباہ" کر دیا۔ اور وہ اپنے علم اور شعور کے بل بوتے پر بڑی بڑی چٹانوں سے ٹکرانے لگا۔ بزاز صاحب ہی کے زیر اثر وہ شیخ محمد عبداللہ اور مرزا محمد افضل بیگ کے مقابلے میں ڈٹ گیا اور دیالہ گام کسانوں کی ایک نئی تحریک کا منبع اور مرکز بن گیا۔ شیخ صاحب کی قیادت اور بیگ صاحب کی سیاست کے مقابلے میں اگرچہ عبدالسلام ایتو اور پریم ناتھ بزاز کی ساری ترکیبیں اور تحریکیں ناکام ہوگئیں۔ لیکن ایتو صاحب نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا، اور وہ آخری دم تک لڑتے رہے۔ ان کی اسی 'ضد' نے انھیں پاکستان پہنچا دیا۔ جہاں وہ مرتے دم تک اپنے وطن لوٹنے کی حسرت میں جلتے رہے۔ ایتو صاحب سے میری پہلی اور آخری ملاقات جنوری ۱۹۶۹ء میں راولپنڈی میں ہوئی۔ جہاں بہت سے کشمیری دوست مجھ سے تبادلہ خیال کرنے کے لئے جمع تھے۔ دورانِ گفتگو میں نے اپنے کشمیری دوستوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان نفرت

کی یہ موجودہ فضا ختم ہو جائے، اور وہ دو دوستوں کی طرح رہنا شروع کر دیں؟"
اس سوال کے جواب میں عبدالسلام اینتو نے جو بات کہی، وہ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ انھوں نے کہا۔ "آپ جانتے ہیں کہ پاکستان نفرت کی بنیادوں پر قایم ہوا ہے اور اگر دونوں ملکوں کے درمیان نفرت اور بدظنی کی موجودہ فضا ختم ہو جائے، تو پھر پاکستان کا ایک الگ ملک کی حیثیت سے زندہ رہنے کا جواز ہی کہاں باقی رہے گا۔"

اینتو صاحب کی اس بات پر ساری محفل میں سنّاٹا چھا گیا، اور سب لوگوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ خود اینتو صاحب کو بھی یہ احساس ہو گیا کہ انھوں نے کوئی خطرناک بات کہی ہے۔ لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ کہہ کر ان کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ محفل میں کسی نے ان سے اتفاق کرنے کی جرأت نہیں کی۔ لیکن کسی کو ان سے اختلاف کرنے کا حوصلہ بھی نہیں ہوا۔ اینتو صاحب نے جو بات کہی تھی، یہ بات کہنے کے لئے صرف باجرأت ہونا ہی نہیں، صاحبِ نظر ہونا بھی ضروری تھا۔

اینتو صاحب نے مجھے بتایا کہ وہ پاکستان میں ایک قیدی کی طرح اِس اُمید پر زندگی گزار رہے ہیں کہ شاید کبھی زنداں کا دروازہ کھُل جائے، اور اُنھیں اپنے وطن عزیز لوٹنے کی اجازت مِل جائے، انھیں پاکستان کے حکمرانوں سے تو شکایت تھی ہی لیکن ان کا اصل شکوہ میرزا محمد افضل بیگ سے تھا کہ جو بقول اِن کے، اِن کو پاکستان بھیجنے کے ذمہ دار تھے۔ اینتو صاحب کو پاکستان کی فضا ایک دِن کے لئے بھی راس نہیں آئی، اور وہ مستقل طور پر پاکستانی حکومت سے برسرِ پیکار رہے۔ مجھے یاد ہے کہ راولپنڈی سے میری روانگی سے قبل جب وہ مجھے الوداع کہنے کے لئے میرے پاس آئے تو انھوں نے مجھ سے صرف یہ درخواست کی تھی، کہ انھیں کسی طرح دیالہ گام لوٹنے کی اجازت دی جائے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور وہ بڑی مشکل سے انھیں

پینے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ آخر کار اُن کا پیمانہ چھلک اُٹھا، اور وہ زار زار رونے لگے۔ عبد السلام ایتو صحیح معنوں میں سیکولر اور انسان دوست تھے، پاکستان کے فرقہ وارانہ ماحول میں ان کا دم گھٹ رہا تھا۔ اور اب جبکہ وہ پاکستان کی زمین کے نیچے دفن ہیں اُن کی روح دیالہ گام لوٹنے کے لئے تڑپ رہی ہوگی۔ وہ سچّے محب وطن اور ایک آزاد خیال سیاسی کارکن تھے۔ اور انھیں کشمیر کی سرزمین سے والہانہ عشق تھا۔ وہ اسی عشق کے ہاتھوں جلاوطن ہوئے اور اِسی جُرم میں جلاوطنی میں بھی زیرِ عتاب رہے۔ اللہ تعالیٰ ایتو صاحب کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ ان کی موت نے بہت سے زخم ہرے کر دیئے ہیں۔

(۷، جولائی ۱۹۷۴ء)

چھیڑ خوباں سے چلی جائے.....

۱۹، ۲۰، ۲۱ جون کو سری نگر میں منعقدہ تعلیمی کانفرنس کے متعلق ایک دیدہ وَر نے یہ رائے ظاہر کی ہے، کہ اب ایک کانفرنس اِن لوگوں کی ہونا چاہیئے کہ جن لوگوں نے دراصل کانفرنس میں پڑھے گئے مقالات لکھے تھے۔ موصوف کا خیال ہے کہ کانفرنس میں پڑھے گئے اسّی فیصد مقالے اُجرت دے کر لکھوائے گئے تھے۔ اور جن لوگوں نے انھیں کانفرنس میں پڑھا اِن میں بہت سے لوگوں کو یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ لکھنے والے نے کیا لکھا ہے۔ اِس لئے مناسب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے GHOST WRITER کا نام بتائے، تاکہ اِن تمام رائٹرس کی کانفرنس منعقد کر کے اِن کے ساتھ تبادلہ خیال کیا جاسکے۔ چراغ بیگ کو یہ تجویز پسند آئی ہے اور وہ اسے براہِ راست گورنر موصوف کی خدمت میں بھیج رہے ہیں۔

(۷ جولائی ۱۹۷۴ء)

خواب اور حقیقت

"مریضِ کشمیر" کی تندرستی کے لئے یوں تو بہت سی دعائیں اور دوائیں تجویز ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن ان تمام ممکنہ اور مجوّزہ نسخوں میں 'آزاد اور خود مختار کشمیر' کا فریب سب سے زیادہ خوبصورت اور دل فریب ہے اِس کے استعمال سے اگرچہ مرض سے زیادہ مریض کو خطرہ ہے۔ لیکن درد کی شدّت اور بخار کی حدت میں کم ہی لوگوں کو اپنی سوچ اپنے حواس اور اپنے آپ پر قابو رہتا ہے۔ "آزاد کشمیر" کی دوا مانگنے والوں میں بھی زیادہ تر وہی لوگ ہیں کہ جو ۴۲ سال کی طویل بیماری' مرض کی پیچیدگی، معالجوں کی بے دردی اور چارہ سازوں کی چارہ سازی سے گھبرا کر آزاد کشمیر کا نسخہ آزمانا چاہتے ہیں، اس لئے مجھے نہ ان کی نیت پر شک ہے اور نہ خلوص پر، ان میں سے اکثر لوگ سچے، کھرے صاف گو اور دیانت دار ہیں۔ اور وہ صدق دلی سے اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کی موجودہ کش مکش کو باعزّت طور پر ختم کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ کشمیر کو ایک آزاد اور خود مختار ریاست (ملک) کا درجہ دیا جائے، تاکہ دونوں میں سے کسی کو فتح یا شکست کا احساس نہ ہو۔ اِن لوگوں کا خیال ہے کہ کشمیر کے مستقبل اور مقدّر کو سنوارنے کے لئے بھی اِس سے بہتر کوئی حل نہیں۔ بادی النظر میں آزاد کشمیر کا یہ سپنا اتنا سندر سہانا ہے، کہ کشمیر کے بہت سے عاشق اس خواب کے تصوّر میں اپنی زندگی قربان کر گئے ان کے لبوں پر وقت آخر بھی آزاد کشمیر کا نعرہ تھا، اور مجھے یقین ہے کہ مر کر بھی اُن کی روح آزاد کشمیر کے لئے بے قرار ہوگی،

ان ناکام اور نامراد عاشقوں میں غلام نبی گلکار مرحوم کا نام سرفہرست ہے کہ جو ’آزاد کشمیر‘ میں رہ کر آزاد کشمیر کی ہوس میں زہر کا جام پیتے رہے‘ اور جنھوں نے ”آزاد کشمیر“ کی جیلوں میں اپنی زندگی کے بہترین سال گزار کر آزاد اور خود مختار کشمیر کے خواب دیکھے۔ غلام نبی گلکار ہی کی طرح ’آزاد کشمیر میں بہت سے لوگ آزاد اور خود مختار کشمیر کو مسئلہ کشمیر کا واحد، پُرامن اور باعزت حل سمجھتے ہیں‘ اور وہ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں کسی ایک کے ساتھ وابستگی کو غلامی اور ذلّت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس بات کا مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ پاکستان اور آزاد کشمیر میں مقیم کشمیریوں کی اکثریت اسی خیال کی حامی ہے اور جن لوگوں کو محاذ رائے شماری کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لئے ”انگریز میرپوریوں“ سے ملنے کا اتفاق ہوا ہو وہ میرے اس دعوےٰ کی تصدیق کریں گے کہ پاکستان اور پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں مقیم کشمیری پاکستان کے ساتھ الحاق اور ادغام کے سخت خلاف ہیں اور وہ کشمیر کے لئے ایک آزاد اور خود مختار منصب حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ چراغ بیگ کو میرپور (آزاد کشمیر) کے رہنے والے لندن میں مقیم، اُن پانچ اصحاب سے ملنے کے لئے کئی مواقع ملے، کہ جو پچھلے ہفتے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی قیادت میں محاذ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کرنے کے لئے کشمیر تشریف لائے تھے۔ ان سے پہلی ہی ملاقات میں مجھے یہ اندازہ ہوگیا کہ تعلیمی قابلیت اور سیاسی سوجھ بوجھ کے اعتبار سے اگرچہ وہ ہمارے ہاں کے عام دیہاتیوں سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ لیکن انگلستان کی آزاد فضا میں پانچ دس سال کے قیام نے انھیں آزادی اور بے باکی سے بات کرنے کا سلیقہ اور حوصلہ بخشا ہے۔ یہ لوگ بھی کشمیر کو ہندوستان اور پاکستان دونوں کی غلامی سے آزاد کرنے کے لئے بے چین اور بے قرار نظر آئے اور انھوں نے بغیر لگی لپٹی اور نہایت پرجوش انداز میں آزاد اور خود مختار کشمیر کے متعلق اپنا نکتۂ نظر پیش کیا، میں ان کے خلوص، ان کے ذوق وشوق اور جذبۂ ایثار سے متاثر ہوا۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں ازراہ تکلف یا مروّت بھی

ان کے خیالات سے متفق نہیں ہو سکا۔ کشمیر میں بھی چوں کہ بہت سے نوجوان اور بزرگ آزاد اور خودمختار کشمیر کے رومانی اور طلسماتی تصوّر کے اسیر ہیں اس لئے میں نے سوچا کہ کیوں نہ آج کی محفل میں اس خوبصورت فریب کے متعلق باتیں کریں تاکہ "آئینہ" کے قارئین کو بھی اِس بحث میں شریک ہونے کا موقع مل سکے۔

سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کیجئے کہ ہم ۱۹۷۴ء میں بات کر رہے ہیں، اس لئے اس مسئلے پر وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں کہ ۱۹۴۷ء میں کیا کچھ ممکن تھا، اور اگر اس وقت کشمیر کی ریاست ہندوستان اور کشمیر میں شامل ہونے کے بجائے آزاد اور خودمختار رہتی، تو اس سے ریاست اور برصغیر کو کیا کیا فائدے حاصل ہوتے؟ یہ بحث لایعنی ہے۔ کیونکہ تاریخ کو ۱۹۴۷ء تک واپس لے جانا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آج ۱۹۷۴ء میں کشمیر کو پاکستان اور ہندوستان کے تسلّط سے آزاد کر کے آزاد اور خودمختار بنانے کے کیا امکانات ہیں؟ اگر کشمیر آزاد ہو گیا، تو یہ آزاد اور خودمختار کشمیر، موجودہ کشمیر سے کس درجہ مختلف ہوگا، اور اس سے کشمیری عوام کے مستقبل اور مقدر پر کیا اثر پڑے گا۔ ہندوستان اور پاکستان کے تسلّط سے "آزاد" کیا ہوا یہ کشمیر اپنی اقتصادیات کو بہتر اور اپنے دفاع کو مستحکم بنانے کے لئے کیا کرے گا؟ یہ اور اسی نوعیت کے بہت سے سوالات کا پیدا ہونا ناگزیر ہے اور اِس لئے آزاد کشمیر کے متوالوں کو ان سوالات پر غور کرنا ہی پڑے گا۔ سب سے پہلے یہ طے کر لیجئے کہ موجودہ حالت کو تبدیل کر کے ہندوستان اور پاکستان دونوں کو اِس بات پر کس طرح آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنے مفروضہ استحقاق اور مروّجہ قبضے سے دست بردار ہو کر کشمیر کو ایک آزاد اور خودمختار ریاست بنانے کا اعلان کر دیں۔ اِس کی صرف دو صورتیں ہیں۔ ایک وہ جو میر پوری انگریزوں کے ذہن میں ہے، یعنی یہ آزادی ہندوستان اور پاکستان سے زبردستی چھین لی جائے، اور کشمیری عوام باقاعدہ اور باضابطہ طور دونوں مملکتوں سے برسرِپیکار ہو کر اپنے خواب کی تعبیر پوری کر لیں۔ میرے اِس

سوال کے جواب میں کہ بیس بائیس لاکھ کشمیری کیوں کر ہندوستان اور پاکستان کے ساٹھ کروڑ لوگوں پر غالب آسکتے ہیں۔ میرپوری غازیوں نے اقبالؔ کا یہ پھڑکتا ہوا شعر پڑھا ے

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

میرپور کے غازی اور "آئینہ" کے قارئین مجھے اس بات کے لئے معاف کریں گے، کہ میں اتنا بہادر اور جواں مرد نہیں ہوں کہ اقبال کے اشعار پڑھ پڑھ کر ہندوستان اور پاکستان کی مشترکہ قوّت کو شکست دینے کا تصوّر کر لوں، اس لئے مجھے ہندوستان اور پاکستان دونوں کو شکست دے کر آزاد کرنے کا منصوبہ شیخ چلّی کا پلاؤ نظر آیا کہ جس کی خوشبو سے منہ میں پانی تو بھر آتا ہے لیکن جس سے پیٹ نہیں بھرتا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی اپنی شرافت، اپنے خلوص اور اپنی نیک نیتی کی بِنا پر خالص درویشانہ انداز میں اِس بات پر راضی ہو جائیں کہ کشمیر کو آزاد اور بے چارے غریب کشمیریوں کو خود مختار رہنے دیا جائے۔ مجھے ذاتی طور پر اس بات کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ ہندوستان اور پاکستان کے حکمراں راتوں رات اپنی فطرت، اپنی خصلت اور اپنی شرافت بدل کر اتنے مخلص، اتنے نیک اور اتنے درویش بن جائیں کہ وہ دوسرے دِن کشمیر کی سرزمین سے اپنی فوجوں کو کوچ کا حکم دے کر جنّت کشمیر کو اہلِ کشمیر کے سپرد کر دیں۔ اب ایک لمحے کے لئے مان لیجئے کہ یہ سب ممکن ہے، تو اِس کے بعد مسئلے کے دوسرے پہلوؤں پر غور کیجئے، اور وہ یہ کہ ریاست جموں و کشمیر تین اکائیوں پر مشتمل ہے۔ جموں، لداخ اور کشمیر، اِن تین اکائیوں میں سے لدّاخ اور جموں کے عوام نہ صرف یہ کہ آزاد اور خود مختار نہیں رہنا چاہتے بلکہ وہ ہندوستان کے ساتھ ادغام کی رفتار کو تیز تر کرنا چاہتے ہیں۔ کشمیر کو آزادی اور خود مختاری نصیب ہونے کے بعد لازمی طور پر یہ اکائیاں کشمیر سے الگ ہونا چاہیں گی، اور عملاً صرف کشمیر کی وادی ہی

'آزادی' کی اس نعمت سے لطف اندوز اور بہرہ ور ہونے کے لئے باقی رہ جائے گی۔
اب سوچئے کہ قاضی گنڈ سے کھادن یارنگ، اِس چائے کی پیالی برابر' وادی کی اقتصادی، معاشی اور سیاسی تنظیم کیا ہو گی؟ اِس سوال کے جواب میں بہت سے لوگ سوئٹزرلینڈ کا نام لے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ اس سے چھوٹے رقبے کی ریاستیں بھی آزاد اور خود مختار ہیں۔ مجھے اس بات سے انکار نہیں' کہ رقبے کے اعتبار سے کشمیر کی وادی واقعی بہت سے آزاد ممالک سے بڑی ہو گی۔ لیکن صرف رقبے کی بات نہیں، تاریخ اور اس سے زیادہ جغرافیے کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کشمیر کی سرحدیں ہندوستان اور پاکستان ہی نہیں، روس اور چین سے بھی تو ملتی ہیں اور اپنی قیامت خیز خوبصورتی کی بنا پر ان چاروں ملکوں کی نگاہیں کشمیر پر مرکوز ہیں اور رہیں گی۔ اس بات کی کیا ضمانت ہو گی کہ اِن میں سے کوئی بھی ایک ملک کسی دن کشمیر کی توبہ شکن خوبصورتی کی تاب نہ لا کر اسے ایک دن اپنی تحویل میں لینے کی کوشش نہیں کرے گا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ چاروں ملک کشمیریوں کے تئیں اتنے نیک نیت اور مخلص بن جائیں کہ وہ رات دن ہماری حفاظت کے لئے ہماری سرحدوں پر کمربستہ نظر آئیں۔ جو ممالک اِس فرض کو نبھانے پر آمادہ ہو بھی جائیں۔ وہ اس کے عوض میں ہم سے کچھ تقاضے کریں گے، کچھ توقعات رکھیں گے۔ اور ہمیں اپنی حفاظت کے لئے ان تقاضوں اور اِن توقعات کو پورا کرنا پڑے گا۔ اِن حالات میں پھر وہ آزادی کہاں رہے گی جو ہم نے ہندوستان اور پاکستان سے برسرِ پیکار ہو کر اِن سے حاصل کی ہو گی۔ دوسری بات اقتصادی ترقی کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمیں اپنی آزاد اور خود مختار ریاست کو اقتصادی طور پر خوش حال بنانے کے لئے دوسرے ممالک سے امداد حاصل کرنے کے لئے معاہدے کرنا ہوں گے، اور اکثر امداد دینے والے ممالک اپنے مفادات کا تحفظ کرنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ کشمیر کی بے پناہ خوبصورتی کے پیشِ نظر دُنیا بھر کے ممالک یہاں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے

کی کوشش کریں گے۔ ان کوششوں میں مختلف ممالک کے مفادات ٹکرانے کا اندیشہ ہی نہیں، قوی امکان ہے اور اس طرح جائے کی پیالی جتنی یہ خوبصورت وادی دُنیا کے بڑے بڑے ممالک کی سازشوں کی آماجگاہ بن جائے گی۔ اور پھر آزادی کی اِس نیلم پری کا کیا حشر ہوگا کہ جس کی خاطر ہم نے ہندوستان اور پاکستان دونوں سے ناطہ توڑ کر اپنی ایک الگ دُنیا بسائی تھی۔ بہت سے نوجوانوں کی یہ خوش فہمی ہے کہ عوامی جمہوریہ چین، ہمیں نہ صرف آزادی حاصل کرنے میں مدد دے گا بلکہ اِس کی حفاظت اور اِس کے استحکام کے لئے اپنی مسلح افواج کو وقف کردے گا، یہ خوش فہمی، عقل سے زیادہ خوش اعتقادی بلکہ خود غرضی کی پیداوار ہے اور خوض غرضی عام طور پر انسان کو اندھا کردیتی ہے۔ چینی عوام اور حکومت، دونوں ہی اتنے بیوقوف نہیں ہیں کہ وہ کسی کی خاطر اپنے خون کا ایک قطرہ بھی بہادیں۔ ویت نام اور پاکستان کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں چینیوں نے نہ ویت نام میں فوجی مداخلت کی اور نہ ۱۹۷۱ء میں پاکستان کو بچانے کے لئے ایک گولی چلائی۔ یہ لوگ دُنیا کے سب سے زیادہ بے رحم حقیقت پسند اور بے مروّت لوگ ہیں، اور ان سے کسی قسم کی عملی ہمدردی یا اعانت کی توقع رکھنا سب سے بڑی حماقت ہے، اور اگر خدانخواستہ یہ کشمیر کو ہندوستان اور پاکستان کے تسلط سے آزاد کرانے کے لئے عملی اعانت پر بھی آمادہ ہو جائیں تو سمجھ لیجیئے کہ کشمیر نہ صرف عالمی جنگ کی آماجگاہ بن جائے گا، بلکہ ابدی غلامی کی زنجیروں میں بھی جکڑ جائے گا۔ چین کی مدد سے کشمیر کو آزاد کرانے کا خواب دیکھنے والوں کو اپنے خواب کی تعبیر کے لئے تبت کی تاریخ اور انجام کو زیر نظر رکھنا چاہیے۔ مختصر یہ کہ آزاد کشمیر کا خواب جتنا سندر اور سہانا ہے۔ اِس کی تعبیر اتنی ہی ڈراونی اور عبرت انگیز ہے اور خوابوں کا تعاقب کرنے والوں کو کبھی کبھی حقائق کی دھوپ میں بھی چند لمحے گزارنا چاہیئیں۔

(۱۵ جولائی ۱۹۷۴ء)

نشہ ٹوٹ گیا!

امریکہ اور انگلستان کے حالیہ دورے میں چراغ بیگ کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ہے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات کی بے تحاشا آزادی، بے چارا ریڈیو تو اب وہاں آثارِ قدیمہ ہو کر رہ گیا ہے اور بہت کم لوگ اِس سے اپنا دِل بہلاتے ہیں۔ لیکن ٹیلی ویژن کی بے پناہ مقبولیت نے اسے امریکہ اور انگلستان دونوں ممالک میں سب سے طاقتور ادارہ بنا دیا ہے۔ ٹیلی ویژن کی غیر معمولی جاذبیت اور اس کے جادوئی اثرات کے پیشِ نظر یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا، کہ اخبارات کا اثر ورسوخ رفتہ رفتہ کم ہوتا جائے گا۔ اور بالآخر اخبار بھی ریڈیو کی طرح آثارِ قدیمہ کی چیز بن کر رہ جائیں گے لیکن یہ اندیشہ صحیح ثابت نہیں ہوا ہے اور خاص طور پر امریکی اخبارات نے اسے غلط ثابت کرنے میں ایک اہم رول انجام دیا ہے۔ ان اخبارات نے آزادیٔ ضمیر حریت فکر اور بے خوف اور بے لوث واقعہ نگاری کی ایسی شاندار مثالیں قایم کی ہیں کہ ٹیلی ویژن کا جادو بھی ان کے جادو کو توڑنے میں کامیاب ثابت نہیں ہوا ہے۔ نتیجہ یہ کہ امریکہ میں آج "نیویارک ٹائمز" اور "واشنگٹن پوسٹ" اتنے طاقتور اخبارات ہیں کہ یہ دونوں مل کر کسی بھی امریکی حکومت کا تختہ اُلٹ سکتے ہیں۔ صدر نکسن کو رُسوا کر کے صدارت سے سبکدوش ہونے پر مجبور کرنے کا سہرا اگر کسی کے سَر رکھا جا سکتا ہے تو وہ ہے واشنگٹن سے شائع ہونے والا روزانہ اخبار "واشنگٹن پوسٹ"، جس نے واٹر گیٹ سکینڈل کو بے نقاب کر کے امریکی سیاست میں ایک انقلاب بپا کر دیا۔

امریکی اخبارات کے لئے کوئی شخص، کوئی ادارہ کوئی جماعت اور کوئی فلسفہ مقدس گائے کی حیثیت نہیں رکھتا، وہ ہر شخص چاہے اس کا سیاسی منصب کتنا ہی اونچا کیوں نہ ہو، کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ اور اگر انھیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ یہ شخص امریکی سوسائٹی کے مسلّمہ معیاروں پر پورا نہیں اُترتا۔ تو وہ اس کے منصب، اس کی عظمت اور اس کے تقدس کی پروا کئے بغیر اسے بے نقاب کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے۔ انھیں ملکی مفاد، قومی وقار، سیاسی مصلحت دفاعی ضرورت، غرض حکومتوں کا تراشا ہوا کوئی بھی بہانہ ٹھوس حقائق پیش کرنے سے روک نہیں سکتا اسی لئے امریکی حکومت کی سیاہ کاریوں کو طشت از بام کرکے وہاں کے حکمرانوں کو ساری دُنیا کی نگاہوں میں ذلیل کرنے کا فرض انجام دینے میں امریکی اخبارات پیش پیش رہتے ہیں۔ اور امریکہ کی حکومت اِن کے سامنے اتنی بے بس اور مجبور ہے کہ وہ اپنا وقار خاک میں ملتے دیکھ کر بھی، اِن اخبارات کے خلاف اُنگلی نہیں اُٹھا سکتی۔ یہ پریس کی آزادی کی انتہا ہے اور میں مدیر "آئینہ" کے ہمراہ اس ماحول میں دو ماہ تک رہنے کے بعد جب ۱۶ اکتوبر کو ہندوستان پہونچا، تو میں نے دلّی کے اخبارات میں سب سے پہلے یہ خبر پڑھی، کہ نئی دہلی سے شائع ہونے والے انگریزی روزنامے "ہندوستان ٹائمز"، کے ایڈیٹر مسٹر واگیس کو اخبار کی ادارت سے اس لئے سبکدوش کیا جا رہا ہے کہ انھوں نے اپنی بے باکانہ تحریروں اور اپنی بے خوف روش سے ملکۂ ہندوستان شریمتی اندرا گاندھی کو ناراض کر دیا ہے۔ میں ہندوستانی پریس کے متعلق کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں۔ اور میں کئی بار اپنی اس رائے کا اظہار کر چکا ہوں کہ یہ نام نہاد آزاد پریس بنیادی طور پر ESTABLISHMENT کا ترجمان ہے اور اس کی آزادی محض ایک فریب ہے۔ اکثر بڑے بڑے اخبارات چونکہ بڑے بڑے "بزنس ہاؤسز"، کی ملکیت ہیں۔ اس لئے وہ حکومتِ وقت کو ناراض کرنے کی جرأت یا حماقت کر ہی نہیں سکتے۔ اور جو اخبارات سرمایہ داروں کے تسلّط سے آزاد ہیں۔ وہ کسی بندھے ٹکے نظریئے یا کسی سیاسی جماعت کے ترجمان ہوتے ہیں

اس لئے وہ صرف ان حقائق کو منظر عام پر لاتے ہیں کہ جن سے ان کے نظریات یا سیاسی مقاصد کو تقویت پہونچے، اِس لئے ہندوستان کا پریس اِن معنوں میں آزاد نہیں ہے کہ جن معنوں میں آزاد پریس کی اصطلاح امریکہ یا انگلستان میں ہوتی ہے اس پر بالواسطہ یا بعض اوقات بلاواسطہ حکومت کا کنٹرول ہے اور جو اخبارات حکومت کے اثر ورسوخ سے آزاد بھی ہیں، اُنھوں نے اپنے پاؤں میں قومی مُفاد، وفاداری، سیاسی مصلحت اور ملکی دفاع کی بڑی بڑی زنجیریں ڈال کر اپنی آزادی پر خود ہی کچھ پہرے بٹھادئے ہیں اور وہ حب الوطنی کے نام پر اپنے ملک کی ہر بات کو جائز قرار دینے کے لئے جواز تراشتے رہتے ہیں۔ صحافت کے اس اندھیرے میں 'ہندوستان ٹائمز' کے ایڈیٹر مسٹر بی جی درگیس نے اپنے بیباک قلم سے ایک ایسی شمع روشن کی ہے کہ اس کو دیکھ کر اِس ملک کی بے آبرو صحافت پر ایک لمحے کے لئے اعتماد بحال ہو جاتا ہے۔ مسٹر ورگیس نے ہمیشہ بُلند مقاصد اعلیٰ قدروں اور انصاف کا ساتھ دیا ہے۔ اور جب سے وہ ہندوستان ٹائمز کے مدیر مقرر ہوئے ہیں انھوں نے اس اخبار کو حق وانصاف، آزادی تحریر اور حریّتِ فکر کا ترجمان بنا دیا ہے۔ کشمیر کے سوال پر ان کے انصاف پسند قلم نے ایسے ایسے بے باک اور بے لاگ اداریے لکھے ہیں کہ یقین نہیں آسکتا کہ ایک ہندوستانی مدیر اس درجہ باجرأت اور باحوصلہ ہوسکتا ہے۔ مجھے ۱۹۷۱ء میں شیخ صاحب کی جلاوطنی کے موقع پر ان کے ایک داریے کا یہ فقرہ یاد آرہا ہے کہ "مسز گاندھی نے کشمیر کا انتخاب تو جیت لیا ہے لیکن وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی ہیں" اور یہ وہ وقت تھا کہ جب دوسرے اخبارات "ملکی مفاد" کے فرضی نام پر شیخ صاحب کی جلاوطنی کو جائز بروقت اور برمحل قرار دے رہے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے جب بھی کشمیر کے سوال پر قلم اٹھایا۔ وہ ہندوستان کا ضمیر بن گئے اور انھوں نے ہندوستان کی حکومت کی ناانصافیوں اور زیادتیوں کے خلاف احتجاج کیا، اِس طرح 'ہندوستان ٹائمز'، غالبًا اس ملک کا پہلا اخبار ہے کہ جس نے کشمیر میں انصاف اور جمہوریت کی قدریں بحال کرنے کے لئے مسلسل جدوجہد

کی ہے۔ اور مسٹر ورگیس کی انسانیت اور ان کے انصاف کا جذبہ صرف اہل کشمیر تک ہی محدود نہیں تھا۔ وہ ہر مظلوم اور ہر مجبور کے حق میں آواز بلند کرتے رہے ہیں۔ اور انھوں نے اپنی ادارت کے دوران، حکومت وقت کی ہر دکھتی رگ کو چھیڑا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ملکۂ ہندوستان نے ان سے ناراض ہو کر ہندوستان ٹائمز کے سرمایہ دار مالک مسٹر کے، کے، برلا کو حکم دیا ہے کہ مسٹر ورگیس کا دانہ پانی بند کر کے انھیں ہندوستان ٹائمز کی مملکت سے بے دخل کر دیا جائے۔ مسٹر ورگیس کی تازہ ترین گناہوں میں سکم کو ہندوستان میں ضم کئے جانے کے خلاف ان کا وہ اداریہ بھی شامل ہے کہ جس نے ایک بار پھر مسٹر ورگیس کی بے باکی اور انصاف پسندی کا ڈنکا بجا دیا ہے۔ اور جس سے حکمرانوں کے مجرم ضمیر میں وہ خلش پیدا ہو گئی ہے کہ ان کی راتوں کی نیندیں حرام ہو گئی ہیں۔ مسٹر ورگیس کا ایک گناہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اس سال فروری میں اتر پردیش کے انتخابات سے چند دن قبل مسز گاندھی کے ان درسنگ ہائے بنیاد کی تفصیل شائع کی۔ کہ جو یو، پی کے مختلف شہروں میں اس غرض سے سجائے گئے کہ وہاں کے رائے دہندگان کو کانگریس کے شیشے میں اتارا جائے۔ ان کا دوسرا جرم یہ ہے کہ انھوں نے بہار کی حالیہ ایجی ٹیشن میں، ریاستی حکومت اور مرکزی حکومت کی بجائے جے پرکاش نرائن اور بہاری عوام کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ اور پھر آخر میں سکم کا گناہ۔ یہ سارے "جرائم" اتنے سنگین اور خطرناک ہیں کہ مسٹر ورگیس کو پھانسی کی سزا دی جا سکتی تھی اور یہ محض مسز اندرا گاندھی کی "رحم دلی" ہے کہ وہ صرف انھیں ہندوستان ٹائمز کی ادارت سے سبکدوش کرا رہی ہیں۔ مسٹر ورگیس کے اخراج کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ موجودہ سرکار بڑے بڑے اخبارات کی موجودہ ملکیت کے ڈھانچے کو جمہوریت کے لئے ایک مستقل خطرہ سمجھتی ہے۔ کیوں کہ اخبارات کے مالک اخبار نویسوں کی آزادی اور ان کی رائے کو متاثر کرتے ہیں۔ اسی لئے حکومت اخبارات کو مالکوں کی اجارہ داری سے آزاد کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ اب اس پس منظر میں مسز گاندھی اور مسٹر گجرال کی یہ ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے

کہ وہ مسٹر ورگس کو ہندوستان ٹائمز سے باہر نکالنے کے لئے سرمایہ دار برلا کو استعمال کررہے ہیں۔ اس ایک مثال سے ظاہر ہوگا کہ مسز گاندھی کی حکومت کے قول اور فعل میں کتنا بڑا تضاد ہے۔ سوشلزم اور جمہوریت کے دعوے کتنے کھوکھلے اور اخبارات کی آزادی کا نعرہ کتنی بڑی ریاکاری ہے۔ ہم لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہندوستان دُنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے اور جمہوریت کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ آزاد پریس۔ لیکن مسٹر ورگیس کے خلاف حکومت کی منتقمانہ کارروائی نے ثابت کر دیا ہے کہ اس ملک کی جمہوریت، اِس کا سوشلزم اس کی آزادی اور یہاں کا انصاف سب ڈھونگ ہے۔ یہاں قانون کے تقاضے، انصاف کی قدریں، آزادی کے معانی، حکمرانوں کی مرضی اور مفادات کے تابع ہیں۔ اور ہمیں صحیح قسم کی آزادی حاصل کرنے کے لئے ابھی بڑی جدوجہد کرنا ہوگی۔ یہ بات کسی حد تک باعثِ اطمینان ہے کہ ملک کے بہت سے صحافیوں نے مسٹر ورگیس کے اخراج کے خلاف متحد ہوکر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔ اور اس بات کا امکان ہے کہ مسٹر ورگیس کا ایثار، ملک میں آزادیٔ تحریر و تقریر کے لئے ایک بامقصد جدوجہد کا نقطۂ آغاز ثابت ہو۔ مجھے ذاتی طور پر صرف اس بات کا افسوس ہے کہ غیر ممالک میں آزادیٔ فکر کے نشے سے چور، جب میں نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو اس واقعے نے میرا نشہ توڑ دیا۔

(۲۳ اکتوبر ۱۹۷۴ء)

خبروں کا قحط

یہ خبراب خاصی پرانی ہوگئی ہے، کہ ضروریاتِ زندگی کی قیمتوں میں ناقابلِ برداشت اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اور یہ خبر بھی ہزار بار دہرانے سے باسی ہوگئی ہے کہ شہر میں اس چیز کا قحط ہے کہ جس کی شہریوں کو ضرورت ہے۔ اجناس خوردنی سے لے کر اخباری کاغذ تک ہر چیز نایاب ہے اور نتیجہ یہ کہ اب قحط کی خبریں چھاپنے کے لئے اخباری کاغذ بھی دستیاب نہیں۔ یہ صورتِ حال بجائے خود کچھ کم پریشان کُن نہ تھی کہ اب ایک اور قحط کے آثار نمودار ہونے لگے ہیں، اور وہ ہے خبروں کا قحط۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری دُنیا نے یہ سازش کر رکھی ہے کہ اخبار والوں کی ناکہ بندی کر کے انھیں خبروں سے محروم کر دو، کہیں کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے کہ اخبار نویسوں کے لئے خبر بن جائے۔ اِس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے امریکی اخبار نویسوں نے واٹر گیٹ سیکنڈل کا کھوج لگا کر امریکی صدر نکسن کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔ اور اسی کش مکش سے دوچار ہو کر برطانوی پریس نے مشہور اداکار رچرڈ برٹن اور یوگوسلاویہ کی شہزادی الزبتھ کی شادی کرادی۔ ہندوستان کے غریب اخبارات، ظاہر ہے کہ امریکی اور برطانوی اخبارات کی طرح اِس قسم کے ہنگامی اور رومانی حالت پیدا نہیں کر سکتے۔ اِس لئے ہندوستانی عوام ہی طرح وہ بھی سوکھ کر کانٹا ہو رہے ہیں۔ ایک اخباری کاغذ کی نایابی، دوئم خبروں کا قحط، نتیجہ یہ کہ ملک کے بڑے بڑے گرانڈیل اخبارات سکڑ سکڑ کر اب حکیم صاحب کے نسخے معلوم ہوتے ہیں اور اِن میں بھی ملازمت کے اشتہارات کے علاوہ کوئی چیز پڑھنے کی نہیں ہوتی! کاغذ

اور خبروں کے اس مشترکہ قحط نے حسبِ معمول اِس دُور افتادہ اور پسماندہ وادی کو بُری طرح متاثر کر دیا ہے کہ جہاں عام حالات میں بھی تازہ دودھ اور تازہ ڈبل روٹی کی طرح تازہ خبریں نایاب رہتی ہیں۔ شہر سرینگر سے شائع ہونے والے درجن بھر روزناموں کے لئے اخباری کاغذ کے قحط سے بھی زیادہ خبروں کا کال پڑ رہا ہے اور بیچارے اخبار نویس بے حد حیران و پریشان ہیں کہ اس صورتِ حال کا مقابلہ کِس طرح مقابلہ کیا جائے ہفتہ بھر کے بعد جب سرکاری دفاتر جموں منتقل ہو جائیں گے تو یہ صورتِ حال اور بھی نازک ہو جائے گی۔ اور مدیران کرام کو زیادہ تر "ٹیبل نیوز" ہی کا سہارا لینا پڑے گا۔ آپ پوچھیں گے کہ یہ "ٹیبل نیوز" کیا ہے ؟ اور یہ کہاں سے آتی ہے۔ تو سُن لیجئے کہ یہ ایک صحافتی اصطلاح ہے اور اس کے معنی اِس خبر کے ہیں کہ جس کا نہ کہیں وجود ہوتا ہے اور جو نہ کہیں سے آتی ہے۔ یہ براہِ راست ایڈیٹر صاحب کی میز پر تراشی جاتی ہے، اور اخبار بینوں کی ضیافت طبع کے لئے پیش کی جاتی ہے، عام طور پر یہ خبر کسی فرضی نمائندۂ خصوصی کے حوالے سے شائع کی جاتی ہے اور خاص حالات میں یہ خبر خود مدیر محترم سے منسوب کی جاتی ہے۔ 'ٹیبل نیوز' کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا کوئی محل وقوع یا جغرافیہ ہونا ضروری نہیں۔ مثلاً اگر آپ کسی مقامی روزنامے میں یہ خبر پڑھ لیں۔ کہ " ریذیڈنسی روڈ پر زبردست ہنگامہ ہو گیا اور فریقین نے ایک دوسرے پر چاقو چلانے کے علاوہ ہوائی فائر بھی کئے"۔ تو یہ جاننے کی مت کوشش کیجئے کہ ڈیڑھ میل لمبی ریذیڈنسی روڈ کے کِس نقطے پر یہ جنگ لڑی گئی، اور اِس میں کِس کِس نے شرکت کی۔ یہ لڑی کیوں لڑی گئی۔ اور بالآخر اس کا انجام کیا ہوا ؟ کیوں کہ یہ لڑائی ریذیڈنسی روڈ پر نہیں ایڈیٹر صاحب کی میز پر لڑی گئی، اور اس میں ان ہی کے قلم نے چاقو بھی چلائے اور ہوائی فائر بھی کئے جس طرح ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے اسی طرح یہ خبر بھی ضرورت کی پیداوار ہے۔ خبروں کے اِس قحط میں اخبار کا پیٹ تو بھرنا ہی پڑتا ہے۔ ورنہ آدھے سے زیادہ اخبار خالی رہے گا۔ اس لئے جب آخری کاپی تیار کرنے کے آخری لمحے تک کوئی تازہ چٹپٹی اور مزیدار خبر موصول نہیں ہوتی۔

تو ظاہر ہے کہ ایڈیٹر صاحب کو اخبار کا خالی پیٹ بھرنے کے لئے اپنے ذہن سے کچھ نہ کچھ اگلنا ہی پڑتا ہے۔ یہ خبر ٹیبل نیوز کہلاتی ہے۔ یہ الگ سوال ہے کہ دوسرے دن صبح اخبار بینوں کو یہ خبر سب سے اہم مصدقہ اور معتبر دکھائی دیتی ہے، خبروں کے اس غیر معمولی قحط کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر اخبار نویس نے اپنا اپنا اسٹائل ایجاد کیا ہے۔ کچھ لوگ سال بھر پرانی خبروں کو نئی سرخیوں کے ساتھ چھاپتے ہیں۔ کچھ مقامی خبریں نہ ملنے کی وجہ سے بین الاقوامی اہمیت کی خبریں فراہم کرتے ہیں۔ بعض لوگ افواہوں کو خبریں بنا کر شائع کرتے ہیں اور بعض افواہیں اڑا کر خبریں بناتے ہیں۔ خبروں کے اس قحط کا بے چارے چھوٹے بڑے غریب سرکاری ملازموں پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے، کیوں کہ جب بے چارے اخبار نویسوں کو اخبار کا پیٹ بھرنے کے لئے کچھ نہیں ملتا، تو وہ چھوٹے موٹے سرکاری افسروں کی طرف متوجہ ہو کر ان کی سوانح حیات شائع کرنے لگتے ہیں۔ مولویوں کی طرح اخبار نویسوں میں بھی اچھے اور بُرے لوگ دونوں شامل ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر صحافی اپنی اوقات اور اپنی سطح کے مطابق، اپنی طاقت اور مراعات کا استعمال کرتا ہے۔ کوئی رشوت ستانی اور بد عنوانی کے بڑے بڑے مگرمچھوں کی گردن دباتا ہے تو کوئی پٹواریوں اور جمعداروں کو بلیک میل کرتا ہے۔ کوئی وزیروں کے خلاف قلم اُٹھاتا ہے۔ تو کوئی ہسپتال میں کام کرنے والی بے چاری نرسوں کو ہراساں کرتا ہے۔ غرض ہر صحافی اپنے موضوع کے انتخاب اور اپنے ذہنی رویے سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ اور چراغ بیگ کو اس حقیقت کے اظہار سے دکھ ہو رہا ہے کہ صحافت کی مقدس وادی میں بہت سے ایسے درانداز (گھس بیٹھئے) گھس آئے ہیں کہ جن کا واحد مقصد تجارت ہے اور جو بیباک صحافت اور بلیک میلنگ میں فرق کرنا نہیں جانتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ صحافت کا وقار اور اس کا اعتبار ختم ہو رہا ہے اور اب لوگ اخباروں میں شائع ہونے والی اکثر خبروں پر بھروسہ نہیں کرتے۔ مجھے کشمیر کے ایک سابق وزیر اعلیٰ مرحوم غلام محمد صادق کی ایک بات یاد آ رہی ہے۔ وہ سرینگر سے شائع ہونے والے ایک بہت ہی بازاری قسم کے چیتھڑے کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتے تھے۔ میں نے ایک بار دریافت کیا کہ اس اخبار میں ایسی کیا بات ہے کہ

آپ سب سے پہلے یہی اخبار پڑھتے ہیں۔ صادق صاحب نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا
کہ میں اس اخبار کے ذریعے سرکاری افسروں کی قابلیت اور دیانت کا اندازہ کرتا ہوں۔
جس سرکاری افسر کے خلاف یہ اخبار لکھتا ہے۔ اس کی قابلیت اور دیانت پر مجھے کبھی کوئی
شک نہیں رہتا۔" جس طور پر سرینگر سے شائع ہونے والے بعض اخبارات صرف
سرکاری افسروں کو ڈرا دھمکا کر اپنا اُلّو سیدھا کرنے کی فکر میں لگے ہوتے ہیں۔ اِس
کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ حکام اور عوام دونوں کی نظروں میں اِن اخباروں کا ہی نہیں
صحافت کا اعتبار ہی ختم ہو جائے گا۔ اور یہ ایک بہت بڑا تہذیبی المیہ ہوگا۔ ایک
اخبار نویس کی حیثیت سے مجھے اپنا یہ حق عزیز ہے کہ ہم اِس ملک کی عظیم سے عظیم
شخصیت اور طاقت کو بے نقاب کر کے، دُنیا کے سامنے اِس کا اصلی روپ پیش کریں۔
لیکن اِس حق کے ساتھ ہم پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ ہم اِس کے استعمال میں
وہی احتیاط برتیں کہ جو ایک ماہر سرجن اپنے آلات کے ساتھ برتتا ہے جس طرح ایک
مچھلی سارے تالاب کو گندا کر سکتی ہے۔ اِسی طرح صرف ایک صحافی ہم سب کی
بے عزّتی اور بے اعتباری کا باعث بن سکتا ہے!

(۳۰ر اکتوبر ۱۹۷۴ء)

گواہ استغاثہ کا بیان

چراغ بیگ کو اپنے مغربی دورے سے واپس ہوئے پندرہ دن ہو گئے۔ لیکن ابھی تک اس کا ذہن امریکہ اور انگلستان کے اثرات اور تاثرات سے بھرا پڑا ہے۔ اور وہ ہر قدم پر اپنے ارد گرد کی دُنیا کا مقابلہ نیویارک اور لندن سے کرتا رہتا ہے۔ مثلاً اسے یہ دیکھ کر تعجب ہی نہیں غصّہ بھی آتا ہے کہ شہر سرینگر میں موٹریں، بسیں، ٹرک، تانگے، جہاں جی چاہے، کھڑے ہو کر سارے ٹریفک کا سلسلہ درہم برہم کر سکتے ہیں۔ اور پولیس والے اوّلاً کہیں نظر نہیں آتے، اور اگر اتفاقاً کہیں "موقع واردات" پر موجود بھی ہوں، تو ان کے طرزِ عمل اور ردِّ عمل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بیچ سڑک میں گاڑی روک کر کھڑا کر دینا کوئی جُرم نہیں۔ لندن اور نیویارک میں پارکنگ کے لئے مقررہ جگہ کے علاوہ گاڑی کھڑا کر دینا زبردست جُرم ہے اور اس جُرم کے لئے فوری طور پر ۲۵ سے لے کر ۵۰ پونڈ (یعنی پانچ سو سے ایک ہزار روپے) تک کا جرمانہ عاید کیا جاتا ہے اور یہ کام سڑک پر کھڑا پولیس والا کرتا ہے۔ جو غلط جگہ پر کھڑی کی گئی گاڑی پر جرمانے کا ٹکٹ چپکا کر چلا جاتا ہے۔ پولیس والے کے اِس فیصلے کے خلاف کوئی اپیل نہیں ہوتی۔ کیوں کہ اپیل دائر کرنے میں سو پونڈ خرچ ہونے کے علاوہ کئی دن صرف ہونے کا امکان ہے اور وہاں کسی شخص کے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہوتا ـــــ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ چراغ بیگ کی یہ ذہنی کیفیت ٹھیک ہونے میں ابھی مزید دس پندرہ دن لگیں گے اور اس کے بعد وہ لندن، نیویارک، سان فرانسسکو اور شکاگو کو بھول کر ایک بار پھر امیراکدل، حبہ کدل، چنگرال محلہ، نائید یار اور خانیار

کی سطح پر آجائیں گے۔ اس کے بعد ان کو نہ یہاں کی کسی بات پر تعجب ہوگا اور نہ غصہ آئے گا، بلکہ وہ خود بیچ سڑک میں گاڑی کھڑا کر کے اپنے دوست احباب سے گپ لڑائیں گے ـــــ ڈاکٹروں کا اندازہ صحیح ثابت ہونے لگا ہے اور رفتہ رفتہ میرا ذہن اپنے ماحول کے سنگین حقائق کو قبول کرتا جارہا ہے۔ لیکن دوست احباب اور اِس اخبار کے قارئین مجھے معاف کریں گے کہ مکمّل افاقہ ہونے میں ابھی کچھ وقت درکار ہوگا!

ابھی دو دِن قبل کی بات ہے کہ میں محکمۂ سیاحت کے ڈائریکٹر کے دفتر میں بیٹھ کر ڈائریکٹر صاحب کو یہ بتا رہا تھا کہ امریکہ میں بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ کشمیر ایک بہت ہی خوبصورت وادی، اور دلفریب سیرگاہ کا نام ہے۔ اور ہمیں امریکہ جیسے امیر اور خوش حال ملک میں کشمیر کی مناسب پبلسٹی کرنے کے لئے کچھ اقدامات کرنا چاہئیں۔ ڈائریکٹر صاحب میری بات کے جواب میں اپنی مشکلات، مجبوریوں اور معذوریوں کی تفصیلات بیان کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی، اور ایک انگریز خاتون نے اندر آنے کی اجازت چاہی۔ اور اِس کے بعد اس خاتون نے ڈائریکٹر صاحب سے مخاطب ہو کر جو کچھ کہا اُسے سُن کر میں نے خدا کا شکر بجالایا کہ دُنیا میں بہت زیادہ لوگوں کو کشمیر کی خوبصورتی اور دل کشی کا علم نہیں۔ کیوں کہ یہاں آکر انھیں یقیناً ہماری بدصورتی اور بدتمیزی کا اندازہ ہوجاتا۔ انگریز خاتون ڈائریکٹر صاحب سے کہہ رہی تھیں کہ "میں پچھلے چار دن سے استقبالیہ مرکز کے مہمان خانے میں رہ رہی ہوں اور مجھے اس مختصر سے قیام کے دوران جو تلخ تجربہ ہوا ہے اس کی تفصیل میں نے آپ کو لکھ کر بھیج دی ہے۔ اِس مہمان خانے کے ریستوران میں کام کرنے والے لوگ انتہائی بدتمیز اور بداخلاق ہیں۔ وہ کبھی وقت پر نہیں آتے اور میں نے جب بھی ان سے شکایت کی، انھوں نے مجھے یہ روکھا سا جواب دیا کہ شہر میں اتنے ریستوران ہیں۔ آپ وہاں کیوں نہیں جاتیں ـــــ ریستوران کے باہر یہ اعلان درج ہے کہ ریستوران صبح ساڑھے چھ بجے کھلے گا۔ لیکن اس اعلان کے باوجود یہ کبھی ساڑھے آٹھ سے پہلے نہیں کھلتا۔ اور میں نے محسوس کیا ہے کہ یہاں کام کرنے والوں کو اِس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ مہمان خانے میں

قیام کرنے والوں کی ضروریات پوری ہوتی ہیں یا نہیں۔ یہی عالم کمروں کا ہے۔ ان میں اتنے چوہے بھرے پڑے ہیں کہ میں آج تین رات سے لمحہ بھر کے لئے بھی نہیں سو پائی ہوں۔ ریستوران اور کمروں کے بارے میں، بہت سے اور لوگوں نے مجھ سے یہی بات کہی ہے کہ ریستوران انتہائی غلیظ اور کمرے انتہائی تکلیف دہ ہیں۔ میں نے خود کئی بار دیکھا کہ ریستوران کی میزیں ایک بار بھی صاف نہیں کی جاتیں، اور ان پر جھوٹا کھانا پڑا رہتا ہے۔ کیا آپ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے۔ انگریز خاتون بے تکان بولتی جا رہی تھیں۔ اور میں دل ہی دل میں اپنے "مہمان خانے" کا مقابلہ مغرب کے ان طعام خانوں سے کر رہا تھا کہ جن کی صفائی اور حسنِ انتظام دیکھ کر ساری زندگی وہیں گزارنے کو جی چاہتا ہے۔

لیکن ابھی انگریز خاتون کے ترکش میں ایک اور تیر تھا۔

"کیا یہاں کی ٹورسٹ بسوں کی دیکھ بھال کا کوئی انتظام نہیں ہے میں پچھلے چار دنوں سے جن بسوں میں سفر کر رہی ہوں وہ اتنی گندی اور میلی کچیلی ہیں کہ شاید برسوں سے ان میں کوئی صفائی نہیں ہوئی ہے۔ فرش پر دُنیا بھر کا کوڑا جمع رہتا ہے اور سیٹوں کے غلاف اتنے میلے ہیں کہ بیٹھنے والے کے صاف وشفاف کپڑے بھی آلودہ ہو جاتے ہیں"، انگریز خاتون نے جنّت کشمیر کی خوبصورتی کا ایک اور پہلو پیش کیا اور میری آنکھوں کے سامنے لندن کی وہ خوب صورت اور صاف وشفاف بسیں دوڑنے لگیں کہ جن کے فرش پر کھانا کھایا جا سکتا ہے۔ میں یہ سب کچھ سنتا رہا۔ ڈائریکٹر صاحب میری طرف، میں ان کی طرف اور انگریز خاتون ہم دونوں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ہم دونوں، آپ سب، یہ سارا ملک مجرموں کے کٹھرے میں تھے، اور انگریز خاتون ہمارے خلاف گواہِ استغاثہ کے طور پر پیش ہو رہی تھی، ہمیں بھی اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہیئے، لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے پاس کہنے کو کچھ ہے ہی نہیں۔ !

(۳۰ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

مرض، مریض، معالج

کسی مرض کے علاج میں سب سے اہم مرحلہ اس کی صحیح تشخیص ہوتا ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مریض کو، مرض کا احساس یا اندازہ ہو۔ کیونکہ بعض لوگوں کو مرتے دم تک یہی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ مرض الموت میں مبتلا ہیں۔ میں بہت سے ایسے شرابیوں کو جانتا ہوں کہ جو صبح سے شام تک شراب کے نشے میں چور رہ کر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ زندگی کا لطف اٹھا رہے ہیں اور ان کم بختوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ وہ زندگی کی تلاش میں دراصل اپنی موت کا سامان کر رہے ہیں۔ ایسے بادہ خواروں کو سمجھانے کی کوشش کیجئے تو وہ آپ کے بھولے پن کا مذاق اڑا کر، آپ کو بھی دعوتِ شوق دیں گے کہ ان کے خیال میں آپ زندگی کی بہت بڑی نعمت اور لذت سے محروم ہیں۔ اسی طرح کسی پاگل یا شوریدہ سر کو یہ مشورہ دیجئے کہ وہ اپنا باقاعدہ علاج کرائے تو عین ممکن ہے کہ وہ پتھر اٹھا کر سب سے پہلے آپ ہی کا علاج شروع کر دے، اس نوعیت کی بیماریوں کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہوتا ہے کہ مریض، مرض کو صحت اور تندرستی کی علامت سمجھتا ہے اور علاج کی ہر کوشش کو شک و شبہ کی نگاہوں سے دیکھتا ہے اور یہ بات صرف افراد ہی نہیں، پورے سماج کے بارے میں بھی صحیح ہو سکتی ہے۔ بعض اوقات کوئی معاشرہ زوال اور ذلت کی پستیوں سے اس درجہ مانوس ہو جاتا ہے کہ وہ اصلاح اور انقلاب کی ہر کوشش کو اپنے لئے موت کا پیغام سمجھنے لگتا ہے اور ہر قسم کی تاویلیں کر کے اپنی پستی کو اپنی بلندی ثابت کرنے پر تُل جاتا ہے۔ قوموں کی زندگی میں جب یہ مرحلہ آجائے کہ مرض کو صحت، پستی کو بلندی اور ذلت کو عظمت سے تعبیر کیا جانے لگے تو سمجھ لیجئے کہ ایسی بیمار قوم کو ایک بہت بڑے آپریشن کی سخت ضرورت ہے اور اس کے

بغیر اس کا زندہ رہنا ناممکن ہے۔

شیخ محمد عبداللہ نے ریاستی حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے فوراً بعد جب یہ اعلان کیا کہ وہ سب سے پہلے رشوت ستانی اور بدعنوانیوں کے قلعوں پر حملہ کر دیں گے تو غریب عوام کی محنت اور اُن کے خون پر پلنے والے مردم خوروں میں کھلبلی پیدا ہونا ایک فطری بات تھی۔ اس اعلان کے پیچھے جو عزم وارادہ نمایاں تھا، اُس نے سارے ماحول میں یک لخت ایک تبدیلی پیدا کر دی اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ صدیوں کی بیماری کے بعد ہمارا معاشرہ غُسل صحت کے لئے تیار ہو رہا ہے، ناجائز تجارت، خُفیہ کاروبار کالے دھن کی نمائش، غیر معمولی اصراف اور غیر قانونی لین دین، الغرض مصنوعی خوش حالی اور فارغ البالی کے یہ سارے مینار، بادِ نسیم کے ایک ہی جھونکے سے مسمار ہو گئے، رشوت خوروں نے ہوٹلوں میں جا کر دادِ عیش دینا چھوڑ دیا، سرکاری افسروں نے دفتری اوقات میں کافی ہاؤسوں کی یاترا ترک کر دی۔ انجنیروں اور ٹھیکیداروں نے، اپنی ناجائز آمدنی کی نمائش کرنے کی بجائے اُسے اپنے تہہ خانوں میں چُھپا دیا۔ کالے دھن کی کالک پر زندہ رہنے والے دِن کے اُجالوں سے دُور، رات کے اندھیروں میں چُھپ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے صدیوں کا غبار دُھلنے لگا۔ لیکن آنکھیں چونکہ مدّت مدید سے رشوت، بدعنوانی اور ناجائز تجارت کی دھول سے مانوس ہو گئی تھیں، اس لئے شروع شروع میں نئے ماحول سے کچھ وحشت سی پیدا ہونے لگی، بالکل اُس اندھے کی طرح کہ جس کو یک لخت اپنی کھوئی ہوئی بصارت مل جائے اور وہ سورج کی تیز روشنی کی تاب نہ لا کر اپنی آنکھیں بند کر دے۔ رشوت کی آمدن بند ہو گئی تو راشی لوگوں نے ہوٹلوں میں جانا چھوڑ دیا۔ کالا دھن غائب ہو گیا تو بازاروں کی رونق بھی کچھ ماند پڑ گئی۔ سرکاری افسروں کو صُبح سے شام تک دفتروں میں کام کرنا پڑا، تو کافی ہاؤس اور ریستوران ویران نظر آنے لگے، عوام کا خون پینے والے ٹھیکیداروں نے اپنے انجام سے گھبرا کر شراب نوشی سے پرہیز کرنا شروع کیا تو مے خانے اُداس ہو گئے۔

جس طرح ہر بیماری کے علاج میں مریض کو کچھ تکلیف دہ نشتر اور کڑوے گھونٹ برداشت کرنا پڑتے ہیں، اسی طرح رشوت اور بدعنوانی کے اس رِستے ہوئے ناسور کے علاج میں بھی

معاشرے کو کچھ آزمائشوں کا سامنا کرنا ہی پڑے گا۔ کاروبار اور تجارت میں بہ ظاہری تعطل، اسی آپریشن کا عارضی نتیجہ ہے، اور اس سے ہراساں و پریشاں ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ لیکن جو لوگ کورپشن کو زندگی، تجارت، کاروبار اور لین دین کے ایک جزوِ لاینفک کے طور پر تسلیم کر چکے تھے، وہ یہ ثابت کرنے کے لئے بے چین ہیں کہ رشوت ستانی کے خلاف نئی حکومت کے اقدامات سے سارا کاروبار اور ساری تجارت ٹھپ ہو گئی ہے۔ اور اگر حکومت نے فوراً ہی اپنی روش ترک کر کے پُرانی فضا کو بحال نہیں کیا تو ہمارا اقتصادی ڈھانچہ اور معاشی نظام دھڑام سے گر جائے گا۔ مفادِ خصوصی کی جانب سے اس قسم کا پروپاگنڈا یقیناً غیر متوقع نہیں، لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ کچھ پڑھے لکھے اور سُوجھ بُوجھ رکھنے والے دوست بھی ان عیّاروں کے جھانسے میں آکر اصل حقیقت کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ وہ بھی صحت کی جانب مریض کی پیش قدمی کو، خرابیٔ صحت کی علامت سمجھ کر ہراساں و پریشان نظر آتے ہیں۔ ایسے ہی دوستوں کی عقل دُشمنی پر، میں افسوس اور ماتم کرنا چاہتا ہوں، جس تجارت کی بُنیاد ہی رشوت، بدعنوانی اور بے ایمانی پر ہو، وہ ہماری نجات کا ذریعہ کیسے بن سکتی ہے، جس کاروبار کا سارا دارومدار ہی ناجائز لین دین پر ہو، اس پر ہماری معیشت کا انحصار کیسے ہو سکتا ہے؟ جو فارغ البالی اس درجہ عارضی اور مصنوعی ہو کہ وہ ایمان داری اور دیانت داری کا پَرتو پڑتے ہی پگھل جائے، اُس پر ماتم کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اگر موٹاپا انسانی جسم کی زینت اور صحت کی علامت ہوتا، تو دُنیا بھر کی عورتیں اور مرد اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لئے اتنی دولت اور محنت صرف نہ کرتے، مصنوعی خوش حالی اور نقلی ثروت کے موٹاپے نے ہمارے معاشرے کو بدصورت ہی نہیں، بیمار بنا دیا ہے اس کی صحت کو بحال کر کے اس کی رگوں میں تازہ اور صاف خون بھرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ موٹاپا دور ہو۔ کورپشن کے خلاف موجودہ حکومت کے اقدامات کو اسی پسِ منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے!

۲۳ مئی ۱۹۷۵ء

انجنیئرنگ کالج

چراغ بیگ تعلیمی اداروں میں غنڈہ گردی اور بے راہ روی کا سخت مخالف ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ ہمارے سکولوں اور کالجوں کی موجودہ فضا ہمارے نوجوانوں کی ذہنی نشوونما کی بجائے اِن کی شخصیت کو مسخ اور انفرادیت کو مجروح کرنے کے لئے زیادہ سازگار ہے، یوں تو کم و بیش ریاست کے سبھی کالجوں میں طالب علموں کی بدنظمی اور ہلڑ بازی نے تعلیمی ماحول کو مکدّر اور ضبط و نظم کو منتشر کر دیا ہے، لیکن نسیم باغ سری نگر میں واقع ریجنل انجنیئرنگ کالج نے بدتمیزی، بداخلاقی اور بے راہ روی کے اس مقابلے میں باقی سبھی اداروں کو مات دی تھی اور موجودہ پرنسپل ڈاکٹر احمد کی آمد سے پہلے یہ کالج ایک تعلیمی ادارے کے بجائے یاغستان معلوم ہوتا تھا کہ جہاں آئے دن کوئی نہ کوئی ہنگامہ بپا رہتا۔ کبھی نوجوانوں کے گروہ آپس میں گتھم گتھا نظر آتے تھے، تو کبھی استاد کی ہڈی پسلی ایک کر دی جاتی تھی۔ کئی بار فرقہ وارانہ جذبات اُبھارنے کی بھی کوششیں ہوتی رہیں، اور بارہا ایسے مواقع بھی آئے کہ کالج کے اندرونی جھگڑوں سے شہر کی پُرامن فضا کو بھی خطرہ لاحق ہوگیا۔

اور یہ بات. کالج کے موجودہ پرنسپل ڈاکٹر زیڈ، یو، احمد کے حق میں کہی جاسکتی ہے کہ ان کے چارج سنبھالنے کے بعد سے کالج کی فضا میں ایک خوشگوار تبدیلی آگئی ہے اور نادان اور نافرمان طالب علموں کو اس بات کا احساس اور اندازہ ہوگیا ہے کہ ڈاکٹر احمد کے ہوتے ہوئے ان کی خرمستیاں برداشت نہیں کی جائیں گی۔ پرنسپل کے سخت رویے نے بگڑے ہوئے ماحول کو اس حد تک سنوار دیا ہے کہ پچھلے تین چار ماہ کے دوران کالج میں نہ کوئی ہلڑ ہے اور نہ ہنگامہ۔ اور سنجیدہ قسم کے طالب علم بہت دنوں کے بعد پُرامن ماحول میں

اپنی تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ کالج کی فضا میں یہ تبدیلی ہم سب کے لئے خوشی اور اطمینان کا باعث ہونا چاہیے، اور اس کے لئے ہم پرنسپل کو مبارکباد دیتے ہیں۔ تعریف وتحسین کے یہ پھول پیش کرنے کے ساتھ ہی، میں اپنے اس اندیشے کا اظہار بھی کرنا چاہتا ہوں کہ نافرمان اور نادان طالب علموں کے تئیں ڈاکٹر احمد کا رویّہ ضرورت سے زیادہ سخت، بلکہ ایک لحاظ سے منتقمانہ دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے بیس کے قریب طالب علموں کو جن میں اکثر انجینیرنگ فائنل میں ہیں کو کالج سے خارج کر دیا ہے۔ ان پر یہ الزام ہے کہ انھوں نے پرنسپل صاحب کے گھر پر حملہ کرکے ان کے خلاف اشتعال انگیز مظاہرہ کیا، اور یہ اِن دنوں کی بات ہے کہ جب ابھی شیخ صاحب نے حکومت کی ذمہ داریاں نہیں سنبھالی تھیں اور انجینیرنگ کالج اور دوسرے اداروں میں اس قسم کی بدتمیزی اور ہلڑ بازی روزمرہ کا معمول بن چکی تھی۔ شیخ صاحب کے برسرِ اقتدار آتے ہی تمام تعلیمی اداروں میں نظم وضبط اور امن وامان کا جو ماحول پیدا ہو گیا۔ انجینیرنگ کالج کی بدلی ہوئی فضا پر بھی اس کا براہِ راست اثر ہوا۔ اور اس سے یقیناً پرنسپل احمد کا کام آسان بن گیا۔ جن لڑکوں نے پرنسپل کے خلاف مظاہرہ کیا انھیں اِس کی سزا ملنی چاہیئے، لیکن جب سزا کا تناسب جرم کی نوعیت سے بہت زیادہ ہو تو اِس بات کا اندیشہ ہے کہ سماج کو مجُرم سے نفرت کی بجائے اس سے ہمدردی ہونے لگے۔ انجینیرنگ کالج کے جن نوجوان طالب علموں کو کالج سے اخراج کی سزا دی گئی ہے وہ اپنے جرم پر بے حد نادم اور شرمندہ ہیں اور اپنے گناہ، کا کفارہ ادا کرنے کے لئے سخت سے سخت سزا جھیلنے کے لئے بھی تیار ہیں۔ پچھلے چھ ماہ سے وہ کالج کے پرنسپل اور وزیر اعلیٰ دونوں کے سامنے گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہے ہیں وہ اپنی ہر تذلیل اور توہین برداشت کرنے پر آمادہ ہیں بشرطیکہ انھیں اپنی زندگی سنوارنے کا آخری موقع دیا جائے۔ وہ کالج کے اساتذہ سے نہیں سارے شہر سے معافی مانگنے کے لئے تیار ہیں اور اس بات کی عدالتی ضمانت پیش کرنا چاہتے ہیں کہ آئندہ ان سے اِس قسم کی کوئی خطا سرزد ہو جائے تو ان کے خلاف جو سخت سے سخت کارروائی کی جائے گی وہ اِس کے خلاف اُف بھی نہ کریں گے۔ وہ غیر مشروط طور پر اس جرم کی معافی مانگنے کے لئے پچھلے چھ ماہ

سے دَر دَر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ لیکن نہ پرنسپل صاحب کی انسانیت جاگتی ہے اور نہ شیخ صاحب کا انصاف، اور نتیجہ یہ کہ ہمارے بیس نوجوان اپنے کندھوں پر اپنے مستقبل کی لاشیں لئے مارے مارے پھر رہے ہیں۔ چراغ بیگ نے قانون کی کتابوں میں پڑھا تھا، کہ مُجرم کو سزا دینے کا مقصد اِس کی اصلاح ہوتا ہے، اِس سے انتقام لینا نہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر احمد کے نزدیک سزا کو بجائے خود ایک مقصد کا درجہ حاصل ہے۔ اور اسی لئے اِن نوجوانوں کے آنسو بھی اِن کے پتھر دل کو پگھلانے میں ناکام ہوگئے ہیں۔ نوجوانی کے جوش میں کس سے خطائیں سرزد نہیں ہوتیں ؟ طالب علمی کے دور میں کس سے لغزشیں نہیں ہوتیں ؟ اور جب سارا ماحول بگڑا ہوا ہو، تو نوجوانوں کو کوئی کیا دوش دے ؟ لیکن پرنسپل احمد ربط وضبط کے نام پر ان بیس نوجوانوں کے مستقبل کو قربان کرنے پر تلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی نیت جو بھی ہو۔ ان کا عمل یقیناً ایک شفیق باپ اور اُستاد کا سا نہیں۔ اگر چمبل کے ڈاکوؤں کو جے پرکاش نرائن اپنی محبت اور اپنے خلوص سے ہتھیار ڈالنے پر آمادہ کر سکتے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ پرنسپل احمد رحم دلی اور مروّت سے کام لے کر ان بگڑے نوجوانوں کو سُدھرنے کا ایک آخری موقع دینے میں بخل سے کام لیں۔ اس دُنیا میں قاتلوں کو بھی معاف کیا جاتا ہے اور خاص طور پر جب قاتل کم عمر ہو، نوجوان ہو اور ناپختہ ہو۔ ابھی حال ہی میں لکھنؤ کی مِس شمیم رحمانی کو قتل کے الزام میں پوری سزا بھگتنے سے پہلے ہی رہا کر دیا گیا۔ کیا انجینیرنگ کالج کے اخراج شدہ طالب علموں کا جُرم قتل سے بھی زیادہ سخت ہے ؟ کیا ان کی نوجوانی ان کی ناپختگی اور ان کی نادانی کا کوئی لحاظ نہیں کیا جائے گا ؟ وہ چھ ماہ سے دَر دَر کی خاک چھان کر اپنے گناہوں کے لئے معافی مانگ رہے ہیں، کیا ان کے لئے یہ سزا کافی نہیں ہے ؟ اگر خدانخواستہ پرنسپل احمد نے ڈسپلن کے نام پر ان نوجوانوں کو سُدھرنے کا ایک آخری موقع بھی نہیں دیا تو چراغ بیگ یہ سمجھے گا کہ ان کے سینے میں ایک اُستاد کا نہیں ایک قصائی کا دِل ہے اور انھیں کسی تعلیمی ادارے کی بجائے کسی بوچڑ خانے کا سربراہ بنانا چاہیئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شیخ صاحب کو اس معاملے میں مداخلت کر کے بیس زندگیوں اور بیس

خاندانوں کو تباہی سے بچانے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ تعلیمی اداروں میں ضبط و نظم کا بحال ہونا بہت ضروری ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ اُستاد کی شفقت اور محبّت پر طالب علموں کا اعتماد اور اعتقاد برقرار رہے۔

(۷ جون ۱۹۷۵ء)

پہلوان عرب اور دزدان عرب

یہ غالباً سولہ برس قبل کی بات ہے کہ پولو گراؤنڈ سری نگر میں عالمی شہرت رکھنے والے
کچھ پہلوانوں کی کُشتی کا اہتمام کیا گیا تھا، اور ہر شام بیس ہزار سے زائد لوگ اس مقابلے
سے محظوظ ہونے کے لئے پولو گراؤنڈ میں جمع ہوتے تھے۔ کُشتی لڑنے والے پہلوانوں میں
یوں تو بہت سے مشہور اور معروف نام شامل تھے، لیکن آج سولہ برس بعد میرے ذہن میں
صرف تین نام رہ گئے ہیں۔ کِنگ کانگ، دارا سنگھ اور وادی ایوب۔ کنگ کانگ اپنے
فربہ جسم اور وزن کی بنا پر اور دارا سنگھ فنِ کشتی میں اپنی بے پناہ مہارت کی وجہ سے
تماش بینوں میں بے حد مقبول تھے۔ وادی ایوب ان دونوں کے مقابلہ میں بالکل نوجوان
اور بے حد خوبصورت پہلوان تھا، اور کشتی کے فن میں خاصا نو آموز، لیکن پروگرام کے
دوسرے یا تیسرے ہی دن، کسی ظالم نے یہ افواہ اُڑا دی کہ وادی ایوب عرب پہلوان ہے
(ہوسکتا ہے کہ پروگرام چلانے والوں نے جان بوجھ کر اس افواہ کی تشہیر کی ہو) بس پھر
کیا تھا، سارے شہر میں وادی ایوب کا نام گونجنے لگا اور کُشتی کا اہتمام کرنے والے ٹھیکیداروں
کی قسمت ہی کھل گئی۔ عربی پہلوان کی کُشتی دیکھنے کے لئے ہر شام پولو گراؤنڈ میں انسانوں
کا ایک سمندر نظر آنے لگا اور ہر شام ہزاروں لوگ ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے مایوس لوٹ
جاتے، منتظمین نے اپنی بزنس بڑھانے کے لئے ہر روز شہر میں پہلوانوں کا جلوس نکالنا
شروع کر دیا۔ اور اس جلوس میں خوب رُو عربی پہلوان وادی ایوب ایک کھُلی جیپ
میں سب سے آگے ہوتا۔ اور اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ہزاروں لوگ سڑکوں
پر گھنٹوں منتظر رہتے۔ دور دراز سے دیہات سے لوگ سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں

ہیں اس اسلامی پہلوان کا دیدار کرنے کے لئے شہر آنے لگے اور پورے پندرہ دن کے لئے شہر میں صرف وادی ایوب ہی کا نام سنائی دے رہا تھا، ایک دن وادی ایوب کو دیکھنے کے لئے سڑک پر اتنی بھیڑ جمع ہو گئی کہ ایک بچہ "اسلامی پہلوان" کی ایک جھلک دیکھنے کی کوشش میں بُری طرح کچلا گیا۔ کُشتی کے منتظمین کے لئے وادی ایوب سونے کا انڈا دینے والی مُرغی ثابت ہو رہا تھا اور وہ جان بوجھ کر ہر روز کسی نہ کسی بڑے پہلوان سے اس کی کُشتی کا پروگرام رکھتے۔ فری سٹائل کشتی کے دوران جب کوئی پہلوان وادی ایوب کو مُکّے مارتا تو بیس تیس ہزار کا پورا مجمع ایک آواز سے وادی ایوب کی حوصلہ افزائی اور اس کے حریف کی بُرائی کرتا۔ اس طرح کُشتی والے شہر والوں سے لاکھوں روپے وصول کر کے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے —— اور پھر کچھ دنوں بعد پتہ چل گیا کہ وادی ایوب عرب ضرور تھا لیکن کم بخت مسلمان نہیں، یہودی تھا۔ یہ جان کر اس کی راہوں میں آنکھیں بچھانے والوں پر کیا گزری ہوگی۔ آپ خود ہی اندازہ کر سکتے ہیں۔

آپ شاید یہ پوچھیں کہ چراغ بیگ کو یہ سولہ سال پُرانی بات یا لطیفہ سُنانے کی آج کیا ضرورت محسوس ہوئی سوال معقول ہے، لیکن جواب سُننے سے پہلے ایک اور واقعہ سُن لیجئے:۔

ایک مہینے قبل کی بات ہے کہ شہر میں خلیج فارس کی ایک چھوٹی سی ریاست اومان سے خواتین وحضرات کا ایک قافلہ بغرض سیاحت کشمیر میں وارد ہوا۔ قافلے میں مرد کم اور عورتیں زیادہ تھیں اور عورتوں میں نوجوان اور خوب صورت لڑکیوں کی اچھی خاصی تعداد شامل تھی! یہ سب لوگ ایک مقامی ہوٹل میں اتر گئے اور انھوں نے پورے ذوق وشوق کے ساتھ کشمیر کی بہاروں اور یہاں کے نظاروں سے لطف اندوز ہونا شروع کر دیا۔ دورانِ سیاحت قافلے میں شامل چند نوجوان لڑکیوں نے لوگوں کے گھروں میں گھس کر ہاتھ کی صفائی کے کمالات دِکھانا بھی شروع کر دئے اور ایک دن دو لڑکیوں کو بال گارڈن میں کچھ شہریوں کے گھر سے دن دہاڑے چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ پولیس کو اطلاع کر دی گئی اور انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ اُن کی نشان دہی پر مال مسروقہ

برآمد ہوا۔ عدالت میں چالان پیش کیا گیا۔ ملزموں نے اقبالِ جرم کیا اور عدالت نے اُنھیں چھ ماہ قید کی سزا سُنائی، اس دوران شہر میں یہ بات پھیل گئی کہ عربستان سے آئے ہوئے قافلے کو مقامی پولیس ستا رہی ہے! اور کچھ شہر والوں نے کُھلم کھلا ان سے ہمدردی کا اظہار کر کے ان کے بچاؤ کے لئے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا، اور عدالت میں ہر روز سینکڑوں لوگ اپنے عرب بھائیوں اور بہنوں کی حمایت میں سرگرمِ عمل نظر آنے لگے۔ رفتہ رفتہ مقامی سیاست دانوں نے بھی اس معاملے سے گہری دلچسپی ظاہر کرنا شروع کر دی اور حلقۂ انتخاب صفاکدل کے ممبر اسمبلی عبدالرشید کابلی نے بہ نفسِ نفیس "دُزدانِ عرب" کی مدافعت کا بیڑا اٹھایا۔ چند دنوں کے بعد ملزموں کی طرف سے عدالتِ سیشن میں اپیل دائر کی گئی اور مقدمے کے اخراجات کے لئے بہت سے دُکانداروں اور شہر والوں نے دل کھول کر چندہ دیا۔ مولانا فاروق کے بہت سے مُشیر اور عقیدت مند بھی اپنے "مسلمان بھائیوں" سے اظہار ہمدردی کے لئے ہوٹل اور عدالت کا طواف کرتے دیکھے گئے۔ غرض ایک چھوٹے پیمانے پر "کُفر اور اسلام" کے درمیان ایک فیصلہ کُن جنگ چھڑ گئی اور بالآخر عدالت سیشن نے مُلزمان کی چھ ماہ قید بامشقت کی سزا کو دو ہزار روپے جُرمانے میں بدل کر انھیں رہا کرنے کے احکامات صادر کر دئے۔ عقیدت مندوں نے آنِ واحد میں دو ہزار روپے کی رقم عدالت میں داخل کر دی اور حلقۂ انتخاب صفاکدل کے ممبر اسمبلی عبدالرشید کابلی صاحب ایک فاتح جرنیل کی طرح سنٹرل جیل گئے اور وہاں سے ملزموں کو رہا کرا کر اپنے ساتھ ہوٹل میں لے آئے جہاں سینکڑوں لوگ "عربی چوروں" کا استقبال کرنے کے لئے منتظر تھے۔ جوں ہی چور لڑکیاں کابلی صاحب کی معیّت میں ٹیکسی سے اتریں تو زوردار تالیوں اور نعروں سے ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ پھر صبا اور نذیرہ نے ہوٹل کی بالکونی سے ہاتھ ہلا ہلا کر اپنے ہمدردوں کی محبت کا شکریہ ادا کیا۔ کابلی صاحب اور ان کے دوستوں کے پُر مُسرت چہروں سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ جیسے اُنھوں نے فلسطینی مجاہدہ۔ لیلیٰ خالد کو پھانسی کے تختے سے بچا دیا ہو۔ حالانکہ پولیس کی تحققات سے یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ یہ سارا قافلہ مُجرموں کا ایک گروہ ہے جو ہندوستان میں وارد ہونے سے پہلے پاکستان میں بھی اپنے ہاتھ کی صفائی دِکھا چکا ہے اور وہاں سے

سے بھی انھیں اپنی کرتوتوں کی بنا پر نکال باہر کیا گیا ہے، لیکن افسوس کہ سرزمین پاکستان میں عبدالرشید کابلی جیسے نوجوان اور خضریان ہاؤس جیسے مُسلمان دوست موجود نہیں کہ جو ان عربی چوروں کی حمایت اور مدافعت میں اپنے جوش اور جذبے کا اظہار کرتے۔

عام شہری، سادہ لوح دکاندار، بھولے بھالے عوام اس گمراہی اور بے محل ہمدردی کا اظہار کرتے تو یہ بات قابلِ فہم تھی لیکن ممبران اسمبلی اور پڑھے لکھے نوجوان اس جہالت اور جذباتیت کا مظاہرہ کریں تو بے چارے غریب اور ان پڑھ عوام کا کیا قصور؟ ملزموں کو چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ ان سے مال مسروقہ برآمد ہوا۔ اُنھوں نے عدالت میں اپنے جرم کا اقبال کیا اور انھیں سزا ہو گئی اس سارے معاملے میں مسلمان اور ان کے عرب ہونے کا کیا تعلق تھا؟ اور اس کثافت سے اپنی سیاست کو بڑھاوا دینے کا کیا اخلاقی جواز تھا، یہ سب کچھ میری سمجھ میں نہیں آتا! سعودی عرب میں یہ جُرم سرزد ہوتا تو ملزموں کے ہاتھ کاٹ دیئے جاتے اور کابلی صاحب جیسا کوئی نوجوان ان کی حمایت میں تقریر کرتا تو شاید اس کی زبان کاٹ دی جاتی!۔ لیکن اپنے یہاں عربی چور اور عربی سیدؔ میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ سولہ[16] برس قبل یہاں کے لوگ وادی ایوب کے عرب نژاد ہونے پر عاشق تھے، سولہ[16] برس بعد وہ عرب سے آئے ہوئے مجرموں اور چوروں کے گرویدہ ہو گئے اور دلچسپ بات یہ اب کی بار چوروں کی حمایت اور قیادت ہمارے ایک ممبر اسمبلی کر رہے تھے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ پچھلے پندرہ سولہ برسوں کے دوران ہم نے کافی ترقی کی ہے۔

اب آپ شاید سمجھ گئے ہوں گے کہ میں نے سولہ[16] برس پُرانی بات کیوں دُہرائی؟

(۳۰ جون ۱۹۷۵ء)

غلط، بالکل غلط

تیرہ جولائی کو یومِ شہدا کی تقریب پر تقریر کرتے ہوئے وزیرِ اعلیٰ جناب شیخ محمد عبد اللہ نے جو اہم اعلانات کئے۔ اِن میں صورہ میں پانچ سو بستروں پر مشتمل ایک ہسپتال کے علاوہ بُرزلہ میں بچّوں کے لئے ایک نئے ہسپتال قائم کئے جانے کا خوش کن اعلان بھی شامل تھا، اور شہر کے موجودہ ہسپتالوں کے ستائے ہوئے شہریوں نے پُرزور تالیوں سے ان اعلانات کا خیر مقدم کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وزیرِ اعلیٰ نے جب یہ انکشاف کیا کہ آئندہ سے شفاخانوں میں زیرِ علاج مریضوں کو مفت کھانا مہیا کرنے کی بجائے ہر ہسپتال کے ساتھ ایک کینٹین کھولا جائے گا۔ جہاں مریض اور ان کے تیماردار قیمت ادا کر کے اپنی پسند اور مرضی کی خوراک کھایا کریں گے، تو سامعین نے فوراً ہی اس پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر کے شیخ صاحب کو اس مجوزہ قدم کے خلاف اپنے ردِّ عمل سے آگاہ کیا۔ وزیرِ اعلیٰ کو جب اس بات کا اندازہ ہوگیا کہ شفاخانوں میں بیماروں کو قیمتاً خوراک مہیّا کرنے کے فیصلے پر مجمع ناخوش ہے، تو اُنھوں نے دلیلیں دے دے کر عامتہ الناس کو اس فیصلے کی ضرورت اور معقولیت کا احساس دلانے کی کوشش کی۔ میں نہیں جانتا کہ شیخ صاحب کی دلیلوں کا سامعین پر کیا اثر ہوا۔ لیکن جہاں تک چراغ بیگ کا تعلق ہے، اسے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہوگا کہ وزیرِ اعلیٰ کی ایک بھی دلیل اُس کے لئے قابلِ قبول نہیں تھی، شیخ صاحب نے مریضوں کو مفت خوراک مہیا کرنے کے خلاف سب سے بڑی دلیل یہ دی کہ مریضوں کی خوراک پر سالانہ کئی لاکھ

روپے خرچ کرنے کے باوجود انھیں اچھا کھانا نہیں ملتا اور اس رقم کا ایک کثیر حصہ ٹھیکے داروں اور درمیان داروں کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ چراغ بیگ کو اس بیان کی صحت سے انکار نہیں اور وہ ذاتی تجربے کی بناء پر اس کی تصدیق کرنا چاہتا ہے کہ ہمارے ہسپتالوں میں مریضوں کو دیا جانے والا کھانا تندرست آدمی کو بیمار کر سکتا ہے لیکن مریض کو تندرست نہیں بنا سکتا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ خوراک کے لئے مخصوص بھاری رقم کا ایک بھاری بھر کم حصّہ مریضوں پر خرچ ہونے کے بجائے کہیں اور خرچ ہوتا ہے اور بے چارے مریض کو پھیکے کھانے کے چند لقموں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ لیکن اس بد انتظامی، بد دیانتی اور بد معاشی کا انتقام اصل مجرموں کی بجائے بیچارے مریضوں سے کیوں لیا جائے، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی، ضرورت تو اس بات کی تھی کہ مریضوں کا خون پینے والے ان بے رحم قاتلوں کو سر بازار پھانسی دی جائے، لیکن یہاں تو معاملہ کچھ اُلٹا ہی نظر آرہا ہے اور مریض کے ہی گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالنے کی تیاری ہو رہی ہے۔ وزیر اعلیٰ کو اس بات کا علم ہونا چاہئیے کہ مریض کے علاج و معالجے میں صرف ادویات ہی نہیں مناسب اور متوازن خوراک کا بھی عمل دخل ہوتا ہے، اور اِس لئے دُنیا کے ہر اچھے ہسپتال میں مریض کی خوراک اِس کے علاج کا ناگزیر حصّہ سمجھی جاتی ہے اور ہر اچھا ڈاکٹر ادویات سے زیادہ اچھی اور متوازن خوراک پر زور دیتا ہے۔ ہسپتالوں میں مریضوں کو کھانا مہیّا کرنے کی یہی وجہ ہے اور یہ وجہ اتنی معقول ہے کہ اِسے ہر قیمت پر قائم رہنا چاہئیے۔ وزیر اعلیٰ نے اپنے فیصلے کا جواز دیتے ہوئے یہ بات کہی کہ جو لوگ کھانے کی قیمت ادا کرنے کے اہل ہیں۔ اِن سے پُوری قیمت وصول کی جائے گی اور جن کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ بیحد غریب ہیں، اُنھیں ان کا معالج جب اِس امر کی سرٹیفکیٹ دے گا کہ یہ خوراک کی قیمت ادا کرنے کے اہل نہیں ہیں تو اِس کے بعد اُنھیں مفت کھانا مہیا کیا جائے گا۔ بادی النظر میں یہ دلیل خاصی وزن دار ہے، لیکن ہسپتالوں میں زیرِ علاج بیماروں کا ایک سرسری جائزہ بھی لیجئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ جنرل وارڈوں میں داخل مریضوں

کی کل تعداد کا ۹۷ فیصدی حصہ غریب، مفلوک الحال اور بے وسیلہ لوگوں کا ہے، یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کی ماہانہ آمدنی کم سے کم ایک سو روپے اور زیادہ سے زیادہ چار سو روپے ماہوار ہے اور ان میں سے اکثر بیمار صرف اس لئے بیمار ہیں کہ انھیں مناسب اور متوازن کھانا نہیں ملتا۔ اب جب ہسپتال کی چار دیواری میں بھی انھیں یہ کھانا نصیب نہیں ہوگا تو وہ کہاں جائیں گے! اب رہی اُس مخصوص اور محدود اقلیت کی بات، کہ جو اپنی آمدنی، اپنے منصب اور اپنے رکھ رکھاؤ کے لحاظ سے اتنی آسودہ حال ہے کہ اس کے لئے علاج معالجے اور خوراک کی قیمت ادا کرنا کوئی بڑی بات نہیں، تو ان کے لئے الگ وارڈ کیوں نہ بنائے جائیں کہ جہاں وہ کمرے کا کرایہ بھی ادا کریں اور علاج معالجے، ادویات، خوراک اور دوسری ضروریات کے اخراجات بھی، پوری ریاست میں ایسے لوگوں کی تعداد چار، پانچ فیصد سے زیادہ نہیں ہوگی۔ جبکہ ۹۵ فیصدی لوگ ادویات کی قیمت تو کیا، زندہ رہنے کی عیاشی بھی برداشت نہیں کرسکتے۔ وزیراعلیٰ غالباً اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ آج بھی کوئی امیر، صاحبِ ثروت یا خاندانی شریف، ہسپتال کا کھانا نہیں کھاتا، یہ لوگ اپنے گھروں سے اپنی پسند کا کھانا منگوا کر صرف خود ہی نہیں، ڈاکٹر صاحبان کو بھی کھلاتے ہیں۔ اس لئے مفت خوراک کی سپلائی بند ہو جانے سے اِن کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

نقصان اگر کسی کا ہوگا تو جنرل وارڈوں میں زیرِ علاج اِن ۹۵ یا ۹۷ فیصدی بیماروں کا ہوگا کہ جن کے لئے ہسپتال کا کھانا عیاشی نہیں، ضرورت ہے۔ ایک 'محدود' اقلیت کو بھاری اکثریت کا نمائندہ تصوّر کر کے انھیں اُس رعایت اور مراعات سے محروم کرنا کہ جو ان کے علاج کا جزو لاینفک ہے، کہاں کا انصاف اور کہاں کی دانشمندی ہے؟ شیخ صاحب کو یقیناً کسی نے غلط مشورہ دیا ہے اور وہ یہ بھول گئے ہیں کہ سرکاری ہسپتال، خیراتی ہسپتال نہیں ہوتا اور نہ اسے ایسا ہونا چاہیئے، ان ہسپتالوں میں شہر کے بے وسیلہ مریضوں کے علاوہ عام طور پر دور دراز دیہات سے آئے ہوئے بے سہارا بیمار داخل ہوتے ہیں، انھیں ڈاکٹر صاحب کے سرٹفکیٹ کے

رحم وکرم پر چھوڑنا ان کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوگی۔ چراغ بیگ کا مشورہ یہ ہے کہ اس غیر دانشمندانہ اور نامنصفانہ فیصلے پر عمل درآمد نہیں ہونا چاہیے اور ہسپتالوں کے موجودہ نظام میں اس نوعیت کی انقلابی تبدیلیاں پیدا کی جانی چاہیں کہ ہر مریض وہاں داخل ہونے کے بعد یہ محسوس کرے کہ وہ محفوظ اور ہمدرد ہاتھوں میں ہے۔ صدر ہسپتال اور دوسرے ہسپتالوں پر بیماروں کے خورد و نوش پر ۳، ۴ لاکھ روپے سالانہ سے زیادہ رقم صرف نہیں ہوتی، یہ رقم بجائے خود بہت حقیر ہے اور اس میں نہ صرف اضافہ ہونا چاہیے بلکہ اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیئے کہ اس کا صحیح استعمال ہوتا ہے یا نہیں، چار لاکھ روپے کی بچت سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ لیکن اگر اس معمولی سی بچت کی خاطر ہم نے مریضوں کی صحت اور تندرستی کو نظر انداز کر دیا تو ہم پہلے دُنیا کی نظروں میں اور پھر اپنی نظروں میں گر جائیں گے۔۔۔ مجھے اُمید ہے کہ میری ان معروضات کے بعد وزیر اعلیٰ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں گے۔

(۲۳ جولائی ۱۹۷۵ء)